سیّد احمد قادری
ملبہ
افسانے

ملبہ

(افسانے)

سیّد احمد قادری

(افسانے)

سیّد احمد قادری

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

MALBA

(Short Stories)

by: Syed Ahmad Quadri
7,New karimaganj,Gaya-823001
E-mail: squadri806@gmail.com
Mob: 09934839110

Year of Edition 2015
ISBN 978-93-5073-567-1
₹ 350/-

نام کتاب	:	ملبہ (افسانے)
مصنف	:	سیّد احمد قادری
سنہ اشاعت	:	۲۰۱۵ء
قیمت	:	۳۵۰ روپے
کمپوزنگ	:	منصور رضا، گیا
مطبع	:	عفیف پرنٹرس، دہلی ۶

ملنے کے پتے

☆ امرین بک ایجنسی، 87 بلاک۔7 میونسپل کوارٹرس، کانچ کی مسجد کے پاس، جمال پور، احمد آباد۔380022
☆ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسیس بلڈنگ، ای۔آر۔روڈ، ممبئی۔ 400003 فون نمبر:022-23774857
☆ ھدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس، 22-7-454/455، مسجد ایک خانہ کے سامنے، پرانی حویلی، حیدر آباد۔2
☆ انجمن ترقی اُردو، اردو ہال، حمایت نگر، حیدر آباد ☆ رائی بک ڈپو، 734، پرانا کٹرہ، الٰہ آباد (یوپی)
☆ بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ۔4 ☆ عثمانیہ بک ڈپو، 125 رابندرا سرانی، کلکتہ۔700073
☆ دانش محل، امین الدین پارک، لکھنؤ۔226018 (یوپی)

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 23214465, 23216162, Fax: 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
Website: www.ephbooks.com

اِنتِسَابْ

اردو فکشن کے عظیم فنکار

جوگندر پال

کے نام

ترتیب

پیش لفظ........11

افسانے :

پیش لفظ

میرا چوتھا افسانوی مجموعہ "ملبہ" حاضر خدمت ہے۔ اس سے قبل میرے تین افسانوی مجموعے "ریزہ ریزہ خواب" (۱۹۸۵ء) "دھوپ کی چادر" (۱۹۹۵ء) اور "پانی پر نشان" (۲۰۰۶ء) شائع ہو چکے ہیں، جنھیں ادبی حلقوں میں کافی پسند کیا گیا ہے۔

میرا افسانوی سفر دسمبر ۱۹۷۳ء سے شروع ہوتا ہے جب ماہنامہ "زیور" (پٹنہ) نے میرا پہلا افسانہ "بوجھ" شائع کیا تھا۔ اس طرح کئی دہائیوں پر محیط میرا افسانوی سفر بہت طویل نہیں، تو مختصر بھی نہیں ہے۔

ان چند دہائیوں میں، میں نے زندگی کے بہت سارے نشیب و فراز، تہذیبوں اور قدروں کا زوال، ٹوٹتے بکھرتے سماجی رشتے اور سیاست کی بساط پر انسانیت، حیوانیت کی شہہ و مات کی چال کو قریب اور دور سے دیکھا اور شدت سے محسوس کیا ہے۔

ان مشاہدات اور موضوعات کو افسانوی قالب میں ڈھالنے کی کوشش کس قدر بارآور ہوئی ہے، اس کا فیصلہ تو ہمارے قارئین و ناقدین کو کرنا ہے۔

ویسے میں خود کو اس لحاظ سے بہت خوش نصیب افسانہ نگار مانتا ہوں، کہ میرے افسانوں پر بڑی تعداد میں ناقدین اور قارئین نے کھل کر باتیں کی ہیں "ریزہ ریزہ خواب" "دھوپ کی چادر" اور "پانی پر نشان" سے متعلق تنقیدی اظہار رائے نے یقینی طور پر میرے لئے مشعل راہ کا کام کیا ہے۔ لیکن میں اپنے بارے میں کسی خوش فہمی کا شکار نہیں، مجھے اس امر کا شدت سے احساس ہے کہ میں نے اب تک افسانوی ادب میں ایسا کوئی بڑا کارنامہ انجام نہیں دیا ہے جس سے میں خود کو مطمئن کر سکوں۔

گرچہ بعض قارئین نے میرے کچھ افسانوں کو عالمی معیار کا قرار دیا ہے۔ مثلاً ماہنامہ ''شاعر'' کے ہم عصرادب نمبر میں محترمہ انجم آراء انجم (علی گڑھ) نے اپنے ایک مباحثہ بہ عنوان ''افسانہ ۱۹۶۰ء کے بعد'' میں اپنی رائے دیتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے ـــ

''بات معیار کی نہیں، عالمی معیار کی ہے، اس کے علاوہ بات یہ بھی ہے کہ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۹۰ء تک کے سارے افسانے میری نظر سے نہیں گزرے۔ اس لئے عین ممکن ہے کہ میری فہرست میں وہ افسانے رہ جائیں، جو عالمی معیار پر پورے اترتے ہوں، بہر حال یہ چند نام حاضر ہیں ''ہاؤسنگ سوسائٹی'' (قرۃ العین حیدر) آخری آدمی، شہر افسوس (انتظار حسین) ''تیسری ہجرت'' (اعجاز راہی) ''دریاؤں کی پیاس'' ''بے محاورہ'' (جوگندر پال) 'مرہم' جس تن لاگے'' (رتن سنگھ) ''رانی'' (اقبال متین) 'بیساکھی' دو بھیگے ہوئے لوگ (اقبال مجید) ''لمحوں کی بازگشت'' (سید احمد قادری) ''انجام کار'' (سلام بن رزاق) ''کابلی والا کی واپسی'' (انور قمر) ''گھونسلہ'' (شوکت حیات)۔''

مجھے اس بات کی بڑی خوشی ہے کہ میری افسانہ نگاری کے سلسلے میں جب بھی باتیں ہوئیں مجھے ترقی پسندی اور جدیدیت کی انتہا پسندی سے الگ ہٹ کر ایک نئی آواز، جن میں داخلیت اور خارجیت دونوں کے احساسات وجذبات شامل ہوں، کا نمائندہ افسانہ نگار قرار دیا گیا ہے۔

اپنے افسانوی سفر کے ابتدائی دور میں، میں نے جو اسلوب اپنایا تھا وہی بیانیہ اسلوب آج کے تخلیقی اظہار کا نہ صرف غالب اسلوب ہے بلکہ اسی بیانیہ اسلوب کی وجہ سے آج ایک بار پھر افسانہ اور قاری کے درمیان ٹوٹا رشتہ قائم ہوسکا۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ علامتی، استعاری، تجریدی نظام اظہار نے اردو افسانوں کو قاری سے بہت دور کر دیا تھا، جس کے ذمہ دار وہ افسانہ نگار تھے جو ۶۰ء سے ۷۰ء کے درمیان سامنے آئے اور شہرت کے بھوکے نقادوں نے انہیں خوب خوب شہرت کے بانس پر چڑھانے کی کوشش کی اور اس نسل کے وقتی اور جھوٹی شہرت سے وہ لوگ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے جو افسانوی

ادب میں ایک مقام بنانے میں نہ صرف کامیاب ہو چکے تھے بلکہ انھوں نے اپنے اسلوب آرٹ تکنیک، موضوع اور فکر و احساس کی معنویت، تنوع اور ندرت سے افسانوی ادب میں اضافہ کر رہے تھے۔ غیاث احمد گدی، رام لعل، کلام حیدری، جوگندر پال، احمد یوسف وغیرہ اسی قبیل کے فنکار تھے۔ لیکن انہیں جلد ہی اپنی غلطیوں کا احساس ہو گیا اور شہرت کے بھوکے نقادوں کے بچھائے جال سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوئے۔ سب سے برا وقت ان پر پڑا جو ۶۰ء سے ۷۰ء کے درمیان ابھرے اور اپنی پہچان ہی بحیثیت علامتی، استعاراتی تمثیلی اور تجریدی افسانہ نگار کے کرائی تھی۔ اس دوران ۷۰ء اور ۸۰ء کے درمیان ابھر کر ایک نئی تازہ دم اور ذہین نسل سامنے آ چکی تھی۔ جس نے اپنے گہرے مطالعہ اور مشاہدہ کی روشنی میں ایک جانب ترقی پسندوں کے منشوری ادب سے انحراف کیا تو دوسری طرف جدیدیت کے علمبرداروں کے قنوطیت، جبریت، مجرد، داخلیت اور عصری مسائل سے شعوری انحراف کے عمل کو رد کرتے ہوئے اپنے افسانوں میں داخلیت اور خارجیت کے شعوری عمل، عصری مسائل، سماجی رشتوں، تہذیبی زوال اور اس نوع کے دوسرے عصری تقاضوں کو اپنے افسانوں کا نہ صرف موضوع بنایا بلکہ اسے متنوع، بالیدہ اور بامعنی بناتے ہوئے بیانیہ طرزِ اظہار کو قبولیت بخش کر کہانی پن پر زور دیا۔ ایسے افسانوں کی مقبولیت بڑھتی گئی، جسے دیکھ کر اس نئی نسل کی تقلید میں وہ نسل بھی شامل ہو گئی جس نے ان عوامل کے خلاف نہ صرف صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے ان سے حتی الامکان گریز کیا تھا، بلکہ اپنی انفرادیت پر اصرار کیا تھا۔

میں جس وقت افسانوی دنیا میں داخل ہوا اس وقت تجریدیت کا دور دورہ تھا۔ علامتوں تشبیہوں اور استعاروں کو خاصی اہمیت حاصل تھی۔ اینٹی ہیرو، اینٹی کلائمکس، اینٹی اسٹوری اور شعور کی رو پر مبنی افسانے لکھے جا رہے تھے۔ جو افسانے جتنے گنجلک اور فہم سے دور ہوتے اتنے ہی کامیاب تصور کئے جاتے تھے۔ جنہیں لوگ اپنے اپنے طور پر سمجھ رہے تھے اور جو نہیں سمجھ رہے تھے ان کے لئے شرحیں فراہم کی جا رہی تھیں۔ ایسے میں میرے کئی اہم افسانے مثلاً ''سرخ جوڑے'' ''آنگن کی بات'' ''یادوں کا المیہ'' ''احساس'' ''قیدی'' ''شہر

خموشاں'' ''فاصلہ قریب کا'' ''اداسیاں'' اور ''لمحوں کی بازگشت'' وغیرہ بے وقت کی چیز معلوم ہورہے تھے، لیکن مجھے اپنے ان افسانوں پر پورا اعتماد تھا کہ میرے یہ افسانے حساس ذہن کے تار کو جھنجھوڑیں گے ضرور اور یہی ہوا، ایک وقت ایسا آیا جب ایسے افسانوں کی اہمیت تسلیم کی جانے لگی۔ حالانکہ فیشن زدگی کے اس دور میں بعض نقادوں کے لئے میرے اور میرے ہم عصر افسانہ نگاروں کے لکھے گئے افسانے سوالیہ نشان بنے، لیکن بدلتے وقت اور حالات کے تیور کے آگے ان نقادوں کو سپر ڈالنا پڑی اور افسانے کی افہام وتفہیم کے لئے فرائیڈ، یونگ اور سارتر کے نظریات کی عینک اتار کر افسانوں کے اندر ابھرنے والے نظریات اور فطری کینوس کی نشاندہی کرنے لگے...... اور ان لوگوں کی آواز میں اپنی آواز ملانے پر مجبور ہوئے جو سمجھ رہے تھے کہ فیشن زدگی کا یہ دور بالکل وقتی ہے اور وہی افسانے اپنی پہچان کرانے میں کامیاب ہوں گے اور زندہ رہیں گے جن میں نہ صرف ماجراسازی اور کردار نگاری پر زور دیا گیا ہو، بلکہ سماج اور زندگی کی حقیقتوں کے واضح اظہار ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ میرے افسانے بڑی تعداد میں قارئین اور ناقدین کی توجہ مرکوز کرانے میں کامیاب رہے۔

ڈاکٹر اصغر علی انجینئر نے میری افسانہ نگاری پر تنقیدی اظہار کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا تھا۔

''جدیدیت نے افسانے کو کچھ یوں مسخ کیا کہ حقیقت افسانہ بن کر رہ گئی۔ ادھر کچھ نئے لکھنے والوں نے جدیدیت سے اور اس کی لایعنیت سے منہ موڑ کر حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کیا ہے۔

زندگی کی حقیقت اپنے کو منوا کر رہتی ہے۔ ادب بھی وہی زندہ رہے گا اور مقبول ہوگا، جو زندگی کی حقیقتوں کو سنجیدگی سے برتے، اس کی نفی نہ کرے۔ سیّد احمد قادری زندگی کی اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں اور زندگی اور اس کے پیچیدہ تقاضوں سے اپنی کہانیوں میں بخوبی عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ کہانی ان کے یہاں کہانی ہی رہتی ہے۔ کیوں کہ کہانی کہنے کا فن انہیں خوب آتا ہے یہ زندگی کو پھلتے پھولتے دیکھنا چاہتے ہیں اور یہی ان کی نظریاتی وابستگی ہے۔ سارتر کے مطابق لکھنے کا فعل ہی وابستگی کا اعلان ہے اور قادری کی ہر کہانی یہ

اعلان مبہم نہیں بڑے واضح طور پر، دھیرے نہیں بہ بانگ دہل کرتی ہے۔''

نقادوں کے ساتھ ساتھ وہ افسانہ نگار بھی میرے اسلوب، ماجرا سازی اور کردار نگاری کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکے، جو علامتی اور تجریدی نظام اظہار کو ژولیدہ بیانی اور فنکارانہ خام کاری تصور کر رہے تھے۔ غیاث احمد گدی کے خیالات میرے افسانوی سفر میں روشنی بخشتے رہے، انھوں نے لکھا تھا کہ.....

''جدید اردو فکشن کی دنیا میں سید احمد قادری کی آمد علامتی اور تجریدی نظام اظہار کے نام پر ژولیدہ بیانی اور فنکارانہ خامکاری کی بوجھل فضا میں ہوا کے خوشگوار جھونکے سے کم نہیں۔

اظہار بیان کی صفائی ماجرا سازی اور کردار نگاری کا دروبست تہہ در تہہ زندگی کا عرفان اوراس سے گہری وابستگی سید احمد قادری کی تخلیقی جہت کی نمایاں پہچان ہے۔''

اس قسم کی رائے سے یقیناً میرا حوصلہ بڑھا ہے، بہتر سے بہتر تخلیق کی ترغیب ملی ہے اور میں نے کوشش کی ہے کہ میں لوگوں کی توقعات پر پورا اتروں اور اس کے لئے میں نے ایسی سینکڑوں، ہزاروں راتیں تخلیقی کرب میں گزاری ہیں، جب لوگ آرام وسکون کی میٹھی نیند کی آغوش میں ہوتے ہیں۔

ابھی حالیہ امریکہ کے سفر نے مجھے بہت سارے افسانوں کے موضوعات اور کردار دئے ہیں، جن میں سے دو افسانے 'ملبہ' اور 'وقت کا بہتا دریا' اس افسانوی مجموعہ میں شامل ہیں۔

میرے گزشتہ افسانوی مجموعوں ''ریزہ ریزہ خواب'' اور ''دھوپ کی چادر'' کو شمع بک ڈپو اور اسٹار پبلیکیشنز، نئی دہلی نے جس تیزی سے اور بہت کم وقت میں فروخت کیا تھا، اس سے مجھے خوشی اور حیرانی بھی تھی۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے پاس ان افسانوی مجموعے کی کاپیاں نہیں بچیں کہ میں اپنے دوستوں کی فرمائش اور اصرار کو پورا کر سکوں، جو میرے بعض مشہور اور مقبول افسانوں کو پڑھنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ لہٰذا، اپنے ایسے دوستوں کی خواہشوں کا احترام کرتے ہوئے ان افسانوی مجموعے سے چند افسانے اس نئے مجموعہ میں شامل کر رہا ہوں۔ ان میں سے کئی ایسے افسانے ہیں، جن پر کچھ لوگوں نے فلم بنانے کی

پیشکش کی تھی۔ کچھ افسانوں کو ڈرامائی شکل دے کر ملک کے کئی شہروں میں اسٹیج کیا گیا، جو بہت کامیاب ہوئے۔ بہت سارے انعامات کے ساتھ ساتھ ہندی اخبارات میں تعریفی تاثرات اوراعزازی اسناد بھی ملے۔

اس افسانوی مجموعہ کی اشاعت میں میرے جن دوستوں اور کرم فرماؤں کا تعاون شامل ہے، اس کے لئے میں صدق دل سے ممنون ہوں۔

سیّد احمد قادری

ملبہ

ہیوسٹن سے نیویارک کچھ ضروری کام سے آیا ہوا تھا۔ اسٹیٹن آئر لینڈ جیسی بے حد پرفضا اور خوبصورت علاقہ کے کبرلی پلیس میں اپنے ایک دوست جمیل عثمان کے ساتھ قیام پذیر تھا۔ ویک اینڈ کو دفتر بند ہونے کے باوجود صبح سویرے ہی جمیل عثمان اپنی کار سے کہیں نکل گئے تھے، مجھ سے بھی ساتھ چلنے کو کہا، لیکن میں دن بھر آرام کے موڈ میں تھا، اس لئے جانے سے انکار کر دیا۔

لیکن نیند پوری ہو جانے کے بعد میں بوریت محسوس کرنے لگا تو شام میں تیار ہو کر باہر آیا، باہر کا موسم بڑا خوشگوار تھا، تازہ ہوا کے جھونکے نے مجھے پوری طرح تازہ دم دیا تھا۔ ہر طرف بچھی مخملی گھاس، جھومتے ہوئے پیڑ اور اس کی شاخیں، میں ان ہواؤں کو اپنے اندر سموئے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ اتنے حسین موسم کو کمرے کے اندر بند رہ لطف اندوز نہ ہوا، اس کا افسوس ہونے لگا، پھر سوچا کہ ابھی بھی وقت زیادہ نہیں ہوا ہے، ابھی تو شام جوان ہوئی ہے ، یہ سوچتا ہوا، میں آگے بڑھ رہا تھا کہ خیال آیا کہ آج تنہا ہی سیر کی جائے اور اس خیال کے آتے ہی میں نے چند قدم کے فاصلے پر اسٹیٹن آئر لینڈ فیری کے لئے جانے والی بس کے اسٹاپ پر کھڑا ہو گیا اور بس کے رکنے کے بٹن کو دبا دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں بس آ کر رکی' ویک اینڈ کی وجہ کر بس میں کوئی خاص بھیڑ نہیں تھی۔ بس کو ایک خوبصورت اور سبک سی لڑکی ڈرائیو کر رہی تھی۔ اس نے مسکرا کر میرا استقبال کیا اور کرایہ کے لئے چار کوارٹر کوائن، کوئن بوکس میں ڈالتا ہوا آگے بڑھا اور ایک خالی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

میرے بیٹھتے ہی بس چل پڑی اور تقریباً آدھے گھنٹے کی مسافت کے بعد اپنے آخری اسٹاپ فیری پہنچ کر رک گئی۔

بس اسٹاپ سے فیری کے لئے سیڑھیاں طئے کرتا ہوا نیچے بہت بڑے سجے سجائے ویٹنگ ہال میں آ گیا، جہاں سینکڑوں کی تعداد میں مرد وعورتیں فیری کے آنے کے منتظر تھے۔اس بھیڑ میں، میں بھی شامل ہوگیا۔فیری یہاں سے دنیا کے مشہور تجارتی اور صنعتی مرکز مین ہیٹن تک فری تھی، اس لئے کوئی ٹکٹ نہیں لینا پڑا۔فیری کے آنے میں ابھی کچھ دیر تھی، میں نے کھڑے کھڑے اپنے اطراف کا جائزہ لیا، طرح طرح کے لوگ، روپ رنگ، لباس، میری نگاہیں چاروں طرف گھوم رہی تھیں کہ دیکھا، میرے چند قدم کے فاصلے پر ایک دبلی پتلی بے حد حسین سی لڑکی مسکراتے ہوئے میری جانب دیکھ رہی ہے۔میں نے سمجھا کہ وہ اپنی مسکراہٹ کیساتھ کسی اور سے مخاطب ہے، جلدی سے میں نے اپنے ارد گرد پر نظر ڈالی، پھر اس کی طرف دیکھا...... مجھے سخت تعجب ہوا کہ وہ مجھے ہی اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ لئے دیکھ رہی تھی۔میں نے رسمی طور پر اس کی دلآویز مسکراہٹ کے جواب میں مسکرا دیا اور مجھے مسکراتے ہوئے دیکھ کر وہ چند قدموں کے فاصلے کو طئے کرتی ہوئی میرے قریب آ گئی اور ہائے کہتی ہوئی اس نے اپنا داہنا ہاتھ میری جانب بڑھا دیا، میں نے جھجکتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا۔اس کا مرمریں ہاتھ ابھی میرے ہاتھ میں ہی تھا کہ اس نے اپنے سفید موتیوں جیسے دانت دکھاتے ہوئے، ایک خاص ادا کے ساتھ اپنا نام بتایا........... "کیتھرین"............ "گلیڈ ٹو میٹ یو"

متعجب ہوتے ہوئے میں نے بھی جواب میں کہا۔سیم ٹو یو، آئی ایم عرفان......" چند ساعتوں تک وہ صرف مجھے مسکرا کر دیکھتی رہی۔اس درمیان میں نے اس کے سراپا کا جائزہ لیا، وہ نیلی شرٹ اور لال رنگ کے چست اسکرٹ میں ملبوس تھی۔گلابی رنگت اور اس کی غضب کی معنی خیز مسکراہٹ نے تو جیسے مجھ پر سحر کر دیا۔میں خاموشی سے اس کے حسن وادا میں کھویا ہوا تھا کہ اس نے پھر مسکراتے ہوئے مجھ سے سوال کیا............

"کہاں......" "مین ہیٹن"؟

اوہ......میں بھی......

گڈ......او کے۔

اس کے 'گڈ' اور 'او کے' کہنے میں معنی خیز مسرت کی جھلک نمایاں تھی۔ میں خاموش رہا، میرے ذہن میں طرح طرح کے خیالات سر ابھار رہے تھے۔ کیوں یہ لڑکی مجھ سے دوستی کرنا چاہتی ہے کہیں اس کا فلرٹ مجھے کسی مصیبت میں نہ ڈال دے۔

لیکن اس کے خوبصورت چہرے پر معصومیت جھلک رہی تھی، اس کے حسین چہرے کی معصومیت نے میرے خوف کو کم کر دیا۔

ابھی وہ مجھ سے کچھ بولنے ہی والی تھی کہ فیری پر سوار ہونے کے لئے گیٹ کھل گیا، میں تیزی سے اس طرف بڑھا، اسی تیزی سے وہ بھی میرے ساتھ ساتھ آگے بڑھی...... فیری کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی وہ ذرا سا لڑکھڑا گئی اور جلدی سے اس نے میرا ہاتھ تھام کر خود کو گرنے سے سنبھال لیا لیکن سنبھل جانے کے بعد بھی مزید چند سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے میرا ہاتھ نہیں چھوڑا۔ اس نے میرے داہنے ہاتھ کو اپنے بائیں ہاتھ سے مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھی۔ اس کے گداز ہاتھ کا لمس میرے جسم کے پور پور میں اتر کر عجیب سی لذت سے آشنا کرا رہا تھا کہ میں چاہ کر بھی اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ نہیں چھڑا پا رہا تھا۔

فیری کے اندر پہنچ کر میں نے سمندر کے باہر کے خوبصورت مناظر سے لطف اندوز ہونے کے لئے کھڑکی سے سٹی خالی سیٹ پر بیٹھ گیا، سامنے کی کھڑکی والی سیٹ بھی خالی تھی، میں نے اسے وہاں پر کا اشارہ کیا۔ لیکن اس سیٹ کو نظر انداز کرتی ہوئی میری بغل میں ہی بیٹھ گئی۔ اچٹتی سی نگاہ اس پر میں نے ڈالی تو دیکھا کہ وہ اسی والہانہ انداز میں مجھے دیکھ رہی ہے اور مسکرا رہی ہے۔ اس کی مسلسل مسکراہٹ دیکھ کر مجھے عجیب سا لگنے لگا۔ میری نگاہیں کبھی اس کے حسن و جمال کو جذب کر رہی تھیں، تو کبھی کھڑکی میں لگے شیشہ سے سمندر کی لہروں پر تیرتے ہوئے طرح طرح کے بوٹ اور فیری پر ہوتیں۔ بوٹ پر بیٹھے جوان لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے کو چھیڑ رہے تھے اور پانی کی لہروں سے لطف اٹھا رہے تھے۔ میں ان مناظر کو غور سے دیکھ رہا تھا کہ اچانک کیتھرین نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور مجھے اٹھنے کیلئے کہا۔ میں نے

کہا کہ نہیں میں یہاں ٹھیک ہوں، لیکن وہ بضد ہوگئی، اس کی ضد میں اس طرح شوخیاں اور اپنا ئیت گھلی ہوئی تھیں، کہ میں انکار نہیں کر سکا۔ زبردستی اس نے مجھے وہاں پر سے اٹھایا اور تقریباً ''مجھے کھینچتی ہوئی عرشہ پر لے گئی۔ عرشہ پر پہنچ کر بے اختیار میرے منہ سے 'واؤ' نکل گیا۔ کیا حسین نظارہ تھا، فیری دھیرے دھیرے اپنی رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔ عرشہ پر پہنچ کر کھلا ابر آلود آسماں اور چاروں طرف طرح طرح کے سمندری جہاز اور چھوٹی چھوٹی موٹر بوٹ پانی پر تیر رہی تھیں۔ ایسا خوبصورت اور دلفریب سماں جو آنکھوں سے ہوتے ہوئے دل ودماغ میں اتر جائے اور ان کیفیات کو بیان کرنا مشکل ہو جائے، انہیں صرف اور صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔

ابر آلود موسم کی ہوائیں خنک ہوگئی تھیں۔ وہ میرے قریب بہت قریب آگئی، اتنے قریب کہ میں اس کے لباس میں رچی بسی پرفیوم کی بھینی بھینی خوشبو کے ساتھ ساتھ اس کی سانسوں کی گرمی کو بھی محسوس کر رہا تھا۔ سرد ہواؤں میں اس کی قربت سے پرسکون گرماہٹ کا احساس ہو رہا تھا۔ تھوری دیر میں آسمان سے چھوٹی چھوٹی بوندیں ٹپکنا شروع ہوگئیں، میں نے عرشہ سے اندر چلنے کا اشارہ کیا، تو وہ بالکل بچوں کی طرح مچلنے لگی ''نو......پلیز - اسٹے ہیر - آئی وانٹ انجوائے............''

اس کی اس معصوم التجا پر میں نے ''اوکے'' کہہ دیا اور میں نے جیسے ہی ''اوکے'' کیا، وہ بے اختیار 'ہاؤ، سویٹ' کہتی ہوئی مجھ سے لپٹ گئی۔ عرشہ پر اور بھی کئی نوجوان جوڑے تھے جو ایک دوسرے سے اسی طرح چمٹے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد عرشہ پر موجود سبھوں کی نگاہیں ایک طرف اٹھ گئیں اسٹیچو آف لبرٹی، دھیرے دھیرے قریب آرہا تھا اور فیری جیسے ہی اس کے سامنے پہنچی، عرشہ پر کے لوگوں کے کیمرے اور موبائل کے فلیش چمکنے لگے، سارے لوگ فرانس کے دیئے گئے عالمی عوامی دوستی کی اس یادگار اور تاریخی مجسمہ کی تصویر کو اپنے ساتھ کیمرے اور موبائل میں قید کر لینا چاہتے تھے۔ کیتھرین نے بھی اپنا موبائل نکالا، پہلے اس نے اپنا موبائل مجھے دیا اور مجھ سے ایک خاص ادا کے ساتھ تصویر کھنچوائی۔ پھر اچانک اس

نے اپنا موبائل قریب کھڑی ایک عورت کے حوالے کرتے ہوئے تصویر لینے کی گزارش کی اور مجھ سے لپٹ گئی، اس عورت نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ تصویر لی اور موبائل اسے واپس کر دیا۔

فیری کی رفتار کم ہونے لگی، مین ہٹن قریب آ رہا تھا۔ شام کے دھند لکے میں آسمان کو چھوتی ہوئی ڈھیر ساری خوبصورت روشنی میں نہائی عمارتیں جن کے سمندر میں پڑنے والے عکس نے ایک الگ خوبصورت سماں پیدا کر دیا تھا۔ میں یہاں کئی بار آیا تھا، لیکن آج کا حسین موسم اور ساتھ میں ایک حسینہ کی قربت نے مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری کر دی تھی۔ میں تقریباً ان نظاروں میں مبہوت ہو گیا تھا۔ جیسے جیسے روشنی میں نہاتی عمارتیں قریب آ رہی تھیں، ان کا حسن قابل دید تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں فیری لنگر انداز ہوئی۔ فیری سے باہر نکلتے وقت بھی کیتھرین اسی طرح میرے ہاتھ میں اپنا نرم و نازک گداز ہاتھ دئے ہوئے تھی۔ فیری سے باہر نکل کر ٹھنڈ کا احساس بڑھ گیا۔ میں تیزی سے آگے بڑھا اور ایک اسٹریٹ میں واقع ایک کیفے میں داخل ہو گیا، جہاں کی گرم گرم کافی نے بڑی راحت پہنچائی۔ گرما گرم فرنچ فرائز کے ساتھ گرم کافی کی چسکیوں کے درمیان کیتھرین مستقل بول رہی تھی۔ اس نے اجنبیت کی حدوں کو بہت جلد پار کر لیا تھا اور اس طرح مجھ سے محوِ گفتگو تھی، جیسے وہ مجھ سے برسہا برس سے نہ صرف واقف ہے، بلکہ بہت قریب بھی ہے۔ مجھے بھی اس کا والہانہ انداز، اس کی دلفریب مسکراہٹ، اس کے گلاب کی پنکھڑیوں جیسے خوبصورت ہونٹ، ہونٹوں کے اندر موتیوں جیسے سجے سجائے چمکتے دانت، گلابی رنگت لئے اس کے گال، اس کی اپنائیت اور اس کی قربت مجھے مدہوش کئے دے رہی تھی۔

لیکن کبھی کبھی ذہن میں خوف کے سائے ابھرتے کہ نہ جانے اس لڑکی کا اس طرح مجھ سے ملنے اور قریب ہونے کے پیچھے مقصد کیا ہے۔ کہیں یہ مجھے کسی مصیبت میں نہ پھنسا دے، لیکن اس کے حسین چہرے پر کھیلنے والی معصومیت میرے خوف پر غالب ہو جاتی اور میں

اپنا سر جھٹک دیتا، ''اونہہ، دیکھا جائے گا'' اور اس سوچ کیساتھ اس کے ملائم اور مرمریں ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں دبائے ہوئے، اس کے لمس کو اپنے جسم کے پور پور میں اتارتے ہوئے کیفے سے باہر آیا۔ باہر آ کر سامنے کی ایک دوکان سے سگریٹ کا ایک پیکٹ خریدا۔ پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر اپنے ہونٹوں پر رکھا ہی تھا کہ اس کے ہاتھ بھی سگریٹ کی طرف بڑھے اور ایک سگریٹ لے کر اس نے بھی اپنے خوبصورت گلابی ہونٹوں سے دبالیا۔ میں نے لائٹر سے پہلے اس کی سگریٹ اور پھر اپنی سگریٹ سلگائی اور ایک لمبا کش لیا۔ ٹھنڈا اور کافی کے بعد سگریٹ کی طلب بہت بڑھ گئی تھی۔ میں نے اس کی جانب دیکھا کہ وہ بھی گہرے گہرے کش لیکر اندر ہی اندر طمانیت محسوس کر رہی ہے، جو اس کے گلابی رنگت لئے چہرے پر پھیلی لالی سے عیاں ہو رہا تھا۔ اس کے سگریٹ پینے کے انداز سے میں نے سمجھ لیا کہ وہ سگریٹ کی عادی ہے۔

سگریٹ کا آخری کش لگا کر اس نے سگریٹ کا ٹکڑا، اسٹریٹ پر کھڑے ایک لمبے سے ایش ٹرے میں ڈال دیا اور پھر پلٹ کر میرا ایک ہاتھ تھاما اور لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی ایک اسٹریٹ سے دوسرے اسٹریٹ کی طرف بڑھنے لگی۔ راستے میں گولڈن بل، راک فیلر سنٹر، ٹائمنز اسکوائر وغیرہ ملے، میں ان کے پاس رکنا چاہتا تھا، لیکن اس وقت اس کے قدم بہت تیزی سے اٹھ رہے تھے، میں یہاں کسی خاص مقصد سے آیا نہیں تھا، بس بوریت دور کرنے نکل گیا تھا اور یہ بوریت اس قدر حسین تفریح میں بدل جائے گی، اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ ساتھ تیز قدموں سے آگے بڑھ رہا تھا میرا داہنا ہاتھ مستقل اپنے بائیں ہاتھ میں لئے ہوئے تھی، چلتے چلتے میں اس علاقہ سے بھی گذرا جہاں پوری دنیا میں امن و امان قائم رکھنے کے لئے UNO کا صدر دفتر ہے یہاں دنیا کے تقریباً ہر ملک کا قومی جھنڈا لہراتا رہتا ہے۔ لیکن اس وقت نہ جانے کیوں اس عالمی شہرت والی عمارت میں اداسی چھائی ہوئی تھی۔ اس عمارت کی اداسی کو خاص طور پر میں نے نوٹ کیا کہ ایسا کیوں؟ اور وہ تیز بہت تیز قدموں سے آگے بڑھ رہی تھی اس نے کئی شارٹ کٹ راستے کو بھی اپنایا اور کچھ دیر بعد

میں نے دیکھا کہ وہ ورلڈ ٹوین ٹاور میموریل، جو کبھی ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے نام سے جانا جاتا تھا، کے قریب نئے تعمیر شدہ بہت بڑے فوارے کے قریب پہنچ کر کھڑی ہوگئی۔ میں چونک پڑا۔ وہ یہاں کیوں آئی ہے۔ بارش کی ننھی ننھی بوندیں ٹپک رہی تھیں، پھر بھی کافی لوگ اس جگہ موجود تھے اور بغور دیکھ رہے تھے اور تصویریں اتار رہے تھے، مختلف طرح کی روشنی بکھیرتے اس فوارے کے قریب پہنچتے ہی اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور آگے بڑھی، فوارے کی پوری گولائی کے ماربل پر کندہ سینکڑوں ناموں میں سے ایک نام پر اس نے اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اس نام کو بھی پانی کی بوندوں نے بھگو دیا تھا۔ اس نے بڑے پیار سے اپنے داہنے ہاتھ سے پانی پوچھا اور پھر وہ اس پر جھک گئی۔ اس نام پر اس نے اپنے گرم گرم ہونٹ رکھ دئے۔ دیر تک وہ اس نام کو کِس کرتی رہی۔ اس دوران اس کی آنکھیں نم ہوگئیں تھیں اور اس کی گہری کالی جھیل جیسی آنکھوں سے کئی بوند آنسوؤں کو ٹپکتے ہوئے میں نے دیکھا۔ میں یہ سب دیکھ کر حیرت زدہ تھا، اس نے اس کے بارے میں کچھ بتایا نہیں اور یہ اچانک یہاں پر اس طرح ....میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

کئی منٹوں کے بعد وہ وہاں پر سے ہٹی اور پھر میرے قریب آگئی۔ اس کا معصوم اور خوبصورت چہرہ اداس اور غمگین تھا۔ میرے قریب آ کر اس نے اپنے چہرے پر زبردستی مسکراہٹ لانے کی کوشش کی اور میری جانب دیکھا۔ میری آنکھوں میں حیرت اور استعجاب تھا۔ وہ سمجھ گئی اور پھر اس نے بتایا کہ وہ نام جسے میں نے کِس کیا، وہ میرا منگیتر تھا، جو ۱۱/۹ کو بہت سارے لوگوں کے ساتھ مارا گیا۔ اس کی لاش بھی مجھے دیکھنے کو نہیں ملی کہ میں اس سے لپٹ کر رو لیتی اور مجھے صبر آ جاتا۔ اس لئے ہر ویک اینڈ کو آ کر اسے کِس کرتی ہوں۔ اس کی باتیں سن کر میں حیرت کے سمندر میں ڈوبتا چلا گیا۔ اس نے مجھے محوِ حیرت دیکھتے ہوئے کچھ بولی نہیں اور میرا ایک ہاتھ پھر اپنے ہاتھ میں لیکر آگے بڑھنے لگی۔ کئی اسٹریٹ کے چکر لگائے ہر اسٹریٹ میں کیفے اور بار تھے اور شیشہ کے اندر سے کھاتے پیتے ہوئے لوگ صاف نظر آ رہے تھے۔ بوندا باندی کے بعد ٹھنڈک میں اضافہ ہوگیا تھا۔ اس نے ایک بار کے قریب رک کر میری جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا اور مجھے اثبات میں گردن ہلاتے دیکھ کر بڑی

تیزی سے مجھے ساتھ بار کے اندر داخل ہوگئی۔ہم دونوں ایک ٹیبل کے آمنے سامنے بیٹھ گئے اوراس نے مینو دیکھے بغیر ڈنر کا آرڈر دے دیا اور ساتھ میں شراب بھی منگوالی۔ میں شراب نہیں پیتا،اس لئے اپنے لئے میں نے سوڈا کہا،تو اس نے مجھے حیرت سے دیکھا،لیکن کچھ بولی نہیں۔

اس سے پہلے کہ ٹیبل پر ڈنر لگتے ،شراب کے کئی گھونٹ وہ لے چکی تھی ، میں نے بھی سوڈا واٹر کی چسکی کے دوران دل ودماغ میں اٹھ رہے طوفان کی طرح کئی سوال اس سے کرڈالے۔

وہ شراب کے گھونٹ پیتی رہی اور مجھے دیکھ کر مسکراتی رہی،لیکن اس کی مسکراہٹ میں،اب وہ پہلے والا والہانہ انداز نہیں تھا،میں نے محسوس کیا کہ وہ زبردستی مسکرارہی ہے۔کئی پیگ لینے کے بعد اس کا چہرہ تمتمانے لگا،اس درمیان اس نے میرے سوالوں کا جواب دینے کیلئے سرا ڈھونڈ لیا تھا۔کچھ دیر بعد اس نے بولنا شروع کیا۔

میں............اندر سے بہت ہی ٹوٹی ہوئی لڑکی ہوں۔بچپن ہی میں،ماں باپ چھوڑ گئے، میری پرورش میرے بھائی نے کی ۔ بڑی مشکلوں سے تعلیم حاصل کی اور ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں واقع ایک فرم میں جاب کررہی تھی وہیں مارک سے ملاقات ہوئی۔چند ملاقاتیں محبت میں بدل گئیں۔مارک مجھے بہت چاہتا تھا،دل وجان سے۔وہ مجھے ہر وہ خوشیاں دینا چاہتا تھا جن سے میں محروم رہی۔ہم دونوں جلد ہی شادی کرنے والے تھے اور اپنا گھر بسانے والے تھے،کہ اچانک............اس دن سب کچھ بکھر گیا۔اس دن میں جاب سے آف لئے ہوئے تھی۔ٹی وی پر اچانک دیکھا،تاش کے پتوں کی طرح فلک بوس عمارت زمین بوس ہورہی تھی۔میں نے دیکھتے ہی بے تحاشہ فل اسپیڈ میں گاڑی دوڑاتی ہوئی وہاں پر پہنچنے کی کوشش کی تو دیکھا،چاروں طرف گرتی عمارت کا گرد وغبار تھا۔اور گرد وغبار میں ڈوبا ہوا ہر طرف ملبہ تھا۔ عمارت گرنے سے چند گھنٹے قبل ہی موبائل سے اس سے باتیں ہوئی تھیں،وہ اس شام کو مجھے لے کر تفریح کیلئے کسی خاص جگہ جانے والا تھا۔

میں چیختی چلاتی مارک کو تلاش کرنے کیلئے آگے بڑھنا چاہتی تھی ،لیکن پولیس نے چاروں طرف کارڈن کر دیا تھا ہر طرف ملبہ ،گرد وغبار اور شعلے ہی شعلے تھے اور ان شعلوں میں میرے سارے سپنے اس دن خاکستر ہو گئے اور ملبہ میں سینکڑوں لوگوں کے ساتھ میرا مارک بھی دفن ہو گیا۔

گھر میں میرا بڑا بھائی جو فوج میں ہے، چند ماہ قبل عراق کی جنگ سے لوٹا ہے اور لوٹنے پر اس نے دیکھا کہ اس کی بیوی اسے چھوڑ کر دوسرے کی ہو گئی ہے، وہ اس صدمہ کو برداشت نہیں کر سکا۔ دل ودماغ پر جنگ کے اثرات اور بیوی کی بے وفائی نے اسے پاگل کر دیا، وہ کبھی اپنی بیوی کو یاد کر کے روتا ہے، کبھی کہتا ہے دیکھو، دیکھو میں نے دشمن کی خوبصورت بیوی کو گولی سے اڑا دیا ہے۔ دیکھو اس کے بچے کو اس کے سامنے ہی میں نے بم مار کر اس کے پرخچے اڑا دیئے۔

ہاہاہا...... ہاہاہا... میں نے سینکڑوں لوگوں کو گولیوں سے بھون دیا ہے اور ساری لاشیں ملبہ میں دفن ہو گئیں... ملبہ... ملبہ.... ہاہاہا، افغانستان میں ملبہ، عراق میں ملبہ، سیریا میں ملبہ، لبیا میں ملبہ، غزہ میں ملبہ، انسانوں کی لاشوں کا ملبہ ہی ملبہ........ وہ چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھائے رکھتا ہے اور شراب میں ڈوبا رہتا ہے.......... جی چاہتا ہے، مجھے بھی کوئی ایسے ہی کسی ملبہ میں دفن کر دے ،لیکن کبھی کبھی اداسیوں کے درمیان تم جیسا کوئی مل جاتا ہے، تو جینے کی خواہش انگڑائیاں لینے لگتی ہے ،لیکن میں اب جینا نہیں چاہتی۔

میں اس قدر ٹوٹ کر بکھر چکی ہوں کہ خود کو سمیٹنا چاہوں، تو سمیٹ نہیں پاتی۔ میرا پورا وجود غموں، دکھوں اور مصیبتوں کے ملبہ میں دبا پڑا ہے..........

یہ کہتے کہتے وہ زار وقطار رونے لگی، اس کے چہرے پر کھیلنے والی معنی خیز مسکراہٹ غائب تھی اور اس کی سسکیاں تیز ہو رہی تھیں۔

میں حیرت سے اسے دیر تک روتا ہوا دیکھتا رہا ،میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں اور اسے کیا کہوں کہ بے اختیار میں نے اس کے شانے پر محبت بھرا اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

وقت کا بہتا دریا

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔

جاوید نے بچپن سے جوانی میں قدم رکھا۔ اعلیٰ تعلیم کے بعد بیرون ملک میں اچھی نوکری اور غزالہ جیسی خوبصورت اور تعلیم یافتہ بیوی ملی، تین چار سال میں ایک بیٹا اور ایک بیٹی کا وہ باپ بن گیا............ اور پھر وقت کو تو جیسے پر لگ گئے ہوں......

صبح ہوتی تو لگتا جیسے گھر میں طوفان آ گیا...... وہ بذات خود، غزالہ اور دونوں بچے بیڈ روم سے واش روم، واش روم سے لیونگ روم اور لیونگ روم سے لونڈری روم دوڑتے بھاگتے نظر آتے، سبھوں کی نگاہیں دیوار پر لگی گھڑی کی ٹک ٹک کرتی سوئیوں پر ہوتی...... سب سے زیادہ پریشان غزالہ رہتی...... کبھی جاوید کو دوڑتی ہوئی گارلک بریڈ دیتی، کبھی بچوں کو تیار ہونے کی تاکید کرتی، کبھی انہیں جلدی جلدی دودھ پینے اور کچھ کھانے کے لئے بھگاتی جاتی اور اسی دوران وہ خود بھی تیزی سے تیار ہونے کی کوشش میں مصروف رہتی۔ گھڑی کا کانٹا سات پر پہنچتا تو یہ چاروں بھاگتے ہوئے تیزی سے گھر کے اندر سے باہر آتے، جاوید اپنی گاری اسٹارٹ کرتا اور دفتر کے لئے روانہ ہو جاتا، غزالہ اپنی گاڑی میں دونوں بچوں کو بٹھاتی اور کار ڈرائیو کرتی ہوئی دونوں بچوں کو کیئر ٹیکر ہوم میں اتارتی اور پھر اسی تیز رفتار سے وہ اپنے جاب کے لئے چل دیتی۔

دونوں بچے کچھ دیر تک کیئر ٹیکر ہوم میں دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل کود کرتے اور ساڑھے آٹھ بجے دوسرے بہت سارے بچوں کے ساتھ لائن لگا کر اسکول کے لئے روانہ ہو جاتے ۔لنچ ٹائم میں روزانہ ہی دونوں بچے اسکول کے کیفے ٹیریا میں پہنچ کر اپنی بھوک

مناتے۔ دو بجے چھٹی ہوتی اور وہ دونوں پھر ڈھیر سارے بچوں کے ساتھ لائن لگا کر کیئر ٹیکر ہوم پہنچتے ، یہاں ان کے لئے کھانا تیار ملتا ،لیکن دونوں کبھی کھاتے ،کبھی نہیں کھاتے۔ دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل کود میں ان کا زیادہ دل لگتا۔

شام چھ بجے غزالہ اپنی جاب سے لوٹتی ہوئی کیئر ٹیکر آتی ،دونوں بچوں کو پک کرتی اور اپنے گھر کی جانب چل دیتی۔ راستے بھر دونوں بچوں سے دن بھر کی روداد پوچھتی لنچ لیا تھا یا نہیں ،زیادہ شرارت تو نہیں کیا، کلاس ٹیچر کا ریمارکس اچھا ہے نہ؟ وغیرہ وغیرہ۔

لیکن دونوں بچے بس ہاں ہوں میں جواب دیتے ،اس لئے کہ دن بھر کی بھاگ دوڑ اور کھیل کود کے ساتھ ساتھ پڑھائی انہیں بہت زیادہ تھکا دی۔

گھر پہنچ کر دونوں بچے اپنے اپنے ہوم ورک جلدی جلدی کرنے میں مصروف ہو جاتے ، جاوید ایک گھنٹہ بعد آتا۔ وہ بھی تھک کر چور ہوتا ،غزالہ کا کبھی موڈ رہتا ،تو سبھوں کے لئے کھانا بناتی اور موڈ نہیں رہا یا تکان زیادہ رہتی تو پھر کسی رسٹورینٹ سے کھانا منگا لیتی اور کھانا کھا کر چاروں دوسری صبح جلدی جاگنے کے لئے سو جاتے۔

تقریباً یہی روز کا معمول تھا، ویک اینڈ میں مصروفیت اور بڑھ جاتی کہ پورے ہفتہ بھر کی گھر کی صفائی ، کپڑے کی دھلائی ، جاب کی رپورٹ ، بچوں کا ہوم ورک ...... ہاں ان ہی مصروف لمحوں میں وہ کبھی گھومنے کے لئے باہر نکل جاتے اور رات گئے ہوٹل سے کھانا کھا کر لوٹتے اور دوسرے دن کی صبح سے پھر وہی بھاگ دوڑ۔

جاوید کبھی جاب سے کچھ پہلے آجاتا تو دیکھتا گھر میں سناٹے کی حکمرانی ہے...... اسے عجیب سا لگتا اور وہ لیونگ روم کے صوفہ میں بیٹھا سوچنے لگتا............ اس کی سوچ اسے بچپن کی وادیوں میں لے جاتی .... وہ بھی کیا دن تھے، پورا گھر بھرا ہوا۔ دادا، دادی، اماں، ابا، خالہ دادی، ڈھیر سارے بھائی بہن، چچا، چچی ان کے بچے، نوکر چاکر، دائی ماما...... گھر کے باہری حصہ میں تین چار گائے، گھر کے پچھواڑے میں بنے تالاب کے گرد ہنس بطخیں ، چھوٹی بطخیں، کبوتروں کے کابک۔ مرغیوں کے ڈربے............ پنجڑوں میں طرح طرح

کے خوبصورت طوطے، چڑیاں.......... گھر کے چاروں طرف آم، امرود، شریفہ، بیر، جامن اور پپیتہ کے پیڑ..........

کتنا مزہ آتا تھا، سارے بھائی بہن مل کر طرح طرح کے کھیل کھیلتے، انکا چھپی کے کھیل میں تو اور مزہ آتا تھا، کبھی وہ پیڑ کی ڈالیوں پر چڑھ کر چھپ جاتا، کبھی گائے کے رکھے گئے پوال کے انبار میں دبک جاتا.......... سبھی مل کر کبھی آم توڑ کر کھاتے، کبھی امرود، کبھی بیر، کبھی شریفہ، کس قدر میٹھے اور مزیدار ہوتے تھے یہ پھل۔ کھیل کے دوران گھر کے اندر سے کبھی دادا ابا نکلتے تو انہیں دیکھتے ہی سہم جاتے، یہ دیکھ کر وہ سمجھ جاتے کہ یہ لوگ کسی طرح کی شرارت نہیں کررہے ہیں اور وہ اطمینان کی سانس لیتے ہوئے پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتے۔ دادا ابا کے حقہ کی گڑگڑاہٹ گونجتی رہتی، اس کے تمباکو کی خوشبو فضا میں تیرتی رہتی۔

شام میں مغرب بعد مولوی صاحب آجاتے اور بڑے ہال میں کئی چوکیوں کو ملا کر، بچھے خوبصورت قالین پر سارے بھائی بہن بیٹھ جاتے اور مولوی صاحب باری باری سبھوں کو دئے گئے سبق کو سنتے جاتے، اس دوران دوسرے بھائی بہن آگے پیچھے جھوم جھوم کر اللہ ایک ہے، پاک اور بے عیب ہے..... اللہ ایک ہے پاک اور بے عیب ہے یا اردو پیاری ......اردو پیاری...... کی رٹ لگائے جاتے، کوئی الحمد یاد کرتا، کوئی دوسرے سورۃ [illegible]تا جاتا۔ کوئی بچہ خاموش ہو جاتا تو مولوی صاحب کی تیز نگاہیں اسے پکڑ لیتیں اور ایک چھڑی سڑاپ سے پڑتی۔ آموختہ کے بعد سبھوں کی چھٹی ہو جاتی.......... سارے بچے دوڑتے ہوئے گھر کے اندر جاتے، دسترخوان پر کھانا چن دیا جاتا اور سبھی مزے لے لے کر کھانا کھاتے، کچھ گپیں بھی ہوتیں کچھ شرارتیں بھی ہوتیں..........

وقت کہاں سے کہاں نکل گیا...... جاوید ان خیالوں میں ایسا ڈوبا کہ غزالہ اور دونوں بچوں کی آمد کا احساس ہی نہیں ہوا۔ تینوں آکر سامنے کھڑے ہو گئے تو وہ چونک پڑا۔ اور پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔۔

ارے تم لوگ آگئے؟ جواب میں غزالہ نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا، اور پوچھا ’تم

کہاں کھوئے ہوئے ہو؟

''نہیں کچھ نہیں......بس یونہی......آج کچھ زیادہ ہی تھک گیا ہوں'' جاوید نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ارے یہ تو روز کا معمول ہے، آج ویسے تم کچھ زیادہ اداس اور پریشان لگ رہے ہو؟ کوئی خاص بات......؟

غزالہ کے اس سوال کو نظر انداز کرتا ہوا، وہ اٹھ کھڑا ہوا اور پانی پی کر اپنے بیڈ روم میں پہنچ کر اپنے بیڈ پر لیٹ گیا۔

کچھ دیر بعد دونوں بچوں کو سلا کر غزالہ بھی آ گئی......اس نے محسوس کیا کہ جاوید آج خلاف توقع کچھ پریشان ہے۔ اس لئے اس نے پھر سوال کیا......کیا بات ہے جاوید، سچ سچ بتاؤ......

''ارے نہیں کوئی بات نہیں، بس نیند نہیں آ رہی ہے''......

جاوید کی اس بات سے غزالہ مطمئن نہیں ہوئی اور جب اس نے بہت کریدا، تو جاوید نے کہا......

دراصل میں اس تیز اور بہت تیز دوڑتی بھاگتی زندگی سے گھبرا گیا ہوں۔ ہم دونوں اتنے پیسے کس کے لئے کما رہے ہیں؟ نہ آرام ہے، نہ سکون و اطمینان ہے، اس بھاگ دوڑ میں دن بہ دن ہم دونوں ایک دوسرے سے یہاں تک کہ اپنے بچوں سے بھی کتنے دور ہو گئے ہیں۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے، کیا دولت کا حصول ہی سب کچھ ہے؟

غزالہ نے چونک کر جاوید کو بہت غور سے دیکھا اور سوال کیا، تو کیا کیا جائے؟ اس کا حل کیا ہے؟

حل......یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم لوگ اب اپنے ملک واپس ہو جائیں، جہاں اماں، ابا، کی سونی نگاہیں، ہم لوگوں کو ڈھونڈتی رہتی ہیں، آج بھی وہاں سارا کچھ ہے، صرف ہم

لوگوں کے نہ رہنے کی وجہ کر ویرانی ہے، وہاں مجھے جاب بھی ضرور مل جائیگی ،تم گھر کا، اماں، ابا کا بچوں کا خیال رکھوگی ،تم اپنے خاندان والوں سے بھی قریب ہو جاؤ گی ،دائی نوکر تمہاری مدد کیا کریں گے ،بچوں کو اپنا ایک ماحول ملے گا ،اپنی تہذیب ،اپنی قدریں ،اپنی زبان اور اور......

جاوید بولتا رہا، غزالہ غور سے سنتی رہی اور تھوڑی دیر بعد بولی ....سنو جاوید، آج کی زندگی کی یہی سچائی ہے اور ہم ان سچائیوں سے منہ نہیں موڑ سکتے ۔بس زندگی کے بہتے دھارے میں بہتے جاؤ ....اور، آسکر وائلڈ کا قول تو تمہیں یاد ہی ہوگا کہ'وقت کے ساتھ چلو، ورنہ وقت تمہیں چھوڑ کر آگے بڑھ جائے گا۔'رات کافی ہوگئی ہے، اب تم سو جاؤ اور مجھے بھی سونے دو، ویسے بھی کل مجھے سویرے ہی نکلنا ہے۔''

یہ کہتی ہوئی غزالہ نے بیڈ سوئچ سے لائٹ آف کیا اور دوسری طرف کروٹ لے کر سوگئی۔

روشنی کے لئے

قتل کا منصوبہ طئے ہو گیا۔

لال ہرے نوٹوں سے بھرا بریف کیس، ایک تصویر اور ساتھ میں نام و پتہ آنے والے شخص نے پیشہ ور قاتل جابر بھائی کے حوالے کیا، جابر نے تصویر دیکھی اور مسکراتے ہوئے بولا۔۔۔

''ارے یہ تو بالکل فاختہ کی اولاد معلوم ہوتا ہے، اس کی آنکھوں میں عیاری ہے، نہ مکاری ہے، چہرے پر بھی معصومیت ہے، ایسے بے ضرر آدمی کو کیوں مروار ہے ہو یار؟

جابر کے اس سوال پر سامنے کھڑا بریف کیس دینے والا کیم شحیم شخص، جس کی آنکھوں اور چہرے سے درندگی جھانک رہی تھی، طیش میں آگیا اور غصہ بھرے لہجہ میں کہا۔۔۔

''تمہیں اس سے مطلب نہیں ہونا چاہئے، تم روپئے لو اور کام کرو فالتو بک بک نہیں''۔

''ارے یار تم تو خفا ہو گئے، میں تو یوں ہی پوچھ رہا تھا۔ مجھے اس شخص سے کیا ہمدردی ہو سکتی ہے، تم تو کسی مرغی کو بھی مارنے کے لئے پیسے دو گے تو میں تیار رہوں گا۔ مجھے تو بس پیسے سے مطلب ہے۔ پیسہ...... ہاہاہا...... پیسہ...... پیسہ ہی تو آج سب کچھ ہے، پیسے سے جو چاہو خرید لو، ایمان، دھرم، آرام، عیش اور یہاں تک کہ بڑی سے بڑی کرسی بھی۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔ فلک شگاف قہقہہ لگاتے ہوئے' جابر آنے والے سرخ مائل چہرہ والے شخص کو دیکھنے لگا۔

جابر کے اس قہقہہ کو نظر انداز کرتا ہوا سرخ اور کرخت چہرہ والا شخص بولا۔۔۔

''تمہاری مانگ پوری کردی گئی ہے، تم کام پورا کرواور کام ہونے کے بعد بقیہ پانچ لاکھ تمہیں مل جائیں گے۔ ویسے تم نے پوچھا ہے تو سنو— یہ سالا، بہت ایماندار بنتا ہے، ہمارے ڈیل میں اڑنگا لگا رہا ہے، اس ایک شخص کی وجہ سے میرے باس کے ماتحت چلنے والی بیس پچیس کمپنیوں کو جو تجارتی فائدہ ہونے والا ہے، وہ رک جائیگا، اس سالے کو پہلے خریدنے کی کوشش کی گئی، کروڑوں روپئے کا آفر دیا گیا، پھر بھی راضی نہیں ہوا، پھر ڈرانے دھمکانے کی کوشیش کی گئیں، لیکن یہ نہ جانے کس مٹی کا بنا ہوا ہے کہ......اور اب آخر میں اس کا خاتمہ ہی اس کا علاج ہے......''

''خیر، چھوڑو، ان باتوں کو، تم جتنا جلد ہو، اس کا کام تمام کرو، اور بقیہ روپئے لے لو''۔

یہ کہتا ہوا، سرخ اور کرخت چہرہ والا شخص، جو بہترین سوٹ میں ملبوس تھا، واپسی کے لئے مڑ گیا۔

اس شخص کے جاتے ہی جابر نے اپنے ایک خاص آدمی بھیما کو آواز دی اور وہ جب قریب آیا، تو جابر نے اس کے ہاتھوں میں وہ تصویر اور پتہ دیا اور کہا—

''جاؤ پتہ لگاؤ، یہ آدمی کہاں رہتا ہے، کیا کرتا ہے، گھر آنے جانے کے لئے کون سا وقت اور راستہ اپناتا ہے، اس کا ٹکٹ کٹ چکا ہے، جلد سے جلد اوپر بھیجنا ہے، ہاہاہا......بات سمجھ گیا نا......؟''

یہ کہہ کر بھائی نے اسے جانے کا اشارہ کیا اور ایک سگریٹ سلگا کر فضا میں مرغولے چھوڑتے ہوئے، سامنے ٹیبل پر رکھی شراب کی بوتل سے اپنا منہ لگا دیا۔

تیسرے ہی دن بھیما، ہاتھ جوڑے بھائی کے سامنے آ کھڑا ہوا اور بولا۔

''ہاں بھائی' سب کچھ پتہ لگا لیا ہے۔ لیکن بھائی، وہ آدمی تو بالکل مرا ٹوٹا ہے، اسے مارنے کے لئے خواہ مخواہ......''

''ابے سالے، تجھے بھی اس سے ہمدردی ہوگئی، مرے ٹوٹے، ایماندار، شریف آدمی ہی تو آج کے اس دور میں خطرناک ہوتے ہیں، ایسے لوگ نہ خود ترقی کرتے ہیں اور نہ ہی

دوسروں کو ترقی کرنے دیتے ہیں — اب دیکھ اس ایماندار آدمی کو ہم پیسے لے کر مارینگے نہیں، تو کھائینگے کیا...... ہاہاہا...... ہاہاہا......'' بھائی نے ایک زبردست تمسخرانہ قہقہہ لگایا......

بھیما بھی ہنسنے لگا۔

''ہاں بھائی، یہ تو تم ٹھیک ہی کہتے ہو، ہم لوگ کیا جھال بجائینگے، ہی ہی ہی......''

''اچھا سُن — '' بھائی اچانک سنجیدہ ہوتے ہوئے بھیما سے پھر مخاطب ہوا اور پوچھا کل یہ کام ہو جائے گا؟

ہاں، بھائی، بڑے آرام سے ہو جائیگا۔ وہ آدمی ہر روز اپنے دفتر سے لوٹتے ہوئے اپنے پارٹی دفتر جاتا ہے اور نو دس بجے رات تک اپنے گھر لوٹتا ہے، خالی ہاتھ، نہ کار، نہ اسکوٹر، نہ سائکل اور نہ ہی کوئی سیکوریٹی......''

''ٹھیک ہے، تو کل ہی یہ کام کر دیا جائے، مرے ہوئے کو مارنے میں دیر نہیں کرنا چاہئے، کیوں، ہے نا، ہاہاہا......''

بھائی نے حسب عادت پھر ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بھیما سے کہا —

''ٹھیک ہے، تو، اب جا اور کل رات آٹھ بجے تک آجانا''

یہ کہتے ہوئے وہ پھر شراب کے گھونٹ لینے لگا۔

دوسرے روز بھیما وقت پر آ گیا!

اس وقت تک چاروں طرف اندھیرا پھیل چکا تھا شام سے لائٹ گُل تھی، بس کسی کسی گھر سے روشنی کی کرنیں جھانک رہی تھیں۔

بھیما کو دیکھتے ہی، جابر، جو پہلے ہی سے تیار بیٹھا تھا، اُٹھ کھڑا ہوا اور بھیما سے بولا — ''چل''

دونوں کمرے سے باہر نکلے، پورٹیکو میں کھڑی لمبی، چمچماتی ایک خاص کار میں دونوں سوار ہوئے، بھیما نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور جابر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں کار ہوا سے باتیں کرنے لگی۔

کار نے اس شخص کے گھر کے اطراف کا ایک چکر لگایا، پھر پارٹی آفس کے دو راؤنڈ لگائے اور پھر ایک سنسان جگہ پر ایک درخت کے نیچے کار کھڑی ہو گئی۔۔۔ بھائی نے ایک سگریٹ سلگائی اور وہاں پر کی پُر بہار فضا کو سگریٹ کے دھوئیں سے آلود کرنے لگا۔

ٹھیک ساڑھے نو بجے دو شخص سامنے سے آتے ہوئے دِکھے دونوں ہی ادھیڑ عمر کے تھے، ایک کی آنکھوں پر عینک تھی، سادہ کرتا، پائجامہ اور پاؤں میں اس کے چپل تھی اور وہ شخص بڑے جوش بھرے لہجے میں اپنے دوست سے باتیں کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا، بھیما نے عینک والے شخص کی طرف اشارہ کیا، جابر نے بھی تصویر والے شخص کو آسانی سے گاڑی کی تیز روشنی میں پہچان لیا، دونوں شخص مخالف سمت سے بڑے اطمینان سے باتیں کرتے ہوئے چلے آ رہے تھے اور جیسے ہی دونوں کار کے قریب پہنچے، جابر کے سائلنسر لگے ریوالور سے بڑے نپے تلے انداز میں دو فائر ہوئے، ایک دلدوز چیخ ابھری اور گاڑی جو پہلے ہی سے اسٹارٹ تھی، زن سے آگے بڑھ گئی۔ بھائی نے بڑے اطمینان سے پھر ایک سگریٹ اپنے ہونٹوں پر رکھ کر جلائی اور ہلکے ہلکے کش لینے لگا۔

صبح ہوئی اور بھائی یہ دیکھ کر حیرت زدہ تھا کہ رات مارے گئے نرنجن کمار کے قتل پر سارے اخبارات اور ٹیلی ویژن کے نیوز چینل چیخ پڑے تھے۔ شردھانجلی دی جا رہی تھی، قتل کی مذمّت کی جا رہی تھی اور طرح طرح کی وجوہات سے اس قتل کو جوڑا جا رہا تھا۔

یہ سب دیکھ کر بھائی سوچنے لگا، قتل کرانے والا شخص تو کہہ رہا تھا کہ یہ معمولی سا آدمی ہے، شریف اور ایماندار ہے، ڈیل میں رخنہ ڈال رہا ہے، اس لئے اسے راستے سے ہٹانا ضروری ہے، پھر ایسے معمولی شخص کے قتل پر اتنا ہنگامہ کیوں ہے؟

بھائی کو حیرت ضرور ہوئی، لیکن اس نے اخبارات اور نیوز چینل کی خبروں پر زیادہ دھیان نہیں دیا اور سوچا، یہ سب تو ہوتا ہی رہتا ہے، آجکل نیوز چینل اور اخبار والوں کو بس خبر چاہئے، بات کا بتنگڑ بنانا ان کی عادت ہے۔

اسی روز رات گئے پھر وہی سرخ رنگت اور کرخت چہرہ والا شخص آیا اور اس نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے، بھائی کے سامنے بقیہ پانچ لاکھ روپئے سے بھرا ایک بیگ اس کے حوالے کیا۔

روپئے سے بھرے بیگ کو لیتے ہوئے، بھائی نے اس شخص سے پوچھا۔''اس آدمی کے مرنے پر یہ اخبار اور ٹی.وی. والے تو بڑا ہنگامہ کر رہے ہیں''۔

''ارے کچھ نہیں، چند روز میں سب معاملہ ٹھنڈا پڑ جائیگا۔''

یہ کہتا ہوا وہ شخص واپسی کے لئے مڑ گیا۔

لیکن نرنجن کمار کے قتل کا معاملہ طول پکڑتا جا رہا تھا، ہر روز اخباروں اور نیوز چینلوں پر ہنگامہ تھا، مذمّت کا سلسلہ جاری تھا اور اس قتل کی تفتیش کسی بڑی جانچ ایجنسی سے کرانے کا مطالبہ بڑھ رہا تھا۔

بھائی کو تھوڑی تشویش ہونے لگی، وہ بار بار سوچ رہا تھا اتنے لو پروفائل آدمی کے قتل پر اتنا ہنگامہ کیوں برپا ہو رہا ہے؟

اس کا تجسس بڑھتا جا رہا تھا — اور ایک دن اس نے بھیما کو بلایا اور کہا —

''چلو، اس نرنجن کے گھر چلتے ہیں، دیکھیں، آخر اس آدمی میں ایسی کیا خاص بات تھی کہ اتنا ہنگامہ ہے''۔

بھیما بھائی کی اس خواہش پر ششدر رہ گیا، بھائی کو یہ کیا سوجھی، لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ بھائی نے کوئی فیصلہ کر لیا، تو وہ فیصلہ اٹل ہے۔

بھائی نے کہا — ''ارے تو اتنا گھبرا کیوں رہا ہے، چل، ذرا دیکھا جائے۔ یہ آدمی اتنا

شریف اور ایماندار تھا، تو پھر اس کے قتل کے لئے دس لاکھ روپئے کیوں خرچ کیے گئے۔"

بھیما' بھائی کی بات سن کر خاموش ہی رہا، اور بے دلی سے اس کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا۔

باہر نکل کر دونوں ایک چھوٹی گاڑی میں بیٹھے اور گاڑی نرنجن کمار کے گھر کی جانب چل پڑی۔

تھوڑی ہی دیر بعد گاڑی نرنجن کے گھر کے قریب رکی، بھائی دیر تک گاڑی میں خاموش بیٹھا، سگریٹ پھونکتا رہا۔

اس وقت وہ ایک عجیب تذبذب اور کشمکش میں مبتلا تھا، اس کے دماغ میں ہلچل تھی، وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔

کئی سگریٹ پھونکنے کے بعد وہ گاڑی سے اترا اور بھیما کو گاڑی کے اندر ہی بیٹھے رہنے کی ہدایت دیتا ہوا آگے بڑھ گیا، چند قدم کا فاصلہ طئے کرنے کے بعد وہ نرنجن کے گھر کے سامنے کھڑا تھا۔

نرنجن کا گھر ایک اوسط درجے سے بھی نیچے کا گھر تھا، ایسا لگتا تھا، اس گھر میں برسہا برس سے رنگائی پتائی بھی نہیں ہوئی تھی، کھڑکی دروازے سب جواب دے چکے تھے، گھر کے باہر ویرانی سی چھائی ہوئی تھی، اس نے ہمت کرتے ہوئے صدر دروازے پر دستک دی، جواب میں جلد ہی دروازہ کھلا، سامنے اُداس، بے جان سا چودہ پندرہ سال کا ایک لڑکا کھڑا تھا، اس کے لباس اور رنگ ڈھنگ سے مفلوک الحالی ٹپک رہی تھی۔ لڑکے نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا—

"میں نرنجن جی کا دوست ہوں، خبر ملی تو ملنے چلا آیا"— بھائی نے بڑی ملائمیت سے کہا۔

"اوہ، اچھا، اندر آیئے"— اور لڑکا اسے لئے ہوئے ایک کمرہ میں آ گیا، جہاں ایک کھڑکی سے ہلکی روشنی آ رہی تھی، کمرے کے اندر کئی پرانی اور زنگ آلود کرسیاں پڑی ہوئی تھیں، درمیان میں ایک ٹیبل بھی تھا، جو اپنی رنگت کھو چکا تھا۔

لڑکا، بھائی کو کمرے میں بٹھا کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس کمرے میں سفید ساری میں لپٹی ایک معمولی شکل و صورت کی عورت اندر داخل ہوئی، جس کی گود میں تقریباً چھ ماہ کا لاغر اور مریل سا بچہ تھا۔ ان دونوں کو بھی دیکھنے سے ایسا لگتا تھا جیسے انہیں کبھی اچھی غذا تک نصیب نہیں ہوئی ہے۔

اس عورت کو دیکھتے ہی بھائی کھڑا ہو گیا— عورت کی آنکھوں سے اجنبیت جھانک رہی تھی، جسے سمجھتے ہی بھائی نے ایک سفید جھوٹ کا سہارا لیا اور کہا—

''میں نرنجن جی کا دوست ہوں، باہر رہتا ہوں، حادثہ کی خبر ملی تو ملنے چلا آیا''۔

عورت بھائی کی بات سن کر خاموش رہی اور ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور بھائی کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ عورت کی گود کا بچہ بار بار اپنی ماں کی چھاتی کی طرف لپک رہا تھا، اور عورت ہر بار اسے اس حرکت سے باز رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

چند لمحے، عورت اور بھائی آمنے سامنے خاموش بیٹھے رہے، پھر بھائی نے ہی سکوت توڑتے ہوئے پوچھا—

''یہ سب کیسے ہو گیا—؟

عورت چند ساعت خاموش رہی، پھر گویا ہوئی—

''یہ تو ایک نہ ایک دن ہونا ہی تھا، کچھ لوگ اپنے مفاد میں پورے علاقہ کو متورکرنا چاہتے تھے، نرنجن جی کا کہنا تھا کہ اپنی محنت، کوشش اور لگن سے علاقہ کو متور کیا جائے، ایسا مانگے کا اجالا کیا کہ اپنا سب کچھ ختم ہو جائے اور پورے علاقہ کو گروی رکھ دیا جائے۔

عورت کی یہ بات سن کر، اچانک بھائی کو اس سرخ مائل شخص کی بات یاد آئی کہ ''میرے باس کے ماتحت بیس پچیس کمپنیوں کا فائدہ ختم ہو جائے گا اگر یہ شخص سامنے سے نہیں ہٹا تو—''

بھائی عورت کی بات سن کر کچھ سمجھ نہیں سکا اور خاموش رہا۔ تھوڑی دیر بعد وہ کھڑا ہو گیا اور

بے خیالی میں اس کا ایک ہاتھ پینٹ کی ایک جیب میں چلا گیا، جہاں پانچ سو روپے کی ایک گڈی پڑی تھی۔ اس نے اسے نکال لیا اور عورت کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا——

''اسے رکھ لیجئے کچھ کام آئیگے۔''

عورت نے بڑھے ہوئے ہاتھ میں روپے کی گڈی کو بے توجہی سے دیکھا اور کہا——

''نہیں بھائی صاحب، اس کی ضرورت نہیں، آپ کے دئے ہوئے یہ روپے میرے کتنے دن کام آئینگے؟ بھگوان نے مجھے دو ہاتھ اور دماغ دیا ہے، مجھے ان پر زیادہ بھروسہ ہے، اور پھر......''

عورت کی بات ابھی مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ اچانک وہ لڑکا جو بھائی کو اندر کمرے تک لایا تھا، داخل ہوا، اسے کمرہ کے اندر کم روشنی کا احساس ہوا اور اس نے آگے بڑھ کر کمرے کی دونوں کھڑکیاں کھول دیں، اور کھڑکیاں کھلتے ہی پورے کمرہ میں اُجالا پھیل گیا۔

بھائی، کمرہ سے باہر نکل آیا اور دھیرے دھیرے بے جان قدموں سے آگے بڑھنے لگا، اس کی آنکھوں میں نہ جانے کیوں اس وقت سیلاب امڑ آیا تھا۔

زندگی کے لئے

صرف ایک دن قبل ہی گوسائی گاؤں کے شیخ رحمت اور مکند پرساد کے درمیاں کھیت میں پانی کے بٹوارے کو لے کر لڑائی ہوئی تھی۔ شیخ رحمت کے براہل نے نہر کا پانی کاٹ کر شیخ رحمت کے سوکھ رہے کھیت میں لے لیا تھا۔ یہ خبر مکند پرساد کو ملی تو وہ اپنے لٹھیتوں کے ساتھ کھیت پر پہنچے اور شیخ رحمت کے براہل کی زبردست پٹائی کر دی۔ اس پٹائی کی اطلاع جیسے ہی شیخ رحمت کو ملی وہ بھی اپنے دس براہلوں کے ساتھ کھیت پر جا دھمکے اور دونوں گروپ میں جم کر مار دھاڑ ہوئی۔ شیخ رحمت نے مکند پرساد سے کہا تمہیں اپنی دولت پر بہت گھمنڈ ہے، میں تمہیں دیکھ لونگا۔ جواب میں مکند پرساد نے بھی دھمکی دی۔ تمہیں بھی زمینداری کا بڑا نشہ ہے، تمہارا بھی نشہ اتار دونگا۔۔۔ ان دونوں کے درمیان جھگڑا طول پکڑتا دیکھ براہلوں میں سے ایک براہل دوڑتا ہوا گاؤں کے سرپنچ کو خبر دی، وہ بھی بھاگا بھاگا جائے وقوع پر پہنچا اور دونوں کو سمجھا بجھا کر نرم کرنے کی کوشش کی۔ وقتی طور پر سرپنچ کے کہنے پر دونوں خاموش تو ہو گئے لیکن دونوں نے اپنی اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے گھر گئے کہ اب اس گاؤں میں ہم رہینگے یا تم رہوگے، ہم سے یہ لڑائی تمہیں بہت مہنگی پڑیگی۔

دونوں گھر گئے، دونوں کے گھر والوں نے بھی دونوں کو سمجھانے کی کوششیں کیں۔ پرانے تعلقات کا واسطہ دیا، لیکن دونوں کو یہ ضد تھی کہ صبح ہونے دو، میں دیکھونگا وہ کتنا بہادر ہے۔ مقدمہ کر کے اس کے گھر کی ایک ایک اینٹ نہیں بکوا دیا تو میرا بھی نام نہیں۔

ان دونوں کی لڑائی کی خبر پورے گاؤں میں پھیل گئی اور لوگ اپنے اپنے طور پر تبصرہ کرنے لگے۔ کچھ لوگ دونوں کی آپس کی لڑائی کو ختم کرانے کی باتیں کر رہے تھے، تو چند لوگ ایسے بھی تھے جو دونوں کے درمیان کی کشیدگی کو بڑھا کر گاؤں کی پر امن فضا کو مسموم کرنے کی سازش رچنے لگے۔ دونوں کے گھروں پر دیر رات تک لوگوں کے آنے جانے کا سلسلہ جاری رہا اور پروگرام مرتب ہوتے رہے۔

ماہ رمضان المبارک سایہ فگن تھا۔ تیسرے روزہ کی سحری کے لئے صبح تین بجے گھڑی کے الارم سے شیخ رحمت اور ان کے گھر کے تمام لوگ جاگ گئے اور سحری کھا کر فجر کی اذان کی آواز کا انتظار کرنے لگے۔ لیکن وقت نکلتا چلا جا رہا تھا اور مسجد سے اذان کی صدا نہیں گونج رہی تھی، شیخ رحمت کو تعجب ہوا، ''آج کیا ہوا''؟

شیخ رحمت کو تشویش ہونے لگی۔ کافی انتظار کے بعد انہوں نے مسجد جانے کے لئے گھر کا باہری دروازہ کھولا۔۔۔ اور جو منظر دیکھا، اسے دیکھ کر ان کے تو ہوش اڑ گئے۔۔۔

''ارے یہ کیا''۔۔۔ بے اختیار ان کی زبان سے نکلا۔۔۔

گھر کے باہری برامدے کی کئی سیڑھیاں چڑھتا ہوا، نہر کا پانی اندر تک گھس آیا تھا، گاؤں کے لوگوں کو چیخ و پکار کی آوازیں گونجنے لگیں۔۔۔ بچاؤ، بچاؤ کی چیخیں چاروں طرف سے ابھر رہی تھیں۔ انسانی چیخوں کے ساتھ ساتھ گاؤں والوں کے گائے، بیل، بھیس وغیرہ کی تیز چنگھاڑ نے پورے گاؤں کی فضا کو خوفناک بنا دیا تھا۔

یہ سب دیکھ کر شیخ رحمت الٹے قدموں سے گھر کے اندر پریشان حال بھاگے اس وقت تک گھر کے تمام لوگ باہری دروازے تک آ گئے تھے۔ ان تمام لوگوں کو دیکھتے ہی شیخ رحمت چیخ پڑے۔ ''بھاگو'' جلدی سامان بچاؤ، اوپر چھت پر چلو، جلدی کرو، جلدی۔۔۔''

لیکن ابھی لوگوں نے کچھ سامان اُٹھانا شروع ہی کیا تھا کہ باہر کے کھلے دروازے سے پانی کا زبردست ریلا آیا اور پورا گھر جل تھل ہو گیا۔

''ارے پانی تیزی سے گھس رہا ہے۔ سامان چھوڑو، چلو اوپر، چھت پر''

شیخ رحمت تقریباً چلاتے ہوئے خود بھی چھت کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ سیلاب کا پانی بھی تیزی سے چھت کی سیڑھیاں بھی چڑھنے لگا تھا۔ لیکن اس وقت تک گھر کے سارے لوگ چھت پر چڑھ چکے تھے۔ صبح کی سپیدی پھیل چکی تھی۔ چھت پر سے ان لوگوں نے گاؤں کا جو منظر دیکھا۔۔ وہ اس قدر ہولناک تھا کہ ان لوگوں نے کبھی اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔۔۔ چاروں سمت پانی ہی پانی۔۔۔ کئی گھر ڈوب چکے تھے۔ ''نہر کا یہ پانی نہیں ہوسکتا۔ ضرور کوئی پشتہ ٹوٹ گیا ہے''۔ شیخ رحمت کے بڑے بیٹے راشد نے چھوٹے بھائی ارشد سے کہا۔۔۔
''اب کیا کیا جائے''؟ ارشد نے راشد سے سوال کیا۔

راشد، ارشد اور شیخ رحمت چھت پر سے چاروں طرف کا جائزہ لینے لگے۔ ہر طرف سے بچاؤ بچاؤ کی چیخیں ابھر رہی تھی۔ عورتیں، بچے ڈوب رہے تھے۔ ان کی چیخیں گونجتیں اور پھر پانی کے تیز شور میں ڈوب جاتیں۔ پانی کا بھیانک شور بڑھتا جا رہا تھا کہ اچانک پانی کے ایک تیز ریلا نے گھر کی دیواروں کو ہلا دیا۔ ایک پرانا چھجہ تیز آواز کے ساتھ ٹوٹ گیا۔۔۔ ان لوگوں کو اب یہاں بھی خطرہ محسوس ہوا۔ کسی بھی لمحہ مکان منہدم ہوسکتا ہے۔۔۔ موت بڑی تیزی سے ان کے قریب آ رہی تھی۔۔۔ اچانک راشد کو ایک ترکیب سوجھی۔۔۔ چھت کے پچھلے حصے سے گھر کے باہری ٹیلہ پر اترا جائے اور سڑک کے راستے کہیں جا کر پناہ لی جائے۔۔۔ اتفاق سے چھت پر ایک سیڑھی پڑی ہوئی تھی۔ اسی سیڑھی سے شیخ رحمت خود، ان کی بیوی، بیٹی اور دونوں بیٹے ٹیلہ پر اترے اور سڑک پر آ گئے۔۔۔۔ لیکن سڑک پر بھی کمر سے زیادہ پانی تھا۔ انداز سے یہ لوگ ایک دوسرے کا پوری طاقت سے ہاتھ پکڑے آگے بڑھنے لگے کہ اچانک ایک زوردار آواز گونجی۔۔۔ ان کی نظروں کے سامنے ہی ان کا مکان منہدم ہوکر اس کا ملبہ پانی میں ڈوبنے لگا۔ یہ دیکھ کر ان تمام لوگوں کی چیخیں نکل گئیں۔۔۔ شیخ رحمت نے ان لوگوں کو ہمت بندھائی۔۔۔۔ ''ہمت سے کام لو یہ قہر خداوندی ہے''۔

جیسے جیسے یہ لوگ آگے بڑھ رہے تھے اسی تیزی سے پانی بڑھ رہا تھا۔ پانی اب گردن کو چھونے لگا تھا۔ تیز بہاؤ سے پاؤں اکھڑ رہے تھے کہ اچانک گھر سے چند فرلانگ پر حال ہی

میں تعمیر ہوئی نئی مندر، جو کافی اونچائی پر بنائی گئی تھی، کی سیڑھیوں سے ان کے پاؤں ٹکرائے، مندر کے پائے کو پکڑ کر سہارا لیتے ہوئے مندر کے برامدے تک پہنچ گئے۔ مندر کے اوپر پناہ لئے لوگوں نے ان لوگوں کو جلدی جلدی مندر کے اندر کھینچ لیا۔ شیخ رحمت بھی مندر کے اندر سے بڑھتے ہوئے سہارا دینے والے ہاتھ کو پکڑ کر اوپر آئے اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ بڑھا ہوا ہاتھ اور کسی کا نہیں بلکہ مکند پرساد کے بڑے بیٹے ارون کا تھا۔ شیخ رحمت نے ارون کو فرط جذبات سے مغلوب ہو کر گلے لگا لیا۔

اس نئی مندر کی تعمیر کچھ اس طرح ہوئی تھی کہ مندر نہ صرف کافی اونچائی پر تھی، بلکہ کافی مضبوط بھی تھی۔ اسی لئے سیلاب کے بار بار پوری شدت سے حملہ کو ناکام کئے دے رہی تھی۔

شیخ رحمت کی بیوی اور بیٹی زار و قطار رو رہی تھیں اور بے اختیار ان کی زبان سے نکل رہا تھا۔

''سب کچھ ختم ہو گیا، ہم لوگ گھر سے بے گھر ہو گئے۔ اب کیا ہوگا؟''

شیخ رحمت بھی یہی سوچ رہے تھے۔ اب کیا ہوگا؟ لیکن یہ سوال صرف ان کا نہیں تھا، پورے گاؤں کے لوگوں کا تھا۔ ان کی زندگیاں تو بچ گئیں، لیکن اب یہاں تو آس پاس کئی لاشیں بھی پانی میں ڈوب ابھر رہی تھیں۔ سوالوں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا۔ جن کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔

دو پہر ہوتے ہوتے گاؤں کے ارد گرد ہیلی کاپٹر منڈرانے لگے تھے۔ ان ہیلی کاپٹروں نے سیلاب کا جائزہ لیا اور چند گھنٹوں بعد ایک ہیلی کاپٹر سے مندر کے قریب کھانے پینے کے سامان کے کئی پیکٹ گرائے گئے۔ جنہیں مندر میں پناہ لئے نوجوانوں نے پانی میں کود کر تیرتے ہوئے ان پیکٹوں کو لے آئے۔ اسی دوران ایک کشتی بھی آئی جس سے پریشان حال کچھ عورتوں اور بچوں کو حفاظتی مقامات تک لے جایا گیا۔ رحمت نے اپنی بیوی اور بیٹی سے بھی جانے کو کہا لیکن ان لوگوں کی ضد تھی کہ جب بھی جائینگے ساتھ جائینگے۔

صبح سے دو پہر اور دو پہر سے شام ہو گئی۔ افطار کا وقت ہو گیا۔۔۔ شیخ رحمت نے سوچا

افطار کیسے ہو؟ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک بھیڑ کو چیرتا ہوا مکند پرساد اور انکا بیٹا اروِن سامنے آیا، ان کے ہاتھ میں پنڈت کی تھالی تھی، جس میں کئی طرح کے پھل تھے اور لوٹا میں پانی تھا۔

مکند پرساد شیخ رحمت کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا اور شیخ رحمت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''تم لوگ روزہ سے ہو، سمئے ہو گیا ہے لو روزہ کھول لو''۔

شیخ رحمت نے مکند پرساد کی باتیں سنیں اور ان کی آنکھیں بھر آئیں، وہ جلدی سے کھڑے ہو گئے اور مکند پرساد کو گلے لگاتے ہوئے کہا ''انسانیت ایک ایسا رشتہ ہے جس کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔''

شیخ رحمت اور ان کی بیوی بچوں نے روزہ کھولا اور پھر بھی مندر کے ایک کنارے پر کھڑے ہو گئے مغرب کی نماز کے لئے اور رو رو کر گڑگڑا کر اللہ سے فریاد کرنے لگے۔ ''یا خدا'' اس قہر سے بچا، اس سیلاب نے ہمارا سب کچھ چھین لیا ہے۔ اب جان اور آبرو بچا''۔

اور۔۔۔ ایسا لگا جیسے اللہ نے ان کی دعائیں سن لیں۔ ان لوگوں نے جیسے ہی سلام پھیرا، تو دیکھا، دور سے پھر ایک کشتی اسی طرف چلی آ رہی ہے۔

دھیرے دھیرے کشتی قریب آ گئی۔۔۔ اس میں دو شخص سوار تھے، ایک کے ہاتھ میں پتوار تھی اور دوسرے کے ہاتھ میں ٹارچ۔ دونوں کے چہرے مانوس لگے، اس لئے کہ یہ دونوں دوپہر میں بھی ایک بار آ چکے تھے۔

ٹارچ لئے شخص نے چیخ کر کہا ۔۔۔ ''آجاؤ'' جتنے لوگ اس کشتی میں سوار ہو سکتے ہو، سوار ہو جاؤ''۔

آواز سنتے ہی مندر میں پناہ لئے کئی افراد کشتی کی جانب دوڑے، کہ اچانک مکند پرساد کی گرجدار آواز گونجی ۔۔۔ ''سب سے پہلے رحمت بھائی کا پریوار کشتی پر سوار ہوگا'' یہ کہتے ہوئے اس نے شیخ رحمت کے لوگوں کو کشتی پر سوار ہونے کو کہا وہ سب جب سوار ہو گئے تو پھر اس نے اپنے پریوار کو سوار کیا اور اروِن سے کہا ''تم ساتھ میں جاؤ اور جلدی جلدی یہاں سے

سارے لوگوں کو نکالنے کا انتظام کرو، میں یہاں سبھوں کو دیکھتا ہوں۔۔۔لیکن ارون نے کشتی پر سوار ہونے سے انکار کر دیا اور کہا "نہیں بابو جی' آپ جایئے میں یہاں لوگوں کو سنبھالونگا۔۔ بیٹے کی ضد کے آگے باپ نے سپر ڈال دی اور خود کشتی پر سوار ہو گیا۔

کشتی پر سوار ٹارچ والے شخص نے کشتی پر اتنے سارے لوگوں کے سوار ہونے پر اعتراض کیا اور کہا اتنی چھوٹی کشتی میں اتنے سارے لوگ' بہت مشکل ہوگی۔

ٹارچ والے شخص کے اعتراض پر مکند پرساد اور شیخ رحمت دونوں نے اس سے التجا بھرے لہجے میں کہا۔۔۔"چلو اوپر والا ہماری مدد کرے گا، کچھ نہیں ہوگا"۔

ٹارچ والا شخص بھی حالات کے پیش نظر خاموش ہو گیا اور اپنے ساتھی سے کشتی بڑھانے کا اشارہ کیا۔ کشتی آگے بڑھنے لگی۔۔۔۔ چاروں طرف ہولناک اور گھپ اندھیرا اوپر آسمان سے برستا جھما جھم پانی، اور ہر سمت سے سیلاب کے پانی کا بڑھتا ہوا شور۔۔۔رہ رہ کر بجلی کڑک رہی تھی اور اس بجلی کی لمحے بھر کی روشنی پورے گاؤں کی تباہی و بربادی کی کہانی بیان کر دیتی۔ کشتی جیسے جیسے آگے بڑھ رہی تھی، ویسے ویسے رات بھی بھیگ رہی تھی اور سیلاب کی شدّت میں اضافہ ہو رہا تھا کہ اچانک کشتی تیز ہچکولے لینے لگی۔ سیلاب کی تیز لہر نے کشتی کے توازن کو بگاڑ دیا' کشتی ڈگمگ ڈگمگ کرنے لگی، کشتی پر سوار لوگ بھی ڈگمگانے لگے۔ انجانا خوف، لرزتی آوازیں۔۔۔"اے خدا مدد کر' ہے ایشور کر پا کر۔۔۔۔"

پتوار چلاتے ہوئے شخص کے ہاتھ شل ہونے لگے۔ سیلاب کے بڑھتے تھپیڑوں سے وہ بھی گھبرا گیا۔ ٹارچ والا آدمی بھی پریشان ہو کر چیخنے لگا۔

میں کہہ رہا تھا کہ اتنے زیادہ آدمی کا پار ہونا مشکل ہے۔ اب مرو سب لوگ ایک ساتھ۔ اگر دو تین آدمی ابھی بھی اس کشتی سے اتر جائیں تو بقیہ لوگوں کی جان بچ سکتی ہے۔

"اُتر جائیں؟ یہ کیا کہہ رہے ہو، یہاں پر کیسے اترا جا سکتا ہے؟" مکند پرساد نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

"تو مرو، سب لوگ، ایک ساتھ' یہیں پر سبھوں کی جل سمادھی ہوگی۔ تم لوگوں کے ساتھ

ہم دونوں بھی مرینگے۔

ٹارچ والے شخص کی باتیں سن کر تمام لوگوں کے سرد اور ٹھٹھرتے جسم میں جھری جھری سی آ گی۔ کشتی کا توازن جس تیزی سے بگڑ رہا تھا اس سے اس بات کا اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ اگر کشتی کا وزن کم نہیں ہوا تو کسی بھی لمحہ سیلاب کا تیز ریلا کشتی کو الٹ دے گا اور سب کے سب بیچ منجدھا میں۔۔۔۔۔۔۔!

مکند پرساد اور شیخ رحمت کا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ وہ دونوں ایک ہی نکتے پر سوچ رہے تھے۔ کشتی پر سوار تمام لوگوں کو کیسے بچایا جائے۔ اچانک شیخ رحمت مکند پرساد کے قریب آئے اور ان کے کانوں میں پھسپھسایا۔۔۔۔۔

''مکند بھائی ہم دونوں کو دنیا جتنی دیکھنی تھی دیکھ چکے۔ جتنا جینا تھا، جی چکے ابھی ان بچوں کے سامنے پوری زندگی پڑی ہے۔ کیوں نہ ہم دونوں۔۔۔

مکند پرساد نے شیخ رحمت کا اشارہ سمجھ لیا اور کہا۔۔۔۔۔ہاں ٹھیک کہتے ہو۔۔۔

اور پھر اچانک دونوں کھڑے ہوئے اور اس سے قبل کہ کشتی پر موجود لوگ کچھ سمجھ پاتے، چھپاک چھپاک کی دو تیز آواز کے ساتھ دو خوفناک چیخیں ابھریں جو پل بھر میں دور بہت دور پانی کی تیز لہروں میں ڈوبتی چلی گئیں۔ کشتی پر سوار تمام لوگوں کی ایکبارگی رونے چلانے کی صدائیں ابھریں اور ان صداؤں سے بے نیاز کشتی متوازن ہو کر تیزی سے آگے بڑھنے لگی!!!

دوراہے پر کھڑی زندگی

پرینکا کے دفتر میں داخل ہوتے ہی ایسا لگتا، جیسے ہر سمت بہار ہی بہار آ گئی ہو۔ پوری فضا معطر ہو جاتی، لمبا قد، چھریرا بدن، گلابی رنگت لئے خوبصورت مسکراتا چہرہ، پھول کی پنکھڑیوں جیسے گلابی ہونٹ اور اس پر جادو سی بکھرتی اس کی ہنسی، ایک ایسی دوشیزہ جس کا ہر شاعر اپنے اپنے انداز میں تصور کرتا ہے۔۔۔ وہ سراپا کسی شاعر کی غزل تھی۔۔۔ خوش اخلاق، خوش لباس اور خوش گفتار۔۔۔

دفتر کے لوگوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ وہ ایک بے حد امیر باپ کی بیٹی ہے تو لوگوں کو تعجب ہوا کہ اسے نوکری کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اس کے پاپا کی کمپنی میں کتنی ہی لڑکیاں ملازمت کر رہی ہیں۔ کبھی کسی نے ہنستے ہوئے اس سلسلے میں پوچھا، تو وہ مسکراتے ہوئے صرف اتنا کہتی۔ "Self Identity" میں اپنی پہچان خود بنانا چاہتی ہوں۔ کسی کینٹر آف میں نہیں، اور یہ کہتے ہوئے کمپیوٹر کے کی بورڈ پر اس کی سبک اور مخروطی انگلیاں تھرکنے لگیں۔

اسی دوران نئی بحالی لے کر اس دفتر میں فیضان آ گیا۔ پچیس چھبیس سال کا بے حد خوبصورت وجیہہ چہرہ، اسمارٹ نوجوان، جو لباس کے معاملے میں ہمیشہ محتاط رہتا۔ جینس اور خوبصورت شرٹ میں اس کی وجاہت مزید نکھر جاتی اور وہ کسی فلمی ہیرو کی طرح لگتا۔ پرفیوم بھی وہ ایسا لگاتا۔۔۔ کہ دفتر میں اس کے داخل ہوتے ہی، چاروں سمت خوشبو بکھر جاتی اور لوگ نہ دیکھ کر بھی سمجھ جاتے کہ دفتر میں فیضان صاحب آ گئے ہیں۔

فیضان اور مونیکا دونوں ہی سافٹ ویئر انجینئر ہیں دونوں کی قربت بڑھی ۔۔۔ اور اس قربت نے دونوں کے درمیان ذات، پات اور امیری غریبی کی دیواروں کی پرواہ نہیں کی ۔۔۔ ان دیواروں کو توڑتے ہوئے دونوں ایک دوسرے کے قریب اور بے حد قریب آ گئے ۔۔۔ اور اس سے پہلے کہ لوگوں کی دزدیدہ نگاہیں سوال کرتیں دونوں نے شادی کر لی ۔۔۔

شادی کی حسب توقع مخالفت ہوئی اور خوب ہوئی، فیضان کے والدین نے تو بیٹے کے جذبات اور خوشی کے آگے سپر ڈال دی اور خوشی خوشی پرینکا کو بہو مان لیا۔ لیکن پرینکا کے گھر والوں پر تو جیسے غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہو، ان کی بے انتہا دولت نے امیری غریبی اور ذات پات کی بہت مضبوط دیوار کھڑی کر رکھی تھی اور خاندان کا کوئی فرد اس دیوار کو توڑنے کی کوشش کرے، یہ ان کے خاندانی وقار اور رواج کے خلاف تھا۔

مونیکا کے خاندان والوں نے اُسے بہت سمجھانے کی کوشش کی، فیضان سے قطع تعلق کر لینے کی گذارش کی ۔۔۔ لیکن روشن خیال مونیکا نے فیضان کو اپنی زندگی سے الگ کرنے سے صاف انکار کر دیا، اس لئے کہ فیضان اس کی روح کی گہرائیوں میں بسا تھا، وہ اسکے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ بغاوت کی اس پاداش میں دولت مند مونیکا، دولت سے نہ صرف بے دخل کر دی گئی بلکہ اس کے لئے اس شاندار بنگلہ، جہاں اس کا بچپن گذرا تھا اور جہاں وہ جوان ہوئی تھی، اس کے دروازے اس کے لئے بند کر دے گئے۔ لیکن مونیکا نے اس کی پرواہ بھی نہیں کی، اس لئے کہ اسے فیضان کی محبت کی جو دولت ملی تھی، وہ ان تمام دولت وثروت سے بڑھ کر تھی۔ وہ زندگی جینا چاہتی تھی، اپنی زندگی ۔۔۔ خوشیوں اور مسرتوں سے بھری زندگی ۔۔۔ جسے وہ دولت سے بہر حال نہیں خرید سکتی تھی۔

وہ زندگی کی تمام رعنائیوں کے ساتھ فیضان کے ساتھ رہنے لگی، فیضان کے گھر والوں کی شفقت اور فیضان کی بے پناہ محبت نے عیش و عشرت بھری گزاری زندگی کو اس نے بھلا دیا ۔۔۔ اسے یہ زندگی بڑی اچھی لگنے لگی۔ سچا پیار، سچی محبت، پرخلوص احساسات و

جذبات۔کوئی تصنع نہیں،کوئی دکھاوا نہیں،حرص وطمع نہیں،ہر طرف خلوص اوراپنا پن۔

لیکن مونیکا جب کسی لمحے تنہا ہوتی اس کی آنکھوں کے سامنےاس کے ماں، باپ، بھائی، بہن کے وجود جھلملانے لگتے۔ایسے لمحوں میں اس کی آنکھیں نم ہو جاتیں۔ وہ سوچنے لگتی ماں باپ،تو اپنے بچوں کی خوشی میں خوشی تلاش کرتے ہیں،لیکن اس کے ماں باپ کے دلوں کو دولت نے اتنا پتھر کردیا ہے کہ وہ لوگ اس کی خوشی،اس کے احساسات وجذبات کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔

پر بہار زندگی کو ایک ماہ بھی نہیں ہوئے تھے کہ ایک شب اچانک دروازے پر دستک ہوئی، فیضان نے آگے بڑھ کر صدر دروازہ کھولا،تو دیکھا سامنے پولس کھڑی ہے۔فیضان کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ مونیکا کے کروڑ پتی پاپا نے ان کی محبت پر پہرے بٹھانے کے لئے اپنی دولت اور رسوخ کا مظاہرہ کیا ہے۔

پولس والوں نے کہا۔۔۔'' آپ کو تھانہ چلنا ہے، آپ سے کچھ سوال کرنا ہے۔''

فیضان بے خوف ہوکر ان کے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہوگیا۔اس لئے کہ اس کی نگاہ میں محبت کرنا کوئی گناہ نہیں۔کوئی جرم نہیں۔۔۔۔پھر خوف کس بات کا،مونیکا نے فیضان کو جانے سے روکنا چاہا ساتھ چلنے کی ضد کی،لیکن فیضان نے اسے ساتھ لے جانا مناسب نہیں سمجھا اور تن تنہا وہ پولس والوں کے ساتھ ان کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔۔۔اور اس کے بیٹھتے ہی پولس جیپ،زہریلا دھواں چھوڑتی ہوئی پوری فضا کو آلودکرتی ہوئی بڑی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

کئی گھنٹے گذر جانے کے بعد بھی فیضان نہیں لوٹا،تو مونیکا اور فیضان کے گھر والوں کی تشویش ہونے لگی اور کسی انہونی کے خوف سے کانپتے ہوئے مونیکا پولیس اسٹیشن جانے کے لئے تیار ہوگئی۔مونیکا کے ساتھ فیضان کے بوڑھے باپ اور بھائی وغیرہ بھی ہولئے۔

پولس اسٹیشن پہنچے،تو پولس والوں نے انہیں بتایا کہ ان لوگوں نے تو کچھ پوچھ تاچھ کرنے کے بعد اسے گھر واپس بھیج دیا تھا۔

''کیا اب تک گھر نہیں پہنچا''؟ پولیس انسپکٹر نے الٹا انہیں سے یہ سوال کیا۔

مونیکا اور فیضان کے گھر والوں نے نفی میں گردن ہلائی اور گھر واپسی کے لئے اس امید کے ساتھ مڑ گئے کہ ممکن ہے ان کے غائبانہ میں فیضان گھر پہنچ گیا ہو۔

لیکن گھر میں وہی پر ہول سناٹا اور خوف و ہراس پسرا ہوا تھا۔

اس رات گھر کے ہر فرد کی آنکھیں فیضان کے انتظار میں کھلی رہیں، مونیکا نے اپنے کئی جاننے والوں کو فون کیا، لیکن کہیں سے کوئی خبر نہیں۔

وہ رات بڑی سرد رات تھی، ہر طرف سناٹے کی حکمرانی تھی، اس سناٹے کو کبھی کبھی کتوں کی منحوس آواز توڑتی، پھر خاموشی، سناٹا اور خوف چھا جاتا۔

کسی طرح صبح ہوئی اور گھر کے سارے لوگ فیضان کی تلاش میں نکل پڑے، سبھوں کے ہاتھوں میں موبائل تھے اور مسلسل سبھی موبائل کے رنگ ہو رہے تھے، سوال جواب کا سلسلہ جاری تھا۔۔۔۔اور۔۔۔۔ چند گھنٹوں بعد ہی ایک منحوس اطلاع پا کر سبھی ریلوے لائن کی جانب دوڑے۔۔۔اور وہاں پہنچ کر ان لوگوں نے جو منظر دیکھا۔۔۔۔ وہ بے حد دلخراش اور بھیانک تھا۔

ریلوے لائن کے کنارے خون میں لت پت فیضان کی لاش پڑی تھی۔ اسے دیکھتے ہی مونیکا چیخ پڑی۔۔۔۔لوگوں نے اسے سنبھالا اور گھر لے آئے۔ پولس کو اطلاع کی گئی۔ پولس والوں نے لاش اٹھا کر پوسٹ مارٹم کے لئے بھیج دیا، اور رپورٹ آنے سے قبل ہی پولیس والوں نے یہ اعلان کر دیا کہ فیضان نے خودکشی کی ہے۔

شام ہوتے ہوتے یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے شہر میں پھیل گئی، فیضان کی خودکشی پر گھر کے لوگوں کو یقین ہو رہا تھا اور نہ ہی ان کے دوست احباب کو۔

دوسرے دن تمام اخبارات اور نیوز چینل چیخ پڑے۔ یہ سب بھی فیضان کی موت کو خودکشی نہیں بلکہ قتل قرار دے رہے تھے۔ اور شک کی سوئی دولت کے نشے میں چور

مونیکا کے باپ کی جانب جا رہی تھی۔ جس نے پولس کی مدد سے یہ قتل کرایا۔

ظلم بربریت، دولت کا نشہ اور محبت کی دشمنی کے خلاف لوگوں کی آوازیں اٹھنے لگیں۔ جلسے جلوس اور مظاہروں کا ایسا طوفان اٹھا کہ حکومت کی دیواریں ہلنے لگیں۔ ذات پات کی سرحدیں ٹوٹنے لگیں۔ امیروں کی امارتیں ڈھنے لگیں۔ ایوانوں پر لوگوں کے غم و غصے کے پتھر برسنے لگے۔۔۔ اس علاقہ کی تاریخ میں غالباً ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ دو محبت کرنے والوں کے بچھڑنے پر اس قدر غم و غصہ اور احتجاج کا اظہار ہو رہا تھا۔ جس سے حکومت کی چولیں ڈگمگانے لگیں۔ تب حکمرانوں نے سپر ڈال دی۔ اور دولت کے مینارے پر بیٹھے مونیکا کے باپ کے خلاف فرد جرم عائد کر دیا گیا۔ قتل کا جرم ثابت ہوتے ہی موت کی سزا۔۔۔ لوگوں کو اسی کا انتظار ہونے لگا۔

ادھر مونیکا۔۔۔ جو غموں سے نڈھال ہو کر کسی پتھر کے مجسمہ میں تبدیل ہو گئی ہے۔۔۔

ایک طرف اسکے شوہر فیضان کی موت ہو چکی اور دوسری جانب فیضان کے قتل کے جرم میں موت کی سمت اسکے پاپا کے بڑھتے قدم۔۔۔۔ عجیب کشمکش، اور تذبذب میں مبتلا ہے مونیکا۔

وہ ایک ایسے دوراہے پر کھڑی ہے۔۔۔۔ جس کے راستے مسدود نظر آرہے ہیں وہ کرے تو کیا کرے، اپنی محبت کے امتحان میں وہ کامیاب ہو کر لاکھوں لوگوں کے احساسات وجذبات کو سربلند کرے یا اپنے باپ کی زندگی کے لئے سرنگوں ہو جائے۔

لاکھوں لوگوں کی نگاہوں کی، وہ اس وقت مرکز بنی ہوئی ہے اور لوگوں کو انتظار ہے اس کی زبان کے کھلنے کا، اس کی گواہی کے چند جملے سے محبت امر ہو سکتی ہے یا پھر اس کے باپ کو پھانسی۔۔۔۔۔ دونوں ہی حال میں نقصان تو اس کا ہی ہوگا!!!

وراثت

خان مرزا بہادر کی پرانی حویلی پرانی یادوں کی آماجگاہ اب بھی بنی ہوئی ہے۔ اس حویلی کے کئی حصے اب کرایہ داروں کی وجہ کر آباد ہیں اور خان مرزا بہادر کی اکلوتی اولاد خان صفدر بیگ بس دو کمروں میں سمٹ کر رہ گئے ہیں۔ میرا اکثر ان کے یہاں آنا جانا رہتا ہے اور وہ ہمیشہ بڑے خلوص اور محبت سے ملتے ہیں ویسے عام طور پر آس پاس کے لوگوں کے درمیان وہ ''بوڑھا کھڑوس'' کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ لیکن مجھ سے انسیت کی وجہ شائد یہ ہے کہ میں ان سے خاص طور پر وقت نکال کر ملتا رہتا ہوں اور موجودہ سماجی اور سیاسی صورت حال کی زبوں حالی پر بھر پور تبصرے کرتا۔ تاریخ میرا محبوب موضوع ہے اس لئے میں اکثر پرانے تاریخی حقائق سے عصری حالات کا تجزیہ کرتا، جس سے وہ بہت خوش ہوتے، اکثر میری باتیں سن کر وہ ٹھنڈی آہ بھرتے اور کہتے، وہ بھی کیا دن تھے۔ ایسے دن تو اب لوٹ کر آنے والے نہیں ہیں لیکن ان پرانے دنوں کی یادوں کے سمندر میں اترا تو جاسکتا ہی ہے۔

ایسے ہی ایک دن جب وہ اپنی پرانی یادوں کے چراغ روشن کئے بیٹھے تھے، ان کی آنکھوں میں زبردست چمک تھی — اور اسی چمک سے فائدہ اٹھانے کے لئے آج میں نے اس سے وہ سوال کر دیا جسے اکثر وہ ٹال جاتے تھے — دراصل ان کے ایک بند کمرے میں طرح طرح کی پرانی چیزیں تھیں مثلاً گراموفون، گھڑیاں، کراکری وغیرہ کے ساتھ ساتھ شیر اور ہرن کی کھالوں سے آراستہ دیواریں اور فرش۔ ان پرانے سامانوں کے درمیان بہت ساری پرانی تصاویر کے فریم اور ان تصاویر کے فریموں میں ایک تصویر ایسی تھی جو نہ جانے کیوں ہمیشہ میری توجہ کھینچ لیتی، ایسا لگتا کہ اس تصویر کے پیچھے کوئی بہت اہم لیکن نازک کہانی پوشیدہ ہے۔ اس لئے کہ خان صفدر بیگ کمرے میں آویزاں تمام تصویروں کی تفصیل بتاتے لیکن اس تصویر کو وہ جان بوجھ کر نظر انداز کر جاتے اور یہی وجہ تھی میرے تجسس کی کہ آخر اس تصویر کی تفصیل بیان کرنے سے خان صفدر بیگ کیوں گریز کرتے ہیں۔

آج جب وہ پورے موڈ میں تھے اور پرانی یادوں کے چراغ کی روشنی سے ان کا چہرہ تمتما رہا تھا، میں پوچھ بیٹھا— ''اور اس تصویر کے بارے میں آپ نے نہیں بتایا، جس میں آپکے والد خان مرزا بہادر کو ایک انگریز عورت بڑے والہانہ انداز میں دیکھ رہی ہے—''

میرے اس سوال پر خان صفدر بیگ چونک پڑے—اور بولے— ''اچھا وہ تصویر—؟ اس کے بارے میں تو آپ پہلے بھی کئی بار پوچھ چکے ہیں ٹھیک ہے تو آج سن ہی لیجئے''—

میں ہمہ تن گوش ہو کر بیٹھ گیا، میرا پورا دھیان ان کی طرف تھا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہے، غالبًا واقعات کا سرا پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے یا پھر اس تصویر کے پیچھے کی چھپی کہانی کے سمندر میں خود ڈوب ابھر رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ان کی خاموشی ٹوٹی—اور وہ گویا ہوئے—

''ہماری یہ حویلی دیکھ کر تو آپ کو اندازہ ہو گا ہی کہ ہم لوگوں کا ماضی کیسا رہا ہوگا، ہمارے دادا جان میر شفاعت حسین علی کی اس پورے علاقہ میں حکومت تھی—اکثر انگریز افسران کی یہاں دعوت کا اہتمام ہوتا اور یہ اہتمام ایسا ہوتا کہ انگریز افسران کے درمیان بھی اس کی خصوصیت سے تعریف ہوتی۔ میرے والد اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے، بڑے ناز و نعم سے ان کی پرورش ہوئی، ابتدائی تعلیم کے بعد ان کے والد صاحب کے بے حد قریبی انگریز دوست رچرڈ کے مشورے پر انہیں آگے کی تعلیم کے لئے انگلینڈ بھیج دیا گیا اور وہاں جا کر وہ وہاں کے ماحول میں پوری طرح گھل مل گئے۔ دوران تعلیم ہی وہ اپنے ساتھ بیرسٹری پڑھنے والی حسینہ ماریا کے زلفوں کے اسیر ہو گئے وہ ایک بے حد خوبصورت، نیلی آنکھوں والی شوخ چنچل لڑکی تھی۔ دھیرے دھیرے وہ دونوں قریب اور بے حد قریب آ گئے، میرے والد کی وجاہت بھی اس زمانہ میں کس قدر پر کشش تھی، یہ آپ نے تصویر میں دیکھا ہی ہوگا— گورے چٹے، لانبا قد، گھنگرائیلا بال، دراز سینہ اور چھریرا بدن، خوش لباس اور خوش گفتار— دیکھنے میں وہ بھی کسی انگریز سے کم نہیں لگتے تھے—بیرسٹری کی ڈگری ملتے ہی دونوں شادی کے لئے بضد ہو گئے۔ ماریا کے فادر گزر چکے تھے اس کی ماں نے ماریا کو بہت سمجھانے کی

کوشش کی لیکن ماریا بضد تھی اور آخر کار ماریا کی ضد کے سامنے، اس کی ماں نے سپر ڈال دی اور ان دونوں نے وہاں کی رسم و رواج کے مطابق شادی کر لی۔ شادی کے بعد دونوں اپنے مستقبل کے خواب بننے لگے۔ رنگ برنگے خواب، ہر خواب قوس قزح کی مانند جلوے بکھیر نے لگا۔ دونوں نے وہیں بیرسٹری بھی شروع کر دی۔

یہ خبر جب میرے دادا جان کو ملی تو ان کے پیروں تلے کی زمین ہی نکل گئی — اس لئے کہ انہوں نے اپنے اس اکلوتے بیٹے کے لئے الگ بہت سارے خوشنما خواب دیکھ رکھے تھے اور انہیں امید تھی کہ خان مرزا بہادر تعلیم مکمل کرتے ہی یہاں آجائینگے اور ان کی شادی رئیس چھتر پور، خان الطاف مرزا کی بیٹی، جو حسن کی ملکہ تھی، کے ساتھ اس طرح کرینگے کہ لوگ برسوں نہیں صدیوں یاد کریں گے — لیکن بیٹے کی کسی انگریز لڑکی سے شادی کی خبر کی آگ نے ان کے سارے خوابوں کو جھلسا دیا۔ انہوں نے اپنے آپ کو بڑی مشکلوں سے سنبھالا، لیکن ان کی اہلیہ کو گہرا صدمہ لگا اور انہوں نے بستر پکڑ لیا۔ صدمہ اتنا گہرا تھا کہ تمام طبیب و حکیم ان کے علاج میں ناکام ثابت ہوئے، حالت دن بہ دن بگڑتی جارہی تھی — ان کی اس حالت کی اطلاع پے در پے کئی ٹیلی گرام کے ذریعہ ان کے چہیتے بیٹے کو دی گئی —

خان بہادر مرزا کو ٹیلی گرام ملا، تو وہ بھی پریشان ہو گئے۔ انہیں بھی اپنی ماں سے بہت پیار تھا۔ ماں کے ساتھ بتائے ایک ایک لمحے انہیں یاد آنے لگے — ماں کی شفقت، پیار، ان کا غصہ، ان کی لوریاں — ان یادوں نے ایسا سماں باندھا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے — ماریا اور اس کی ماں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی اور کہا تم اپنے وطن جاؤ اور اپنی ماں کو دیکھ آؤ —

اس طرح وہ طویل عرصہ کے بعد انڈیا آئے، ان کی آمد پر ان کی ماں زار و قطار کر روئیں ان کے والد کے بھی صبر و ضبط کا باندھ ٹوٹ پڑا اور وہ بھی خوب روئے — اس وقت ایک عجیب سماں تھا — روتے روتے ماں نے ان سے ایک ایسا وعدہ لے لیا' جس کے لئے وہ ہرگز تیار نہیں تھے۔ آنسوؤں کے سمندر میں ڈوبی ماں نے کہا — بیٹے صاحب! اب آپ مجھ

کو چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے، اگر گئے تو پھر میرا مرا منہ دیکھیں گے اور جذبات سے مغلوب ہو کر خان مرزا بہادر نے اس وقت حامی بھر دی، بعد میں انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا لیکن اس وقت تک تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

چند ماہ اسی طرح گزر گئے، اس درمیان خان مرزا نے ماریا کو کئی خطوط لکھے اور ان خطوط کے جواب بھی آئے لیکن خان مرزا کے والد کی ان خطوط پر سخت نگاہ تھی اور انہوں نے اس خط و کتابت پر کڑے پہرے بٹھا رکھے تھے، نتیجہ میں ماریا کا کوئی خط خان مرزا تک نہیں پہنچ سکا، خان مرزا ذہنی طور پر بے حد پریشان رہے اس لئے بھی کہ ان کے آتے وقت ماریا حاملہ تھی۔ خط کا جواب نہیں ملنے پر انہوں نے کئی ٹیلی گرام دیا اور ان ٹیلی گرام کے جواب کا بھی حشر وہی ہوا، جو آئے ہوئے خطوط کا ہو رہا تھا۔

اس دوران خان مرزا کے والد یعنی ہمارے دادا جان نے انہیں وراثت سنبھالنے کے لئے مجبور کر دیا اور وراثت کی بیڑیوں نے انہیں بے دست و پا کر دیا اس کے بعد ماں کی ضد شروع ہو گئی کہ بس میں اپنے بیٹے کے سر پر سہرا دیکھنے کے لئے زندہ ہوں۔ کیا میرا بیٹا، میری یہ آخری خواہش بھی نہیں پوری کرے گا.؟ ایموشنل بلیک میل کا یہ سلسلہ اس طرح چلا کہ آخر ایک دن میرے والد نے ان کے آگے سپر ڈال دی اور پھر ان کی شادی ہوئی، ایسی شادی کہ لوگ آج بھی اسے یاد کرتے ہیں۔ میری والدہ بھی حسن و جمال میں ماریا سے کم نہیں تھیں، ماریا مغربی تہذیب کی پروردہ تھی تو میری والدہ مشرقی تمدن کی مجسمہ تھیں—اس کے باوجود میرے والد ماریا کو بھولے نہیں اور اس بات کا علم بہت جلد میری والدہ کو ہو گیا۔ والد کی ماریا کے لئے تڑپ، بے چینی، بے قراری چھپائے نہیں چھپتی—میری والدہ ذہنی طور پر اس کے لئے تیار نہیں تھیں۔ اس کا انہیں گہرا صدمہ ہوا اور وہ بیمار رہنے لگیں—اسی دوران میری پیدائش ہوئی—لیکن میری پیدائش سے قدرت کو خوشی نہیں ہوئی—میری پیدائش کے ساتھ ہی میری والدہ گزر گئیں۔ نئی بہو کے جانے کا صدمہ اتنا گہرا تھا کہ میری دادی نے رخت سفر باندھ لیا اور ان دونوں کے بعد میرے دادا جان بھی سفر آخرت پر روانہ ہو گئے—

اب حویلی میں نوکر، نوکرانیوں کی بھیڑ میں میں تھا اور میرے والد خان مرزا بہادر — میری پرورش کی ذمہ داری ایک گوسنر کے سپرد کردی گئی اور میرے والد حکومت کی ذمہ داریوں میں اس قدر گھر چکے تھے کہ شائد انہیں غم منانے کی بھی فرصت نہیں تھی — دولت کے برستے مینھ میں وہ غم و خوشی کو فراموش کر چکے تھے۔ یا پھر اس میں گم ہو گئے تھے — اپنے علاقہ کے لئے وہ پوسٹ آفس خرید چکے تھے، اب وہ ایک ہوائی جہاز خریدنا چاہتے تھے اور اسی بزنس ٹور نے انہیں ایک بار پھر لندن پہنچا دیا — لندن کے راستے میں ماریا کی پرانی یادیں جھما جھم برسنے لگیں وہ احساسات و جذبات سے پوری طرح شرابور تھے —

راستے بھر ان کا دل دھڑکتا رہا، ماریا سے ملاقات ہوگی۔ تو کیا ہوگا — وہ مجھ سے لپٹ جائیگی، پہلے خفا ہوگی اور پھر مان جائیگی — میری مجبوریوں کو وہ ضرور سمجھے گی — میں اسے اپنے نئے جہاز سے انڈیا لے آؤنگا۔ اس کے پہنچتے ہی میری حویلی میں ایک بار پھر بہار آجائیگی۔

خوشیوں کے اس تلاطم میں وہ راستے بھر ڈوبتے ابھرتے رہے اور لندن پہنچتے ہی ریپن اسٹریٹ کے اس مکان میں پہنچے۔ لیکن انہیں مایوسی ہوئی — لوگوں سے وہ ماریا کا پتہ پوچھتے رہے اور دوسرے اور تیسرے مکان میں ماریا کو ڈھونڈتے رہے، لیکن ماریا کہیں نہیں ملی —

تھک ہار کر وہ ایک پارک میں بیٹھ گئے — طرح طرح کے احساسات و جذبات کی آندھیاں ان کے ذہن میں چل رہی تھیں — وہ کیسے ماریا کو تلاش کریں — پارک کے اندر ان کی نظروں کے سامنے رنگ برنگ کپڑے پہنے، چھوٹے بڑے خوبصورت خوبصورت بچے کھیل رہے تھے اور شور بھی مچا رہے تھے — ان بچوں میں ایک بے حد شوخ اور چنچل قسم کی لڑکی پر ان کی نظر نہ جانے کیوں ٹھہر گئی — وہ اسے غور سے دیکھنے لگے، دیکھتے دیکھتے اچانک ایک جھما کہ ہوا — ارے یہ تو بالکل ماریا کی طرح ہے — وہ بے اختیار اٹھے — اس بچی کے پاس گئے — اس کا نام پوچھا — پھر اس کے فادر کا نام جاننا چاہا — جس پر وہ لڑکی خاموش رہی، لیکن جب ماں کا نام پوچھا — تو اس نے جھٹ سے بتایا ''ماریا'' — ماریا کا

نام سنتے ہی خان مرزا کا دل ڈھڑ کنے لگا۔۔۔ اور اسی دھڑ کتے دل کے ساتھ انہوں نے اس لڑکی سے اپنے گھر لے جانے کی گزارش کی۔۔۔ لڑکی بڑی مشکلوں سے رضا مند ہوئی۔۔۔ لڑکی نے گھر کے قریب پہنچ کر ایک گھر کی جانب اشارہ کیا اور پھر وہ دوڑتی ہوئی واپس کھیلنے کے لئے پارک چلی گئی۔۔۔ خان مرزا نے دھڑ کتے دل کے ساتھ کال بیل کا بٹن دبایا۔۔۔ چند ساعت کے گزرنے کے بعد دروازہ کھلا۔۔۔ سامنے ایک بوڑھی عورت کھڑی تھی۔۔۔ خان مرزا کو پہچاننے میں دیر نہیں لگی۔۔۔ وہ ماریا کی ماں تھی۔۔۔ اس عورت نے سامنے کھڑے ایک اجنبی مرد کو دیکھا تو بڑے ترش لہجہ میں بولی۔۔۔ ہو آر یو۔۔۔؟

نواب مرزا اس سوال پر ہکلاتے ہوئے بولے۔۔۔ آئی ایم خان مرزا بہادر فرام انڈیا۔۔۔

جواب سن کر اس بوڑھی عورت کی آنکھوں میں تحیّر جاگا اور پھر اچانک وہ بپھر گئی۔۔۔ یو۔۔۔ بلا ڈی۔۔۔ گیٹ آؤٹ۔ ماریا از نو مور۔۔۔ شی از ان ہیون، اینڈ یو۔۔۔ گو ٹو ہل۔۔۔ اور یہ کہتی ہوئی اس نے دھڑاک سے دروازہ بند کر دیا۔

ایک زور کا جھٹکا انہیں لگا۔۔۔ دل کی دھڑکن تیز اور بہت تیز ہوئی اور پھر اچانک اس نے دھڑ کنا بند کر دیا۔۔۔

خان مرزا بہادر کے ساتھ گئے ان کے سکریٹری نے انہیں فوراً اسپتال پہنچایا، لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس لئے کہ وہ ماریا کی موت کی خبر سنتے ہی اسی وقت اس سے ملنے روانہ ہو چکے تھے۔

جس دن سکریٹری ان کا جسد خاکی لے کر یہاں آیا اس دن اس پوری حویلی میں لوگوں کا اژدھام تھا۔۔۔

اور اس دن کے بعد سے یہ حویلی سونی ہو گئی۔۔۔ کوئی رونق نہیں کوئی زندگی نہیں کوئی.......
یہ کہتے ہوئے، خان صفدر بیگ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

سرحد

پھول کماری — صرف نام کی نہیں بلکہ اس کا رنگ روپ اس کے تیکھے نقش و نگار، اس کی اٹھکھیلیاں اور اس چہرے کی شادابی — سب کچھ کسی بے حد خوبصورت تر و تازہ پھول ہی کی طرح تھا اور اس پھول پر جب گاؤں کا سب سے خوبرو جوان شمبھو کسی بھنورے کی طرح منڈرانے لگا، تو پھول کماری کو نہ جانے کیوں یہ اچھا لگا — عشق کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا — دونوں ایک دوسرے سے کبھی آموں کے باغ میں تو کبھی نہر کے کنارے ملنے لگے — گاؤں والوں سے ان دونوں کی محبت چھپی نہیں رہی اور جلد ہی بات دونوں کے ماتا، پتا تک پہنچی — اور ان دونوں کی محبت کی آگ کی لپٹوں کے آگے، ان کے والدین نے بھی سپر ڈال دی اور بڑی دھوم دھام سے دونوں کی شادی کی تیاری شروع ہوئی — شادی کے روز دونوں نے اگنی کو ساکچھی مان کر سات پھیرے لیتے ہوئے جنم جنم ساتھ نبھانے کی قسمیں کھائیں اور ایک دوسرے کے گلے میں جئے مالا ڈال کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دونوں ایک دوسرے کے ہو گئے۔

دونوں کو ایسا لگا جیسے دونوں صدیوں سے ایک دوسرے کے انتظار میں تھے، دونوں ایک دوسرے کے لئے ہی بنائے گئے ہیں — ان دونوں کے گرد ہر پل، ہر لمحہ خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔

شہر کی تمام تر کثافتوں اور تصنع بھری زندگی سے دور ان کا گاؤں سرحد کے قریب تھا — ہر سمت ہریالی اور خوشحالی پھیلی ہوئی تھی۔ جس کے اثرات گاؤں والوں پر نمایاں تھے — آپسی محبت، اخوت اور یکجہتی کا نمونہ تھا یہ گاؤں — بس کبھی کبھار سیاست کی گرم ہوا چلتی تو سرحد پر کشیدگی نمایاں ہوتی اور لوگوں کا سرحد کے اس پار یا اُس پار جانے کی ممانعت ہوتی، لیکن حالات معمول پر آتے ہی پھر اسی طرح آنے جانے کا سلسلہ شروع ہو جاتا — ایسے حالات سے گاؤں والے تقریباً عادی تھے، کبھی کبھار بندوق کی گولیاں، رات کے سناٹے کو چیرتیں،

لیکن گاؤں والے ان گولیوں کی آواز کی پرواہ کئے بغیر سکھ اور چین کی نیند سوتے۔

پھول کماری اور شمبھو کی چاہت دن بہ دن بڑھتی گئی—شادی ہوئے دو سال ہو گئے، لیکن ان دونوں کے ایک دوسرے سے پیار کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا کہ بس ابھی ابھی دونوں کی شادی ہوئی ہے—شمبھو کو کبھی کھیت سے لوٹنے میں تاخیر ہوتی—تو پھول کماری پریشان ہو جاتی اور گھر کے دروازے پر کھڑی ہو کر اس کا انتظار کرنے لگتی اور کچھ دیر بعد شمبھو گھر میں داخل ہوتا تو پھول کماری مصنوعی غصہ دکھاتی اور کہتی ''تم نے دیر کیوں کر دی، میری تو جان ہی نکل جاتی ہے'' جواب میں شمبھو اسے اپنے سینے سے لگا لیتا اور کہتا۔

''ٹھیک ہے اب دیر سے نہیں آؤنگا لیکن تم اتنی پریشان نہ ہوا کرو—''

شمبھو کی یہ بات سن کر پھول کماری خوش ہو جاتی اور جلدی جلدی اس کے آگے کھانا پروسنے لگتی—ان دونوں کے اس جذباتی رشتہ کو دیکھ کر گھر کے سارے لوگ بہت خوش ہوتے اور شمبھو کا چھوٹا بھائی راجیشور مزاقاً اپنے بھائی کو کہتا—

''بھیا میرے لئے بھی ایسی ہی جان دینے والی پتنی ڈھونڈنا—'' جواب میں بھائی ہنستا ہوا کہتا ''ضرور ضرور''—اور پھول کماری شرما جاتی—

ایک دن پھر شمبھو کو آنے میں دیر ہو گئی—پھول کماری عادت کے مطابق گھر کے باہری دہلیز پر کھڑی ہو کر اس کا انتظار کرنے لگی—اور انتظار کی یہ گھڑیاں طویل ہوتی گئیں—پھول کماری کو غصہ آنے لگا—سچ مچ کا غصہ—آج تو شمبھو سے بات بھی نہیں کرونگی، ہمیشہ کہتا ہے اب دیر نہیں کرونگا لیکن دیر کرنا اور اسے انتظار کرانے میں لگتا ہے مزہ آتا ہے—پھول کماری کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات ڈوب ابھر رہے تھے—غصہ تشویش میں بدلنے لگا—شام سے رات ہو گئی—تب بھی گھر والے بھی پریشان ہو گئے—اتنی دیر تو شمبھو نے کبھی نہیں کی، یہ آج کیا ہو گیا—؟ طرح طرح کے سوالات لوگوں کے ذہن میں کوندنے لگے—شمبھو کے پتا اور شمبھو کا چھوٹا بھائی راجیشور ٹارچ لے کر تلاش کرنے نکل گئے اور رات گئے واپس آئے تو ان کے چہرے سے پریشانی جھلک رہی تھی—ان کی تلاش بے

سود ثابت ہوئی — پھول کماری کا چہرہ بھی وحشت زدہ ہو گیا۔ گھر کے ایک کونے میں بھگوان کی مورتی کے آگے جا کر وہ گڑگڑانے لگی — طرح طرح کے پرارتھنا کرنے لگی، اس کی آواز میں اتنا درد و کرب تھا کہ گھر کے سارے لوگوں کی آنکھیں چھلکنے لگیں — لوگوں نے سمجھانے کی کوشش کی — صبح تک ضرور آ جائیگا شمبھو، تم جا کر سو جاؤ — لیکن وہ پوری رات بھگوان کے سامنے گڑگڑاتی رہی، اپنے شمبھو کے لئے —

لیکن وہ صبح نہیں ہوئی، جس صبح کو شمبھو کو واپس آنا تھا — گاؤں میں بس یہ خبر ملی کہ سرحد پر اچانک کشیدگی بڑھ گئی ہے، جس کی وجہ کر سرحد پر سخت پہرے بٹھا دئے گئے ہیں —

شمبھو کی اچانک گمشدگی سے گاؤں والے بھی پریشان ہو گئے — اس بیچ یہ خبر ملی کہ سرحد پر سختی بڑھنے سے گرفتاریاں بھی بڑھ گئی ہیں — گولیوں کی بوچھاریں بھی ہو رہی ہیں — ممکن ہے اس سختی کا شکار کہیں شمبھو بھی ؟؟؟ لیکن لوگوں کا دل یہ قبول کرنے کو تیار نہ تھا —

انتظار کے یہ دن ہفتے مہینے اور پھر سال میں بدل گئے — اور دھیرے دھیرے لوگ مایوس ہو گئے — لیکن پھول کماری کی آنکھوں میں شمبھو کے انتظار کی جوت جل رہی تھی — اور اس انتظار میں پھول کماری کے چہرہ کی شادابی پر گہن لگ گیا، وہ ایک مورت میں تبدیل ہو گئی — اس کی اداسی' اس کا درد و کرب اس کے پورے چہرے سے عیاں تھا — گھر والوں کی بے حد چہیتی بہو کی اس حالت کو دیکھ دیکھ کر لوگ ایک دوسرے سے طرح طرح کی سرگوشیاں کرنے لگے — پھول کماری کی خوشیوں کے لئے، اس کے درد و کرب اور تڑپ کے مداوا کے لئے کیا کیا جائے؟ یہ ایک ایسا سوال تھا' جس کا جواب آسان نہیں تھا، لیکن پھر بھی لوگ اس سوال کے جواب کو ڈھونڈنے میں لگے تھے — اور ایک دن کسی نے مشورہ دیا کہ کیوں نہ پھول کماری کی خوشیوں کے لئے اس کی شادی اس کے دیور راجیشور سے کر دی جائے۔

تین سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور شمبھو کی واپسی کی ساری امیدوں کے راستے بند نظر آ رہے تھے —

گھر والوں نے جب پھول کماری کے سامنے یہ تجویز رکھی، تو وہ چیخ پڑی — نہیں — ایسا پاپ میں نہیں کرسکتی — میرا اور شمبھو کا جنم جنم کا ساتھ ہے، میں جیون کے انتم چھن تک شمبھو کا انتظار کرونگی — وہ آئیگا اور ضرور آئیگا'' —

لوگوں نے اس کی باتوں کو جذباتیت سے تعبیر کیا اور ایک دن بہت سادگی کے ساتھ پھول کماری کو جس کا پورا وجود غموں سے نڈھال تھا اور وہ ایک بے جان سی مورت میں بدل گئی تھی، راجیشور کے ساتھ سات پھیرے دِلوادئے۔

سات پھیروں کے بعد بھی پھول کماری اسی طرح ایک پتھر کی مورت بنی رہی، اس کے چہرے پر پل بھر کے لئے بھی خوشی کا پرتو نظر نہیں آیا۔ راجیشور کے گھر والوں نے پھول کماری کو سمجھانے کی بہت کوششیں کیں کہ وہ شمبھو کو بھول جائے اور راجیشور کے ساتھ خوشی خوشی دن گزارے۔ لیکن پھول کماری پر ان باتوں کا کچھ اثر نہیں ہوتا — وہ رات کے آخری پہر تک شمبھو کے ساتھ گزارے ہوئے لمحوں میں کھوئی رہتی اور اس کا دل کہتا — میرا شمبھو ایک دن ضرور آئیگا، میری تپسیا بے کار نہیں جائے گی —

اور — ایک دن، پورے چار سال بعد — پھول کماری کی تپسیا نے رنگ دکھایا — سرحد کے اس پار اور اُس پار میں ایک سمجھوتہ کے تحت دونوں طرف کے دس دس بے گناہوں کو جیل سے رہا کیا گیا اور جیل سے رہا کئے جانے والے بے گناہوں میں ایک شمبھو بھی تھا۔

شمبھو کی آمد کی خبر نے پھول کماری کے مرجھائے جسم میں اچانک جان ڈال دی۔ ایسا لگا جیسے کسی نے خاموش پڑے ساز کے تار چھیڑ دئے ہوں — شمبھو گھر میں داخل ہوا، اس کا جسم لاغر ہو رہا تھا، سر کے بال اور بڑھی داڑھی نے اس کی شکل ہی بدل دی تھی۔ لیکن اس کی آنکھوں میں ایک خاص چمک تھی اور باہری دروازے سے گھر کے اندر داخل ہوتے ہی اس کی نظریں پھول کماری کو تلاش کر رہی تھیں —

شمبھو جیسے ہی اندر آیا اور اس کی آواز سنائی دی — پھول کماری کی آنکھوں میں بھی ایک چمک عود آئی، اس کے جسم میں نئی توانائی آ گئی اور وہ ایک آنگن سے دوسرے آنگن دوڑتی،

پھلانگتی ہوئی دروزے تک آئی — جذبات سے مغلوب اس کے قدم بڑی تیزی سے شمبھو کی طرف بڑھ رہے تھے — وہ دوڑ کر اس کے گلے لگ جانا چاہتی تھی — کہ اچانک اس کی نظر شمبھو کے ساتھ ساتھ راجیشور پر پڑی — اور اس کے قدم اچانک رک گئے — اسے ایسا لگا جیسے کسی نے اس کے اگلے قدم کے آگے لچھمن ریکھا کھینچ دی ہو — وہ لڑکھڑا گئی — اس کے پاؤں میں پڑی زنجیر نے اس کے قدم روک دیے — اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب تھا اور وہ بڑی بے چارگی سے اپنے سامنے کھڑے کبھی شمبھو کو اور کبھی راجیشور کو دیکھ رہی تھی!!!۔

❁

دنیا ننگی ہے

میں نے ہمیشہ بڑے خواب دیکھے اور ان خوابوں میں رنگ بھرنے کی کوشش بھی کی' لیکن جب ان خوابوں کے سچ ہونے کا وقت آیا تو ایک ایک خواب حقیقت کی چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر چکنا چور ہونے لگے۔

اعلیٰ تعلیم کی حصولیابی کے بعد ایک خوبصورت اور خوب سیرت بیوی' پیارے پیارے بچے ، بڑے افسر کی شان' گاڑی، بنگلہ، نوکر چاکر، دولت، شہرت......

بچپن جس آن بان شان سے گزر رہا تھا' ایسے میں یہ خواب دیکھنا غلط بھی نہیں تھا۔ ابا کی وکالت کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی، صبح سویرے سے ہی، باہری بیٹھک میں لوگوں کے آنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا' کئی کئی جونیئر وکیل، منشی لوگوں کے مقدمہ کی پیروی کے کاغذات تیار کرنے میں مصروف ہوتے، ابا اندرون خانہ سے ناشتہ کر کے بیٹھک میں آجاتے، ان کا حقہ تیار رہتا' وہ حقہ سے کش لگاتے رہتے اور مقدمہ کے باریک نکتوں کو وہ کبھی اپنے جونیئر وکلاء کو اور کبھی اپنے مؤکلوں کو سمجھاتے رہتے۔

گھر کے اندر اماں' صحن کی بڑی چوکی جس پر خوبصورت قالین بچھی ہوتی' پر بیٹھ کر دائی' نوکروں کو طرح طرح کے احکامات صادر کرتی رہتیں' اسی درمیان کبھی کوئی بساطن' کبھی کوئی مُشتیہ اور کبھی کوئی سوال لگانے والی آتی تو اس سے محو گفتگو ہوتیں، درمیان گفتگو وہ جانکاری بھی لیتی رہتیں کہ گایوں کو سانی لگائی گئی یا نہیں' کبوتروں کو دانا ڈالا گیا یا نہیں، مرغیوں کا ڈربہ کھولا گیا یا نہیں وغیرہ وغیرہ اور میں اپنے کمرے کے اندر مطالعہ میں غرق رہتا اور دس بجتے

بجتے اسکول کے لئے روانہ ہو جاتا۔ اسکول جاتے اور آتے وقت میں ڈرائیور رام پرساد چاچا سے طرح طرح کے سوالات پوچھتا' یہ کیا ہے؟ یہ کیوں ہے؟ اور رام پرساد چاچا بڑی محبتوں سے میرے ہر سوال کا جواب دیتے جاتے۔

اچانک ایک دن زور کی آندھی آئی اور سب کچھ اڑا لے گئی' ابا کو ایک شب ہارٹ اٹیک ہوا' ڈاکٹروں کی لاکھ کوششوں کے باوجود وہ سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔

ابا کے گزرتے ہی حویلی کی ساری خوشیاں ختم ہوتی چلی گئیں۔ ضروریات زندگی اور حویلی کی قدروں کو پامال ہونے سے بچانے کی کوشش میں بڑی خاموشی سے دھیرے دھیرے حویلی کے سامان فروخت ہونا شروع ہوئے' رشتہ داروں نے کمزور دیکھ کر حویلی پر بھی اپنے دعوے شروع کر دئے اور ایک دن حویلی بھی بک گئی۔ اس دن اماں بہت روئیں' زار و قطار' ابا کے گزر جانے سے کم غم نہیں ہوا' اس حویلی سے ان کا باہر نکلنا۔

ان حالات میں بڑی مشکلوں سے میں نے بی اے کیا اور مجبوریوں نے اعلیٰ افسر کی کرسی کی بجائے، مجھے ایک کلرک کی کرسی پر بیٹھا دیا۔ خاندانی وقار نے کبھی بے ایمان نہیں بنایا اور کبھی رشوت کے لئے کسی کے سامنے ہاتھ نہیں بڑھائے۔ بے حد مختصر سی تنخواہ میں اپنی تمام تر خواہشوں کو کچل کر ماں، بیوی اور تین بچوں کی ضرورتوں کو پورا کرتا۔ لیکن ہر دن کچھ نہ کچھ کسی کا مطالبہ ضرور رہتا۔ اماں کو مسلسل ڈاکٹر کو دکھانا، ان کی دوائیں ، بیوی کی دی ہوئی چاول، آٹا، چینی، سبزی کی فہرست، بچوں کے اسکول کی فیس، ان کی کتابیں، ان کے یونیفارم ایک ضرورت پوری کرتا تو دوسرا مطالبہ سامنے کھڑا نظر آتا۔

ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔ یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔ زندگی کے اس بھاری بوجھ کو تن تنہا ڈھوتے ڈھوتے میں پریشان ہو گیا۔ میری پریشانی، بے اطمینانی اور بے بسی کو دیکھ دیکھ کر میری بیوی بھی بے چین رہتی اور جب ہر دروازہ بند نظر آتا ہے تو اللہ کا دروازہ یاد آتا ہے۔ لیکن اللہ بھی ہم لوگوں سے امتحان پر امتحان لے رہا تھا۔ امتحان کی اس گھڑی میں ایک دن نہ جانے کیوں چُپ شاہ کی بڑی یاد آئی۔

میرے شہر اورنگ آباد کے چپ شاہ کی یادوں نے گھیر لیا۔ وہ ہر ضرورت سے بے نیاز تھے۔

حق اللہ.......... حق اللہ.....بیڑی.......... بیڑی.......... بیڑی۔

یہی وہ الفاظ تھے، جو اکثر ان کے منہ سے نکلتے اور ان الفاظ کے نکلتے ہی انھیں کوئی چائے پیش کرتا، کوئی بسکٹ لئے کھڑا ہو جاتا اور کوئی ایک بیڑی سلگا کر ان کے آگے بڑے مؤدبانہ انداز میں بڑھاتا، لیکن وہ کبھی کبھار ہی کسی سے بسکٹ یا چائے لیتے۔ بس وہ سلگتی بیڑی جھپٹتے دو چار کش لگاتے اور دور پھینک دیتے۔

چپ شاہ ہمیشہ بالکل ننگ دھڑنگ رہتے۔ ان کے چاہنے والے انھیں اکثر کرتا، لنگی پہناتے لیکن چند گھنٹوں بعد ہی یا دوسرے ہی دن وہ ان کپڑوں سے خود کو آزاد کر لیتے۔ دراصل ان کی نگاہ میں پوری دنیا ننگی تھی۔ پھر وہ کیوں لباس پہنیں۔ سر کے بال اور داڑھی بے تحاشہ بڑھی اور الجھی ہوئی، بے ترتیب اور گرد آلود ہوتی۔ اورنگ آباد کے جے بی روڈ کی بڑی مسجد کے ارد گرد پھلوں اور دیگر سامانوں کی دکانیں تھیں، پاس میں کئی ہوٹل بھی تھے۔ اسی اطراف میں وہ نظر آتے۔ ان کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ رات گئے کبھی کسی کے برآمدے میں تو کبھی کسی کے چبوترہ پر سو جاتے۔ برآمدے اور چبوترہ کے مالکوں کو کبھی کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ خوش ہوتے اور انھیں کھانا پیش کرتے۔ کبھی ایک دو لقمہ کھا لیتے اور کبھی وہ کھانے کی طرف دیکھتے بھی نہیں۔ سردیوں کے زمانے میں لوگ اپنے گھروں سے نکل کر انکے جسم پر کمبل ڈالتے۔ لیکن لوگ صبح میں دیکھتے کہ کمبل کہیں پڑی ہے اور وہ کہیں اور ہیں۔

چپ شاہ بذات خود ہر ضرورت سے بے نیاز تھے، لیکن ان کے گرد اکثر حاجت مندوں کو دیکھا گیا۔

شاہ بابا، میں غربت سے پریشان ہوں، بابا مجھے کوئی نوکری نہیں مل رہی ہے..... بابا مجھے تجارت میں فائدہ نہیں ہو رہا ہے۔ بابا میری بیٹی کی عمر نکلی جا رہی ہے، ابھی تک اس کی شادی نہیں ہوئی ہے..... بابا، میرا بچہ بہت بیمار ہے..... بابا.......... بابا.......... بابا..........۔

حاجت مندوں میں ہر طرح کے لوگ ہوتے، امیر بھی غریب بھی۔ حاجت مندوں کی فریاد سن کر کبھی ان کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرتا، ان لوگوں کی طرف وہ متوجہ بھی نہیں ہوتے، ہر طرح سے وہ بے نیاز نظر آتے۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ ان میں سے اکثر لوگوں کی حاجت پوری ہوتی۔ رات گئے کئی چمچماتی کار مسجد کے قریب رکتیں، لوگ کار میں سے نکل کر انھیں ڈھونڈتے اور تھوڑی ہی دیر میں، ان کی نگاہیں انھیں ڈھونڈ ہی لیتیں، وہ کسی کے برآمدے یا کسی کے چبوترے پر نظر آجاتے۔ آنے والی بڑی عقیدت سے انھیں سلام کرتے اور کہتے....

''بابا، میری مراد پوری ہوگئی ہے۔ میں یہ کچھ نذرانہ لایا ہوں، قبول کیجئے''۔

اور بابا، انھیں خون آشام نگاہوں سے دیکھتے اور ''جا............ بھاگ'' جیسے دو انکتے ہوئے الفاظ ان کے منہ سے نکلتے اور آنے والے لوگ مٹھائی، کپڑے، پھل اور بیڑی وغیرہ ان کے قریب رکھ کر، بڑے احترام کے ساتھ سلام کرتے ہوئے چلے جاتے۔ چپ شاہ ان سامانوں کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ ہاں، آس پاس کے کئی بھیک مانگنے والے اور غریب بچے ان سامانوں پر حق جمالیتے۔ یہ تقریباً روز کا معمول تھا۔

چپ شاہ کے بارے میں طرح طرح کے قصے مشہور تھے۔ حیرت میں ڈال دینے والے قصے۔ کوئی انہیں مجذوب کہتا، کوئی پہنچا ہوا بزرگ کوئی فقیر کہتا تو کوئی پیر بابا...... کبھی انھوں نے کسی کو مرید نہیں بنایا' لیکن لوگ خود آتے اور کہتے میں آج سے آپ کا مرید ہوا۔ بابا بھی ایسے لوگوں کو دیکھتے اور اس بس ایک لفظ نکلتا...... ''ہونھ'' یہ 'ہونھ' کا مطلب قبولیت تھا یا حقارت، یہ لوگوں کو سمجھ میں نہیں آتا لیکن مریدوں کی تعداد بڑھتی ہی جارہی تھی۔ دراصل اس پرآشوب دور میں جیسے جیسے لوگوں کی پریشانیاں بڑھ رہی تھیں، خوشیاں چھنتی جارہی تھیں لوگ جائے اماں اور جائے پناہ کی تلاش میں رہتے۔

اور............ ان دنوں میں خود پریشانیوں میں گھرا تھا، مجھے کوئی سہارا چاہیے تھا، کوئی میرا سفارش کرنے والا............ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کی دعائیں ضرور سنتا ہے۔ مجھے بھی

کسی ایک نیک اوراللہ والے کی تلاش تھی ۔ میری زندگی جیسے ایک عذاب بن گئی تھی ۔ ہر پل، ہر لمحہ، بے چینی...... بے بسی...... بے کیفی...... کسی پل سکون واطمینان نہیں ۔

میری پریشان حال زندگی کو دیکھ کرایک دن اماں نے مجھے مشورہ دیا کہ جاؤ کسی فقیر کی پناہ میں، ان کی دعائیں لواوراماں کی بات نے مجھے تقویت دی اور میں نے کئی خانقاہوں کے چکّر لگائے ۔ایک داتا پیر کی خانقاہ میں گیا، خانقاہ کے اندر داتا پیر کی مزار تھی، ہری مخملی چادر سے ڈھکی ہوئی، چاروں طرف سے پھولوں کی بارش، لوبان اوراگربتی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی، یہاں مجھے فاتحہ پڑھ کر بڑا سکون ملا۔ خانقاہ کے دالان میں فرش پرلوگ بیٹھے تھے۔ سبھوں کی نگاہیں سامنے بچھی ایرانی قالین پر رکھے گاؤتکیہ پر تھی۔ داتا پیر کے گدّی نشیں سید شاہ، جو پیر بابا کے نام سے مشہور تھے، وہ آتے اورلوگ اپنی اپنی فریاد سناتے، نذرانے دیتے جاتے۔ انھیں پیر بابا قبول کرتے جاتے، نذرانے دینے والے کو پڑھ پڑھ کر پھونکتے جاتے۔ کبھی کسی کو چینی لانے کا حکم ہوتا کسی کو گول مرچ، کسی کو تعویز کے لئے زعفران، کسی کو کیوڑا کا پانی اور کسی کو............

خانقاہ کے باہران تمام سامانوں کی دکانیں بجی تھیں اورلوگ منہ مانگی قیمت دے کر یہ سامان خرید کر لارہے تھے۔

آج پیر بابا ابھی تک نمودار نہیں ہوئے تھے، سارے لوگ ٹکٹکی لگائے بیٹھے تھے۔ بس بابا اب آنے ہی والے ہیں۔ صبح سے شام ہوگئی۔ میں انتظار کرتے کرتے تھک گیا تھا اوراب واپسی کے لئے اٹھنے ہی والا تھا کہ اچانک خانقاہ کے باہر ایک چمچماتی سفید کار رکی، ایک شور بلند ہوا، ''بابا آگئے............ بابا آگئے............''

سبھی لوگ احتراماً کھڑے ہوگئے، بابا ایک شانِ بے نیازی سے آئے، لوگوں کا سلام قبول کرتے ہوئے اپنے مخصوص حجرہ میں داخل ہوگئے۔ میں نے موجودلوگوں میں سے ایک باریش شخص سے پوچھا............

بابا کہاں گئے تھے؟

باریش شخص نے مجھے گھور کر دیکھا اور بڑی تمکنت کے ساتھ بولے...

''ارے تمہیں معلوم نہیں، آج صبح ہی وزیر اعلیٰ کی کوٹھی سے ان کا بلاوا آیا تھا۔''

میں حیرت واستعجاب کے گہرے سمندر میں ڈوب گیا اور بے اختیار بڑبڑایا.....

'' فقیروں کے یہاں تو بڑے بڑے بادشاہِ وقت اپنی خالی جھولی لے کر آیا کرتے تھے، یہ کیسے پیر بابا ہیں کہ یہ بادشاہ وقت کے یہاں خود ہی حاضری لگانے گئے تھے؟''

بابا کی حقیقت مجھ پر واضح ہوگئی تھی اور میں واپسی کے لئے کھڑا ہوگیا، مجاوروں نے مجھے روکنا چاہا، لیکن میں رکا نہیں اور یہ کہتا ہوا باہر نکل آیا کہ..........

''مجھے تو دنیا سے بے نیاز کسی بابا کی تلاش ہے۔''

قندیلیں پیار کی

شادی کو دو سال کیسے گزر گئے' پتا ہی نہیں چلا' شادی کی دوسری سالگرہ کے روز' صبح صبح جب دوستوں اور رشتہ داروں کے ہیپی میرج ڈے کے فون اور لگا تار ایس.ایم.ایس کا سلسلہ شروع ہوا' تو شاہد اور نسرین کو خیال ہوا کہ شادی کو دو سال ہو گئے' اور یہ دو سال ایسے گزر گئے' جیسے دو دن — اور ان دو دِنوں میں دونوں کو اس بات کا فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ کس نے زیادہ ایک دوسرے کو پیار اور رفاقت دی۔ اس لئے کہ نسرین' شاہد کے لئے مجسم محبت کی پیکر تھی' تو شاہد' نسرین کے لئے پیار کا وہ آبشار تھا' جو ہر پل' ہر لمحہ' اپنے دل کی گہرائیوں سے نسرین کے دل' دماغ' آنکھوں' ہونٹوں' زلفوں پر پیار کی بوچھار کرتا رہتا — صبح سے شام اور شام سے رات — اور رات سے صبح تک' بس پیار ہی پیار کا خزانہ دونوں ایک دوسرے پر لٹاتے رہتے۔

صبح سویرے دونوں کی تقریباً ایک ساتھ نیند کھلتی' شب کے گزارے لمحات کی یادیں دونوں کو گدگداتیں' دونوں ایک دوسرے سے شرماتے اور شرماتے شرماتے دونوں ایک دوسرے سے لپٹ جاتے' ایک دوسرے کو پیار کرتے اور تھوڑی دیر بعد نسرین' شاہد کی بانہوں سے نکلنے کی کوشش کرتی۔

''اب اٹھئے' بستر چھوڑئے' دیر ہو رہی ہے' آج پھر دفتر پہنچنے میں دیر ہو جائیگی''۔

''ارے چھوڑو دفتر' دیر ہو جائے تو کیا' تمہاری آغوش میں بتائے یہ پل' یہ لمحے' بہت قیمتی ہیں' میرے لئے۔ تمہاری یہ گھنیری کالی زلفیں' تمہارا یہ دمکتا شاداب چہرہ' یہ ستواں ناک' یہ

نرگسی آنکھیں' یہ گلاب کی پنکھڑیوں جیسے شہد بھرے ہونٹ' تمہاری یہ مخروطی انگلیاں اور تمہارا یہ گداز بدن......''

''دھت' آپ تو شاعری کرنے لگے''

''ارے جان من' جب میرے پاس سراپا غزل موجود ہو تو پھر شاعری کی کیا ضرورت''؟

''اچھی بات ہے' جناب' لیکن اب چھوڑئیے بھی' آج صبح کی چائے کا ارادہ نہیں ہے کیا''؟

چائے کا خیال آتے ہی' شاہد' نسرین کو اپنی گرفت سے آزاد کر دیتا اور نسرین شرارت بھری نظروں سے دیکھتی ہوئی جلدی سے شاہد کے گال پر ایک پیار بھرا بوسہ لیتی ہوئی' بھاگ کھڑی ہوتی اور شاہد' اس بوسے کے لطیف احساس میں کھو جاتا۔

نسرین تھوڑی دیر بعد چائے لے کر آتی ' دونوں ساتھ ساتھ چائے پیتے' اس درمیان' نسرین' سامنے پڑے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینہ میں اپنے چہرے پر جگہ جگہ پڑے طرح طرح کے داغوں کو دیکھ کر اپنی انگلیوں سے رگڑ رگڑ کر مٹانے کی کوشش کرتی۔

نسرین کی ان حرکتوں کو شاہد' غور سے دیکھتا اور لطف اندوز ہوتا اور پھر جان کر انجان بنتے ہوئے پوچھتا— ''یہ کیا کر رہی ہو۔''؟

نسرین شرما جاتی اور شرمانے کی جو اس کی ادا ہوتی' وہ سیدھے شاہد کے دل میں اتر جاتی اور شاہد' بے اختیار ہو کر نسرین کو بھینچ لیتا اور اس کے گالوں پر محبت بھرا ایک اور داغ دے دیتا۔

نسرین' بناوٹی خفگی کا اظہار کرتی ہوئی' اس کی آغوش سے نکل جاتی' اور شاہد کو کھینچتے ہوئے' اسے باتھ روم میں دھکیل دیتی۔

باتھ روم سے شاہد نہا دھو کر باہر نکلتا تو دیکھتا' ڈائننگ ٹیبل پر گرما گرم ناشتہ لئے نسرین انتظار کر رہی ہے—دونوں مل کر ناشتہ کرتے' چائے پیتے اور پھر شاہد جتنی دیر میں دفتر جانے کے لئے تیار ہوتا اتنی دیر میں نسرین شاہد کے لئے ٹفن تیار کر لیتی اور ٹفن باکس اسکے بیگ میں رکھ کر' اسے دفتر کے لئے روانہ کر دیتی اور شاہد جاتے جاتے پیار بھرے کئی بوسے اسکے گالوں

اور ہونٹوں پر ثبت کر دیتا۔

شاہد دفتر کے لئے اسکوٹر سے روانہ ہو جاتا اور نسرین' ڈرائنگ روم' بیڈ روم اور کچن وغیرہ کو درست کرنے میں لگ جاتی اور پھر خود نہا دھو کر ٹی.وی. کے مختلف چینلوں کو دیکھتے ہوئے وقت گذارنے کی کوشش کرتی' کبھی کسی سے فون پر باتیں کرتی' اور کبھی اپنے فلیٹ سے نکل کر کچھ ضروری سامان لانے چل دیتی۔ اس دوران شاہد کے کئی بار فون آتے اور فون پر بھی وہی پیار محبت اور ساتھ میں کھانہ کھایا یا نہیں' آج کا کیا پروگرام ہے' کہاں چلنا ہے' ڈنر نہیں بنانا ہے' کسی ہوٹل میں کھائیں گے' جیسی باتیں ہوتیں۔

شاہد گھر لوٹتا اور نسرین دلا آویز مسکراہٹ سے اسکا استقبال کرتی' تو شاہد دفتر کی ساری الجھنوں' پریشانیوں کو بھول جاتا اور بے اختیار نسرین کو اپنی بانہوں میں بھر لیتا پھر دونوں ساتھ ساتھ چائے پیتے اور پھر جلدی سے تیار ہو کر اسکوٹر پر سوار ہو کر مارکیٹنگ اور کسی اچھے ریستراں کے لئے نکل جاتے......................

اس طرح ان دونوں کی صبح خوشگوار' شام سہانی اور رات پر بہار گذرتی——بس وہ چند گھنٹے' جب شاہد دفتر میں ہوتا اور نسرین گھر کے سارے کام نپٹا کر ٹی.وی. دیکھ دیکھ کر بور ہونے لگتی' تب شاہد کے انتظار میں وہ چند گھنٹے کاٹے نہیں کٹتے۔ دوپہر کو کھانے کے بعد وہ ایک نیند بھی لے لیتی اور جاگنے کے بعد چائے بناتی لیکن اسے شاہد کے بغیر چائے اچھی نہیں لگتی' کبھی کبھی تو وہ چائے بناتی' لیکن پھر وہ اسے تپائی پر چھوڑ دیتی— شاہد آئینگے تب ساتھ ساتھ چائے پی جائیگی— انتظار کبھی کبھی کوفت میں بدل جاتی اور ایک دن نسرین نے شاہد سے اس کا اظہار کیا—

''آپ کے دفتر جانے کے بعد میں بہت بور ہوتی ہوں اس لئے میں اب آپ کے ساتھ ہی دفتر جاؤنگی''۔

''تم دفتر جا کر کیا کروگی''؟

''بس' سامنے بیٹھ کر آپ کو دیکھتی رہونگی' میرا وقت کٹ جائیگا' آپ یقین کیجئے میں آپ

کو قطعی ڈسٹرب نہیں کروں گی"۔

شاہد نسرین کی اس معصومیت پر ٹھہا کے لگا کر ہنسنے لگا۔ اور ہنستے ہنستے پھر وہ سنجیدہ ہو جاتا ہے اور نسرین کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہتا ہے۔

"ہاں، مجھے بھی اس کا احساس ہے کہ تم میری غیر موجودگی میں بور ہوتی ہوگی، تم ایسا کرو، اخبار کا جاب کالم دیکھنا شروع کر دو، کوئی اچھی ویکنسی نظر آئے تو تم اس میں اپلائی کر دو۔ تمہارے جاب جوائن کرنے سے دو فائدہ ہوگا، پہلا تو یہ کہ تمہاری بوریت دور ہو جائیگی اور دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ ہم دونوں نے ملکر جو خواب دیکھے ہیں اپنا ایک بنگلہ بنے نیارا، اور گھومنے کے لئے ایک نئی چمچماتی کار"—

نسرین کو بھی شاہد کا یہ مشورہ پسند آیا اور اس نے دوسرے دن سے ہی اخبار کا جاب کالم بغور پڑھنا شروع کر دیا اور دو چار جگہ اپلائی بھی کر دیا— کئی جگہ سے انٹرویو کے لئے کال آئے اور آخر کار ایک جگہ اسے پی. آر. او کی نوکری مل گئی— اپوائنٹمینٹ لیٹر جس دن ملا، اس دن دونوں بہت خوش ہوئے اور خوشی میں شاہد نے شاندار ڈنر ایک شاندار ریستراں میں کھلایا—

دوسرے ہی دن نسرین نے جاب جوائن کر لیا، دو چار دن وہ شاہد کے ساتھ دفتر گئی، واپسی میں کبھی شاہد کو دیر ہو جاتی تو وہ لوکل ٹرین یا بس سے واپس آ جاتی— آہستہ آہستہ اسکی جھجھک ختم ہو گئی— اور وہ تنہا ہی دفتر آنے جانے لگی۔

دفتر میں سارے لوگ، اس کی عزت کرتے، ایک تو عہدے کا رعب اور دوسرا اسکے حسن و جمال کی سحر انگیزی، جو بھی دیکھتا، مسحور ہوئے بغیر نہیں رہتا، اس کا ایک سینئر پی. آر. او. ارشد تو اس کا خاص خیال رکھتا، کام سیکھنے میں اس نے اس کی کافی مدد کی، جب کوئی مسئلہ نسرین کے سامنے آن کھڑا ہوتا، وہ ارشد سے مدد لیتی اور ارشد بڑی خندہ پیشانی سے اسکے مسئلہ کو چٹکی میں حل کر دیتا— ارشد جاب میں اس کا سینئر ضرور تھا، لیکن اسکی عمر زیادہ نہیں تھی۔ یہی تقریباً ۳۵ ر برس کے آس پاس ہوگی۔ ہینڈسم اور اسمارٹ تھا، جاب جوائن کئے ہوئے بھی اسے

صرف دو سال ہوئے تھے' آدمی ذہین تھا اور اپنے فیلڈ میں ماہر تھا' لیکن کبھی بھی نسرین کو اس نے اپنا ماتحت نہیں سمجھا' بلکہ ہمیشہ ایک اچھے کولیگ کی طرح' اس کا سلوک ہوتا ــــ شادی اسنے ابھی تک نہیں کی تھی اس سلسلے میں اسکا کہنا تھا ابھی اتنی جلدی کیا ہے پہلے اپنی کوئی حیثیت بنالے' پھر شادی اور............

نسرین' ارشد کی یہ باتیں سنتی اور مسکرا کر رہ جاتی' اور نسرین کی یہ مسکراہٹ ارشد کو بڑی اچھی لگتی اور وہ اکثر ایسی باتیں کرتا' جس سے نسرین مسکرانے کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی بے اختیار کھِل کھِلا کر ہنس پڑتی ــــ

ان دونوں کے بظاہر دو کیبن تھے' بس درمیان میں شیشے کی دیوار حائل تھی' اس لئے نسرین' ارشد کی اور ارشد' نسرین کی ہر حرکت و عمل کو دیکھتے رہتے' لنچ کے وقت اکثر ارشد نسرین کے کیبن میں آجاتا اور دونوں ساتھ ساتھ ہی لنچ کرتے ــــ ایک دن نسرین نے پوچھا تھا ــــ

''آپ کو یہ لنچ باکس کون دیتا ہے''؟

ارشد نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا ــــ ''میں خود ہی بناتا ہوں اب جیسا بھی بن جائے۔ لنچ اور ڈنر بناتے بناتے میں اب اچھا کوک بھی بن گیا ہوں' کبھی موقعہ ملا تو آپ کو اپنے ہاتھوں کا چکن مغلئی ضرور کھلاؤں گا۔ میں واقعی بہت اچھا بناتا ہوں۔''

ارشد کی اس بات کو سن کر وہ بے اختیار ہنس پڑی تھی اور ارشد یہی چاہتا بھی تھا اس لئے کہ نسرین جب ہنستی تھی تو اسکے گلابی گالوں کے داہنی طرف ڈمپل ابھر آتا تھا جو اسے بڑا اچھا لگتا تھا اور ہنستے ہنستے نسرین کا چہرہ گلابی سے سرخ ہو جاتا' اور اس وقت وہ بلا کی حسین لگتی۔

نسرین' شاہد ہی کی طرح دفتری الجھنوں کو دفتر میں ہی چھوڑ آتی' گھر پہنچ کر دونوں میں سے کوئی بھی دفتر کے کام کو ڈسکس نہیں کرتے' کبھی شاہد نے نسرین سے دفتر کا حال پوچھا بھی تو' نسرین نے ہنستے ہوئے جواب دیا ــــ ''نو' نو آفس پلیز''۔

اور شاہد نسرین کا جواب سن کر ہنستے ہوئے کہتا۔'' او کے ڈارلنگ'' ــــ اور آگے بڑھ کر اسکی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے چمٹا لیتا۔

نسرین بھی یہی چاہتی تھی کہ آفس کی مصروفیات کے بعد گھر میں وہ اور صرف شاہد کی چاہتیں رہیں، محبت اور پیار رہے اور اسی طرح دونوں ایک دوسرے پر اپنی جان نچھاور کرتے رہیں۔

لیکن! ادھر چند دنوں سے وہ اپنے اندر کچھ تبدیلی محسوس کر رہی تھی، ذہن کو جھٹکنے کی کئی بار اس نے کوشش کی، لیکن ارشد کسی خوشبو کی طرح اس کے ذہن میں بستا چلا جا رہا تھا—— دفتر جانے کے لئے وہ تیار ہونے لگتی، اور ڈریسنگ ٹیبل کے آئینہ کے سامنے کھڑی ہوتی تو چپکے سے ارشد، اس کے ذہن سے اتر کر سامنے آئینہ میں کھڑا ہو جاتا۔ یہ ہیئر اسٹائل، ایسے نہیں ایسے کرو، لپ اسٹک یہ نہیں وہ لگاؤ۔ یہ کان میں پڑے بُندے کئی دن ہو گئے، آج سوٹ سے میچ کرتا ہوا ٹاپس کانوں میں ڈالو، اور یہ ناک کا بیسر، سفید نگ والا اچھا لگے گا اور یہ یہ.............!

نسرین عجیب کشمکش میں پڑ جاتی، کبھی مسکراتے ہوئے، وہ ان باتوں کو مان لیتی اور کبھی جھلّا جاتی اور اونچی آواز میں شاہد کو آواز دیتی۔

''شاہد—— ادھر آؤ تم بتاؤ آج میں کانوں میں کون سا ٹاپس پہنوں، ناک کا بیسر کون سا اچھا لگے گا اور یہ لپ اسٹک ٹھیک ہے نا''؟

شاہد چونکتا، اور نسرین کے قریب پہنچ کر اپنی ٹائی کے ناٹ کو درست کرتا ہوا کہتا——

''ارے میری جان، تم جو بھی پہن لو، خوبصورت ہی لگو گی، یہ سب نہیں پہنو گی تو بھی، تمہارے حسن میں کمی نہیں آئیگی''۔

اور نسرین اس کے اس پیار کے اظہار پر بناوٹی خفگی کا اظہار کرتی—— ''دھت، تم تو ہمیشہ ....ارے کبھی تو سیریس ہوا کرو''۔

''سیریس اور میں؟ یہ ناممکن ہے میری جان! اگر تم مجھے قتل بھی کرنا چاہو، تب بھی میں تمہارے ہاتھوں ہنستے ہنستے جان دے دونگا، لیکن سیریس نہیں ہوؤں گا۔ ہاں صرف تمہاری جُدائی میں برداشت نہیں کر سکتا''۔

''اے' بکواس نہیں' مجھے ایسے مذاق پسند نہیں' شاہد کی باتوں کو سن کر نسرین واقعی سیریس ہو جاتی اور اپنے غصہ کا اظہار کرتی۔۔۔

شاہد' نسرین کو اپنے سینے سے لگا لیتا' اور کہتا۔

''ارے نہیں' میں تو یونہی مذاق کر رہا تھا۔ تم خفا کیوں ہو رہی ہو' اچھا چلو جلدی کرو دفتر میں ہم دونوں کو کہیں دیر نہ ہو جائے''۔

یہ کہتا ہوا شاہد نسرین کے ایک ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیتا اور فلیٹ سے باہر آ جاتا' فلیٹ کے باہری دروازے پر قفل لگاتا ہوا لفٹ سے نیچے اُترتا اور پھر اسکوٹر پر نسرین کو بٹھا کر بس اسٹاپ پر چھوڑتا ہوا آگے بڑھ جاتا' دونوں کے دفتر دو سمت میں تھے' اس لئے نسرین کبھی لوکل ٹرین یا بس سے دفتر جاتی۔

نسرین دفتر پہنچتی اور پھر دن بھر دفتر کی مصروفیات' نہ چاہتے ہوئے بھی ارشد سے کئی بار آفیشیل میٹر پر ڈسکشن اور لنچ ٹائم میں اپنا لنچ باکس لئے ہوئے ارشد کے اس کے کیبن میں آ جانے پر ساتھ ساتھ لنچ اور پھر کینٹین کی چائے اور چائے کے ساتھ ساتھ ادھر ادھر کی باتیں۔

ارشد کا اس کے ساتھ رویہ اس قدر مہذب اور اتنی ہمدردی و خلوص سے بھرا ہوتا کہ وہ جب کبھی اس کے کیبن میں آتا یا اسے چائے یا کافی کے لئے بلواتا' وہ انکار نہیں کر پاتی۔۔۔

لیکن ادھر وہ اپنے اندر جو تبدیلی محسوس کر رہی تھی' اس سے وہ بہت پریشان تھی۔۔۔ اس کی پوری کوشش ہوتی کہ آفس کے بعد آفس کے ہر کام' ہر ملاقات' ہر عمل کو آفس میں ہی چھوڑ دے لیکن چاہ کر بھی ایسا نہیں ہو پا رہا تھا۔ ایک دن نہ جانے کس بے خیالی میں اسنے اپنے ٹفن باکس میں' ایک خاص ڈش اور چند زائد روٹیاں رکھ لی تھیں اور لنچ کے وقت اس نے ارشد کو کہا تھا۔۔۔ ''لیجئے' آج میں نے آپ کیلئے لنچ لایا ہے' آپ روز روز سینڈوچ کھاتے ہیں''۔۔۔

ارشد بہت خوش ہوا' اور اس نے اس کے مکس ویجیٹبل ڈش کی بہت تعریف کی اور انگلیاں چاٹ چاٹ کر اس ڈش کو روٹی کے ساتھ کھایا اور کہا۔۔۔ ''آج اپنی مرحومہ ماں کی یاد آ گئی وہ

بھی اسی طرح مکس ویجیٹیبل بناتی تھیں''۔

نسرین پر نفسیاتی اثر پڑا' وہ اپنے ڈش کی تعریف سن کر بہت خوش ہوئی—

اس رات وہ بہت بے چین نظر آئی' دیر رات تک اسے نیند نہیں آئی' شاہد کب کا معمول کے مطابق اسے گڈ نائٹ کہہ کر سو گیا تھا اور وہ کروٹ پر کروٹ بدل رہی تھی— ارشد نے اپنے خلوص ہمدردی اور اپنی مردانہ وجاہت کا ایسا سحر کر دیا تھا کہ وہ ذہن سے اسے بار بار جھٹکتی' لیکن اس میں وہ کامیاب نہیں ہو پا رہی تھی— اور دھیرے دھیرے اسنے محسوس کیا' کہ ارشد اسکے ذہن سے ہوتا ہوا اس کے دل میں اترتا چلا جا رہا ہے' وہ کبھی بے خیالی میں مسکرا دیتی اور کبھی پریشان ہو جاتی— اور بے چینی کے عالم میں' وہ کروٹ بدل کر بے خبر سوئے ہوئے شاہد کے سینے سے سٹ جاتی' اسے چمٹا لیتی— اس کی اس دیوانگی سے اچانک شاہد کی نیند ٹوٹ جاتی' وہ نائٹ بلب کی روشنی میں نسرین کو غور سے دیکھتا ہے' اور پوچھتا ہے—

''کیوں کیا بات ہے' نیند نہیں آرہی ہے؟ کوئی پرابلم''؟

نسرین' شاہد کی بات سن کر خاموش رہی اسے محسوس ہوا' جیسے شاہد نے اس کے دل میں جھانک کر کچھ دیکھ لیا ہے۔

نسرین خاموش ہی رہتی ہے' شاہد سے چمٹ کر سونے کی کوشش کرتی ہے' کافی کوششوں کے بعد اسے نیند آتی ہے' لیکن نیند آنے کے بعد تو وہ اور بے بس نظر آئی' خواب میں ارشد' کبھی اس کی زلفوں سے کھیلتا کبھی اس کے انگارے جیسے دہکتے رخساروں کو چھوتا ہے اور کبھی اس کے نرم ملائم اور خوبصورت ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے لیتا ہے— اور نسرین جیسے کسی مجسمہ میں تبدیل ہو گئی ہو' ارشد کی ان حرکتوں کو وہ صرف دیکھ رہی تھی' محسوس کر رہی تھی' لیکن اس کی زبان جیسے گنگ ہو گئی تھی۔ پورا جسم جیسے بے جان اور ساکت ہو گیا ہو.................

صبح اس کی دیر سے نیند ٹوٹی اور رات کی اس کی بے چینی اور خواب کی وادیوں کی یادوں نے اسے مزید پریشان کر دیا۔

شاہد نے اسے کچھ پریشان دیکھا تو پوچھا'' کیوں کیا بات ہے' رات میں بھی تم کافی

بے چین لگ رہی تھی۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا''؟

''ہاں' ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں' رات ٹھیک سے نیند نہیں آئی اسلئے ذرا کسلمندی ہے''—

''نیند کیوں نہیں آئی''؟

شاہد کا یہ سوال تیر بن کر اسکے سینے میں اتر گیا— وہ جواب دے تو کیا— کیا وہ یہ بتا دے' اس کا کولیگ ارشد دھیرے دھیرے اس کے ذہن سے ہوتا ہوا اسکے دل میں اتر نے لگا ہے اور اب تو وہ خواب میں بھی آنے لگا ہے۔

نسرین کے دل ودماغ میں عجیب سی کشمکش اور جنگ چل رہی تھی' اس کشمکش اور جنگ کے درمیان وہ دفتر جانے کی تیاری میں مشغول رہی' معمول کے مطابق شاہد کو ناشتہ کرایا' ٹفن دیا اور پھر دونوں دفتر کے لئے ساتھ نکلے۔

نسرین دفتر پہنچ کر اپنے کیبن میں خود کو بے حد مصروف رکھنے کی کوشش کرتی ہے ایک بار چپراسی اسے بلانے کے لئے بھی آیا کہ ارشد صاحب چائے کے لئے بلا رہے ہیں' لیکن اس نے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ میں کام میں بہت بزی ہوں' درمیان میں لگے شیشے کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھنے کے لئے اسے سخت جدوجہد کرنا پڑی اور اس نے کوشش کی کہ وہ شیشے کی طرف نگاہ تک نہیں اُٹھائے گی۔

لیکن اس کی یہ تمام کوششیں اس وقت بے معنیٰ ہو گئیں' جب لنچ ٹائم ہوتے ہی ارشد اپنا لنچ باکس لئے ہوئے اس کے کیبن میں آ گیا اور بولا— ''آج کیا بات ہے' کام بہت زیادہ ہے' یا موڈ خراب ہے''؟

نسرین نے نظر اٹھا کر ارشد کو دیکھا اور کھڑی ہوتی ہوئی پوری ہمت جٹا کر چیخ پڑی۔

''مجھے کام زیادہ ہے یا میرا موڈ خراب ہے' اس سے آپ کو کیا مطلب' اور یہ آپ روز روز لنچ باکس لئے ہوئے میرے کیبن میں کیوں چلے آتے ہیں؟ یہ کیبن کیا کوئی کینٹین ہے'

جائیے' اپنے کیبن میں اور پھر کبھی میری اجازت کے بغیر میرے کیبن میں آنے کی ہمت نہیں کرنا۔۔۔''

یہ کہتی ہوئی وہ ہانپتی ہوئی اپنی کرسی پر بیٹھ گئی' نڈھال اور بے جان سی۔

ارشد' نسرین کے اس تیور کو دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا' یہ اچانک کیا ہوا' وہ بڑی خاموش اور اداس قدموں سے واپسی کے لئے مڑ گیا' بڑے بھاری قدموں سے وہ اپنے کیبن میں پہنچا' اور نظریں اُٹھا کر شیشے کے پار اس نے نسرین کو دیکھا۔۔۔

وہ سسک سسک کر رو رہی تھی۔

ارشد' نسرین کی اس حرکت کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس نے اپنا لنچ باکس ٹیبل پر پٹک دیا' جس سے ٹیبل پر رکھا شیشہ چٹک گیا اور قریب میں رکھا تازہ پھولوں کا گلدستہ فرش پر گر کر بکھر گیا۔

شام ہونے سے قبل ہی نسرین نے نوکری سے اپنا استعفیٰ نامہ چپراسی کے ہاتھوں میں تھماتی ہوئی گھر واپس آ گئی اور آتے ہی اپنے بستر پر ڈھیر ہو گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

روایت

پورے گھر میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ سارے جھانجھ، مجیرے، ڈھول، باجے اچانک خاموش ہو گئے۔ بچے کی متوقع آمد کی جو خوشی چھائی ہوئی تھی اور آس پڑوس کی عورتیں اور لڑکیاں جھوم جھوم کر خوشی کے گیت گا رہی تھیں، یکایک لڑکا تولد ہونے کی اطلاع پا کر مایوس اور اداس ہو گئیں اور گھر کی پوری فضا پر غم کے بادل چھا گئے۔

پامیلا کو بھی لوگوں کے بجھے اور اداس چہرے کو دیکھ کر یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس بار بھی اوپروالا اس پر مہربان نہیں ہوا اور رحمت کی بجائے زحمت دے دی۔ پھر بھی اسے یقین نہیں آیا تو اس نے اپنے بستر کے قریب کھڑی دائی سے نقاہت بھرے لہجے میں پوچھ لیا۔

''بیٹی ہے یا بیٹا؟''

''بیٹا ہوا ہے۔''

دائی کا جواب سن کر اس کی نقاہت مزید بڑھ گئی۔ لیٹی لیٹی وہ سوچنے لگی۔

پہلے بیٹا کو تو اس نے کسی طرح قبول کر لیا، لیکن اب پھر یہ دوسرا بیٹا؟ اسے اپنی زندگی بڑی تاریک لگنے لگی، اب اس کا کیا ہوگا، کیسے کٹے گی زندگی، کیسے چلے گی، اس کی روایت......

روایت............روایت............روایت............

اس کے دل و دماغ پر اس لفظ کے ہتھوڑے برسنے لگے۔ اس روایت کو توڑ دینے کی اس نے کتنی کوششیں کیں، کتنی جد و جہد کی، کتنی آزمائشوں سے وہ گذری۔ لیکن سب کے سب اس روایت کے بندھن کے سامنے پگھلتے برف کی مانند بوند بوند ہو کر پھیل گئے اور وہ ٹوٹ گئی۔

اس نے روایت کے آگے سپر ڈال دی اور پھر شروع ہوگیا رقص اور موسیقی کا سلسلہ اور دھیرے دھیرے وہ اترتی چلی گئی دلدل میں...... ذلت اور تعفن بھرے دلدل میں...... لیکن مانگے کے اجالوں سے جگ مگ دلدل، جس کی روشنی اچھے اچھوں کو چکا چوند کردیتی ہے۔ وہ خود کو اس دلدل سے بچا نہیں پائی اور اس کے پاؤں کے گھنگھرو کی چھن چھن، ڈھولک کی تھاپ اور ہارمونیم کے ساتھ اس کی سریلی آواز...... ایک خاص ناز و ادا سے اُبھرتی تو لوگ جھوم جھوم اُٹھتے، ''واہ...... واہ...... کیا بات ہے' کیا ناز و ادا ہے، کیا مدھر آواز ہے۔'' کی صدا دیر تک اس کے سجے سجائے خوبصورت ہال میں گونجتی رہتی...... اوپر والے نے اسے غضب کا حسن بھی عطا کیا تھا۔ گلابی رنگت لئے حسین چہرہ، اس پر بڑی بڑی قیامت ڈھاتی آنکھیں، گداز جسم، مخروطی انگلیاں، صراحی دار گردن اور لمبی گھنیری زلفیں اور اس پر سیدھے دل میں اُتر جانے والی مدھر آواز' وہ جب نغمہ سرا ہوتی تو ایسا لگتا جیسے قیامت ٹوٹ پڑی ہو...... اور لوگ مدہوش ہو ہو کر اس کے گلے میں پھولوں اور نوٹوں کا ہار پہناتے جاتے اور وہ...... ان تمام باتوں سے بے نیاز گھوم گھوم کر کمر مٹکا مٹکا کر اپنی آواز اور اپنے حسن کا جادو جگاتی جاتی اور وہ۔ واہ...... کیا بات ہے...... کیا ادا...... کیا آواز ہے کی بازگشت کے درمیان میں ہی لوگوں سے جھک جھک کر داد حُسن اور داد نغمہ وصولتی ہوتی اچانک چھلانگیں مارتی ہال سے گزرتی ہوئی اپنے کمرے میں واپس چلی جاتی ۔، باہر ہال سے اسے دوبارہ لانے کی فرمائشوں کا سلسلہ جاری رہتا، لیکن وہ دبی دبی مسکراہٹ کے ساتھ سر کے ٹھیک اوپر لگے پنکھے کی تیز ہوا سے صندلی جسم کے پسینہ کو خشک کرنے میں مشغول رہتی کہ باہر ہال سے اس کی ماں کسی اجنبی کو ساتھ لئے ہنستی مسکراتی، اس کے کمرے میں داخل ہوتی اور اس اجنبی کا تعارف بڑے دلنواز انداز میں کراتی۔ دیکھو بیٹی، یہ شہر کے مشہور سیٹھ شیام جی ہیں، سارے شہر میں ان کی طوطی بولتی ہے۔ اور یہ.........

ماں کا یہ انداز کوئی نیا نہیں ہوتا، وہ ساری بات سمجھ جاتی اور کچھ گھبراتی، کچھ شرماتی ہوئی اُٹھ کر بستر پر بیٹھ جاتی...... سیٹھ جی مسکراتے ہوئے اس کے قریب پہنچتے۔ ''اوہ...... اوہ

......یہ صراحی دار گردن اتنے بھاری پھولوں اور نوٹوں کے ہاروں سے بہت جھک گئے ہیں''۔
اور وہ سارے ہار اپنے ہاتھوں سے اُتار کر ہیرے جڑے سونے کا ہار اس کے خوبصورت گلے میں ڈال دیتے اور پھر...... کھڑکی سے باہر جھانکتی چاندنی شرما کر بادلوں کی اوٹ میں چھپ جاتی اور یہ سلسلہ برسوں تک چلتا رہا۔ شہرت اور دولت اس کے گھر کی باندی بنی رہی' لیکن اچانک ایک دن جب اس کی ماں ضعیفی کا دُکھ جھیل کر چل بسی' اس دن اسے دبے پاؤں گزرتے وقت اور تنہائی کا شدید احساس ہوا...... وقت کی جلتی دھوپ نے اس کے حُسن اور آواز پر بھی اپنا عکس ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ جس کی وجہ کر رقص اور موسیقی کی محفل بھی بس کبھی کبھار جمتی۔ اس کا مرکز اب پڑوس کی روپ وتی کا گھر بن گیا تھا۔ حُسن اور دولت بڑی تیزی سے اس کا ساتھ چھوڑ رہی تھیں۔...... ایسے میں اسے اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا ......اور وہ اپنے بھیانک مستقبل اور تنہائی سے گھبرا کر ماں بننے پر مجبور ہوگئی، اس نے سوچا کہ بچی پیدا ہوگی تو ضرور میری ہی طرح حسین اور قیامت خیز ہوگی۔ ہر طرف اس کے حسن اور اس کی اداز کے چرچے ہوں گے...... پھر تو...... دولت اور شہرت اس کے قدم چومے گی ......لیکن ایسا نہ ہوا۔ لڑکی کی بجائے لڑکا اس کی آغوش میں تھا۔ اس بچے کی مسکراہٹ دیکھ کر اس کی ممتا جاگ اُٹھی اور اس نے سوچا یہ لڑکا بھی اس کے تاریک مستقبل میں روشنی پیدا کر سکتا ہے۔ یہ سوچ کر اس نے اپنے دل کی اداسیوں کو کھرچ کر پھینک دیا اور ایک نئے جوش اور ولولہ سے وہ اپنے بیٹے کی بڑے لاڈ پیار سے پرورش کرے گی' اسے اچھی تعلیم دے کر ایک بڑا آدمی بنانے کے خواب' میں بڑی چمک تھی' لیکن کاتب تقدیر۔...... دور کھڑا مسکرا رہا تھا۔

پامیلا ایک دن بڑی اُمنگوں اور چاہتوں کے ساتھ اپنے بیٹے کو لئے ایک انگلش اسکول میں داخلہ کرانے پہنچی' تو ایک سوال نے اس کے دل و دماغ کو جھنجھنا کر رکھ دیا۔

''لڑکے کے پتا کا نام کیا ہے؟'' پتا کا نام......؟؟؟؟

وہ دیر تک سوچتی رہی' سوچتی رہی اور آخر کار اس نے ایک فرضی نام دے دیا' ایسا نام جو نام تھا......لیکن سماج کے لوگوں کی نگاہیں بڑی تیز ہوتی ہیں...... بیٹا آئے دن اپنی ماں

سے شکایت کرتا کہ ماں، میرے دوست میرے پتا کا نام پوچھتے ہیں، میں انھیں کیا جواب دوں؟ ماں اسے کچھ نہ کچھ سمجھا دیتی، سمجھانے کو تو وہ سمجھا دیتی، لیکن اندر ہی اندر ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتی رہتی اور ایک دن سر سے پانی گزر گیا۔ جب بیٹا روتا ہوا آیا اور ماں سے شکایت کی کہ ماں، اب میں اسکول نہیں جاؤں گا، اس لئے کہ اسکول سے باہر نکلتے ہی سارے بچے شور مچاتے ہیں اور کہتے ہیں...... ''بن باپ کا بچہ...... ہاں جی۔''

پامیلا یہ سن کر غصے سے پاگل ہوگئی...... لیکن جلد ہی اس نے اپنے غصے پر قابو پالیا اور اس کے علاوہ وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ کیسے کیسے سمجھاتی، کس کس پر غصہ کرتی...... بیٹے نے اسکول جانا بند کر دیا اور وہ صبر کر کے رہ گئی۔

اسے ہر طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آنے لگی۔ مستقبل میں روشنی کی کرن بس اب ایک بیٹی تھی...... اور اسی روشن مستقبل کے لئے وہ دوبارہ ماں بننے پر مجبور ہوئی۔ لیکن اس بار بھی...... قسمت نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ نفرت بھری نگاہ سے اس نے اپنے پہلو میں پڑے بچے کو دیکھا۔ جی چاہا کہ...... لیکن وہ ایسا کچھ نہ کر سکی، اس لئے کہ وہ ایک ماں تھی، اس نوزائدہ کے جسم میں اس کا لہو دوڑ رہا تھا...... وہ بے اختیار اسے گود میں لے کر پیار کرنے لگی...... اور اپنے آپ کو قسمت کے بہتے دھارے کے سہارے چھوڑ دیا۔

وقت دبے پاؤں بڑی تیزی سے گزرتا رہا، اور تیز جھلستی ہوئی دھوپ اسے جلاتی رہی......

اس کے دونوں بیٹے آس پاس کی گلیوں اور محلوں میں کھیلتے کودتے رہتے، انھیں اپنی ماں کی بے بسی اور بے کسی کا ذرا بھی احساس نہ تھا اور دھیرے دھیرے اپنے اردگرد کے ماحول میں وہ دونوں بھی ڈوبتے چلے گئے...... بھوک کی شدت جب ستانے لگتی تو وہ دوڑے دوڑے اپنی ماں کے پاس آتے اور ''بہت بھوک لگی ہے ماں'' کی صدا لگاتے۔ ماں سے جو بن پڑتا، ان کے سامنے رکھ دیتی اور وہ دونوں کھا پی کر پھر گھر سے باہر نکل جاتے۔

پامیلا، ہر وقت، ہر لحہ فکر مند رہنے لگی...... کیا ہوگا...... رقص اور موسیقی کی محفل اب اس گھر کے لئے یادِ ماضی بن چکی تھی...... بس کبھی کبھار کوئی گاہک آجاتا، اور اسے نپٹا کر وہ تھک کر

چور کمرے سے باہر نکلتی تو دیکھتی' دروازے کے قریب بیٹھے اس کے دونوں بیٹے بھوک بھوک کی رٹ لگائے ہوئے ہیں اور وہ اپنے ہاتھ میں دبے کچلے روپیوں میں سے چند روپے نکال کر انھیں دیتی اور وہ خوشی خوشی روپے لے کر باہر کسی دکان کی طرف بھاگ جاتے۔ لیکن یہ سلسلہ بھی دھیرے دھیرے اس کی ڈھلتی عمر کے ساتھ کم ہونے لگا۔ کتے بھی گوشت لگی ہڈی کو ہی بھنبھوڑتے ہیں۔

پامیلا کے'اپنے پڑوسیوں کے سامنے پھیلے ہاتھ بھی اب خالی رہنے لگے تھے، پڑوسیوں اور دوستوں نے بھی قرض دینا بند کر دیا تھا کہ انھیں واپسی کی کوئی امید نہیں تھی۔

ان حالات سے گھبرا کر اس نے گھر سے باہر قدم نکالے، دائی یا نوکرانی کا کام کر کے پیٹ بھرنے کے لئے۔ لیکن کاتب تقدیر نے اس کے جسم کے انگ انگ پر ایسی دائمی مہریں ثبت کر دی تھیں کہ وہ ان مہروں کو چاہ کر بھی نہیں چھپا پاتی ...... اور لوگ ...... ان مہروں کو صاف پڑھ لیتے اور دو چار دنوں بعد ہی اس کی چھٹی ہو جاتی......

اس نے اپنے بیٹوں کو بھی بہت سمجھایا کہ کہیں چھوٹا موٹا کام تلاش کر لیں، لیکن انھیں اپنی آوارگی میں زیادہ مزہ آتا، اس لئے ماں کے مشورہ پر ان دونوں نے کوئی دھیان نہیں دیا۔

ایک دن پامیلا ان ہی ادھیڑ بن میں بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی کہ اس کے دونوں بیٹے 'بہت بھوک لگی ہے ماں'' کی آواز لگاتے ہوئے حسب معمول گھر کے اندر داخل ہوئے۔

پامیلا کو معلوم تھا کہ گھر میں کھانے کو آج کچھ بھی نہیں ہے، اس لئے وہ خاموش رہی، لیکن ان دونوں کی ضد بڑھتی گئی تو پامیلا اپنے غصہ پر قابو نہ رکھ سکی اور وہ ان دونوں پر چیخ پڑی۔

''کمبختو......کہاں سے میں تم لوگوں کو دن رات دھا کر کھلاؤں......کوئی کام دھندہ نہیں کرتے، ہر وقت آوارگی کرتے پھرتے ہو......تم دونوں میرے لئے گاہک ہی تلاش کر کے لاؤ، کہ میں تم دونوں کے پیٹ کی دوزخ کو بھرتی رہوں......''

درد و کرب میں ڈوبی پامیلا کی چیختی ہوئی آواز اور ان دونوں بے حس لڑکوں پر برستے ہوئے اس کے تھپڑ ایک عجیب سماں پیش کر رہے تھے۔

دونوں کو دیر تک پیٹتے رہنے اور گالیاں دینے کے بعد' وہ تھک کر نڈھال ہوگئی اور دروازے کے ایک کنارے پر بیٹھ کر اپنی بے بسی پر رونے لگی۔ دونوں بیٹے اپنے گالوں کو سہلاتے ہوئے گھر سے باہر نکل گئے۔

پامیلا...... انھیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی اور گھنٹہ بھر بعد اس کی آنکھیں حیرت اور تعجب سے پھیل گئیں، اس کے دونوں بیٹے ایک اجنبی کو ساتھ لئے خوشی خوشی لوٹ رہے تھے ...... چند قدم کے فاصلے ہی سے ان دونوں نے مسّرت بھرے لہجہ میں چیختے ہوئے اپنی ماں کو آواز دی......

''لو ماں' ہم تمہارے لئے گاہک لے آئے!''

سائے کا تعاقب

کمرے کے اندر ہی بلب شیڈ کے اوپر بنے گھونسلے سے چڑیوں کی چہچہاہٹ نے بابا کی کھلی آنکھوں کے سپنے کو توڑ دیا۔ نیند تو کمبخت آتی ہی نہیں جو بند آنکھوں کا سپنا دیکھتے۔ کبھی چپکے سے تھوڑی دیر کے لئے نیند کی دیوی اپنی آغوش میں لیتی تو خوشگوار ماضی' حال کو دیکھ کر اداس ہو جاتا ہے اور پھر وہی اداسیاں ہی اداسیاں' تنہائیاں ہی تنہائیاں، ہر سمت ویرانیاں ہی ویرانیاں، خزاں ہی خزاں۔ کبھی کبھی بابا کو اپنی بینائی پر شک ہونے لگتا۔

''کیا میری آنکھیں......''

لیکن رامو چائے والے نے کہا تھا، اس دن رامو چائے والا بھی شاید موڈ میں تھا۔ ''نہیں بابا! یہ مہینہ تو بہار کا ہے۔''

''لیکن رامو بیٹا، بہار کا مہینہ ہے تو پھر...... وہ سب کیا ہوئے، وہ ہریالی، وہ شادابیاں، وہ ہوا کے خوشگوار جھونکے، کیا وہ سب......''

لیکن رامو کی توجہ بابا کے سوال پر نہیں، بلکہ اس کا پورا دھیان اپنے گاہکوں پر تھا۔

رامو، شاید بابا کی پرانی باتوں کو سن سن کر تنگ آ گیا ہے کہ بابا تو بس ہر وقت بکتا ہی رہتا ہے، بابا کے ڈھیر سارے سوالوں کا جواب میں رامو کئی بار جھنجھلا کر کہہ چکا تھا- بابا بس تم ایک روپے کی ایک کپ چائے میں میرے دو روپے کا اخبار پڑھ کر چپ رہا کرو، تبصرہ مت کیا کرو۔''

اور بابا چپ سادھ کر سوچنے لگے۔

آج میری گفتگو لوگوں کو ناگوار گزرتی ہے لیکن کچھ عرصہ قبل تک میری باتیں سننے کے لئے لوگ آندھی اور طوفان میں بھی میرا انتظار کرتے تھے۔ اُف'یا' یہ کیسا تضاد ہے، موت بھی تو

کمبخت نہیں آتی، موت آجاتی تو شاید سکون مل جاتا، یہ تنہائیاں یہ ویرانیاں، یہ بے بسی ...... ان کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ اب تو میں ایک کھوٹے سکے کی مانند ہوں، جسے ہر شخص ادھر ادھر اچھال دیتا ہے، کوئی بھی میری قدر نہیں کرتا۔

کھٹ...... کھٹ...... کھٹ......

باہر دروازے پر ہونے والی دستک نے بابا کے خیالات کے تانے بانے کو توڑ دیا اور ان کی توجہ دستک کی جانب مرکوز ہوگئی۔

''اتنی صبح سویرے اور میرے یہاں' کون ہوسکتا ہے؟''

بابا خود ہی دھیرے سے بدبدائے۔ ''سب کے سب مجھ سے گھبراتے ہیں کہ کہیں میں آزادی کی لڑائی کے قصے اور اپنی بیوی کے صبر و تحمل کی بات سنا کر ان کے قیمتی وقت کو ضائع نہ کروں۔ میں خود سوچتا ہوں کہ ماضی کے اوراق لوگوں کے سامنے نہ کھولوں، لیکن کیا کروں، میں مجبور ہوں نہ جانے وہ کون سا انجانا جذبہ ہے جو ان اوراق کے قصے سنانے پر مجبور کرتا ہے ۔اس میں میرا مفاد بس اتنا شامل ہوتا ہے کہ ماضی کی کہانی سنا کر میری آنکھوں کی چمک لوٹ آتی ہے، مجھے بڑا سکون ملتا ہے، اس دن میں بے حد خوش رہتا ہوں۔ بس ایسا لگتا ہے جیسے میں نے ابھی ابھی خوشگوار ماضی میں سانسیں لی ہیں۔ ابھی ابھی اپنے بیٹے حمید کو سینے سے لگا کر پیار کیا ہے۔ اس کے سر کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے سمجھایا ہے۔

''بیٹے اپنے ملک کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دینا بھی مذہب کا ایک اہم حصہ ہے۔ ہماری آج کی قربانی کل کا شاندار مستقبل ہوگا۔'' پھر اپنی بیوی کو بانہوں میں بھر کر، اس کی آنکھوں سے بہتے آنسو پوچھتا ہوں اسے سمجھاتا ہوں، صبر تحمل کا ثبوت دو، یہ وقت تمہاری اور ہماری آزمائش کا ہے۔''

کھٹ...... کھٹ...... کھٹ......

''اوہ، آ رہا ہوں بھائی کون ہے؟''

بابا کی اداس اور نحیف آواز کمرے میں گونجی اور وہ آنکھوں پر چشمہ چڑھاتے ہوئے پلنگ کے قریب رکھی اپنی چھڑی اٹھا کر دروازے کی جانب بڑھے۔

''کون ہو بھائی؟''

''جی میں ہوں بابا، دنیش۔''

''اوہ دنیش، آؤ بیٹا۔'' بابا نے دروازہ کھول دیا۔

''کیوں بابا آپ تیار نہیں ہیں؟'' دنیش نے اندر داخل ہوتے ہی بابا سے سوال کیا۔

''تیار ہو کر کہاں چلنا ہے بیٹا؟'' بابا نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے دنیش سے پوچھا۔

''اوہ بابا' آپ بھول جاتے ہیں، آج ۱۵/اگست ہے، آپ نے مجھے بلایا تھا، ساتھ گاندھی میدان چلنے کو۔ یوم آزادی کے فنکشن میں شرکت کے لئے۔''

''ہاں بیٹا، اُف میری یادداشت بھی جواب دے جا رہی ہے۔ تم بیٹھو بس ابھی میں تیار ہو کر آتا ہوں۔''

کہتے ہوئے بابا کمرے سے ملحق دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ دنیش پلنگ کے قریب رکھی تین ٹانگ والی ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور اس کی نظریں ہمیشہ کی طرح پورے کمرے کی دیواروں پر ٹنگی مختلف تصاویر سپاس ناموں، اخباری کترنوں کے فریموں پر سے پھسلنے لگیں، یہ تمام تصاویر، سپاس نامے اور خباری کترنیں بابا سے متعلق تھیں۔ مختلف تصویروں میں بابا مختلف پوز میں تھے۔ کسی میں بڑی گرم جوشی سے تقریر فرما رہے تھے۔ کسی تصویر میں بابا کسی اہم میٹنگ کی صدارت کر رہے تھے یا مہمان خصوصی کی حیثیت سے تشریف فرما تھے، کسی تصویر میں بابا ملک کی مقتدر ہستیوں کے ساتھ فکر وخیال کی دنیا میں ڈوبے ہوئے تھے اور سیاسی وسماجی تقاریر کی اخباری کٹنگ بھی بتا رہی تھیں کہ بابا کو اس زمانے میں اخبار والے بھی کتنی اہمیت دیتے تھے، لیکن آج بابا......کیا یہ وہی بابا ہیں۔ ماضی اور حال کا اتنا بڑا تضاد......

لیکن دنیش کو زیادہ دیر باباکے ماضی اور حال پر سوچنے کا موقع نہیں ملا۔اس لئے کہ بابا،اس کی نظروں کے سامنے اپنے شاندار روایتی لباس میں تیار کھڑے تھے۔چست پاجامہ ،شیروانی،سر پر گاندھی ٹوپی،ہاتھ میں چھڑی......

''چلو بیٹا دنیش کہیں دیر نہ ہو جائے۔''

یہ کہتے ہوئے بابا دنیش کو لئے ہوئے باہر آئے اور دروازے میں قفل لگا کر آگے بڑھتے چلے گئے۔راستے میں دنیش نے رکشہ کر لینے کا اشارہ کیا۔لیکن بابا کو اپنی جیب میں پڑے بس چند سکوں کا علم تھا۔اس لئے انہوں نے ٹال دیا۔

''نہیں بیٹے، پیدل ہی چلتے ہیں،صبح کا وقت ہے،ذرا ہوا خوری بھی ہو جائے گی۔''

وہ دونوں جب گاندھی میدان پہنچے تو اس وقت تک کافی لوگ آ چکے تھے۔دنیش اور بابا ایک گیٹ میں داخل ہو گئے۔ابھی چند ہی قدم آگے بڑھے ہوں گے کہ ایک سپاہی نے روکا

''اے ادھر کا پاس ہے؟''

''نہیں پاس تو نہیں مگر......'' بابا نے بڑی بے چارگی سے جواب دیا۔

''اگر مگر کچھ نہیں، پاس نہیں ہے تو اُدھر جاؤ......اور سپاہی نے بڑی بے رحمی سے بابا کو ایک جانب دھکا دے دیا۔بابا لڑکھڑا گئے۔دنیش نے جلدی سے ان کی بانہیں پکڑ لیں، ورنہ بابا چاروں خانے چت گر جاتے،اس گیٹ سے واپس نکل کر دوسرے گیٹ میں داخل ہوئے ، کچھ فاصلہ طئے کیا تھا ایک زوردار سیٹی بجی۔''اے بڈھا،ادھر کہاں؟ادھر صرف کاروالے لوگ جاتے ہیں،صرف وی۔آئی۔پی سمجھے،چلو،ہٹو،اُدھر جاؤ''، پولیس آفیسر نے ایک جانب اشارہ کیا اور قریب سے گزرتی ہوئی سفید چمچماتی کار کو سیلوٹ کرنے لگا۔

بابا دنیش کو لئے ہوئے تیسرے گیٹ میں داخل ہوئے۔یہاں بابا کو کسی نے نہیں روکا، یہاں بس لوگوں کا اژدہام تھا جن کے درمیان بابا گم ہو گئے ۔بابا آگے بڑھتے چلے گئے، لیکن پچھلے حصے میں بیٹھے لوگوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔''بیٹھ جاؤ......بیٹھ جاؤ......اے بوڑھے میاں بیٹھ جاؤ......''

اور بابا نے بڑی بے چارگی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھا، شاید کوئی انہیں پہچاننے والامل جائے۔ لیکن انہیں کوئی پہچاننے والانہیں ملا۔ ''بیٹھ جاؤ...... بیٹھ جاؤ'' بڈھے کا شور بڑھتا ہی گیا۔ مجبوراً بابا کو کھردری زمین پر ہی پالتی مار کر بیٹھ جانا پڑا۔

قومی ترانے' جھانکی اور تقریر کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ بابا کی نگاہیں سامنے ٹکی ہوئی تھیں لیکن ذہن ماضی کی ان خوشگوار یادوں میں گم تھا، جب کبھی وہ خود لوگوں کی نگاہوں کے مرکز بنے رہتے تھے، لیکن آج وہ بھیڑ میں اس طرح گم ہیں کہ کوئی انہیں پہچاننے والا بھی نہیں ہے۔ بابا کی آنکھوں سے آنسو کا سیلاب امڈ آیا اور بوند بوند ان کی پرانی بوسیدہ شیروانی میں جذب ہونے لگا۔

❁

مانگے کا اجالا

جارج کی ماریا سے شادی ہوئے، آٹھ سال گزر گئے، لیکن اب تک ان کا گھر سونا سونا تھا۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں دونوں نے ایک دوسرے کو ہر پل ہر لمحہ پیار کیا اور وقت جیسے جیسے آگے بڑھتا گیا انہیں امید کے گلشن میں کسی نئے پھول کی آمد آمد کا انتظار رہا۔ اس بار نہیں تو اگلے ماہ ضرور ـــ لیکن ماہ ـــ سال میں بدلتے گئے اور گھر اسی طرح اداس اداس سارہا ـــ صبح سویرے دونوں جاب پر نکل جاتے اور شام گئے گھر آتے تو دن بھر کی تھکان کو دور کرنے والا، کلکاریاں بھرنے والا اپنی توتلی زبان سے طرح طرح کی باتوں سے ہنسانے والا نہیں ہوتا ـــ ایسے میں ٹی.وی. انٹرنیٹ اور کافی وسگریٹ میں بھی کوئی دلچسپی نہیں ہوتی ـــ ریموٹ سے کئی انٹرٹینمنٹ چینل آن ہوتے، لیکن سب کے سب بور لگتے اور پھر ان کی انگلی ریموٹ کے آف بٹن کو دبا دیتی۔

دونوں بستر پر جاتے، لیکن رات گئے تک دونوں کی آنکھوں سے نیند دور بہت دور ہوتی، دونوں کروٹیں بدلتے رہتے اور پھر رات گئے کسی پہر ان کی آنکھیں بند ہوتیں تو خوابوں کے دروازے کھل جاتے ـــ طرح طرح کے خوشنما خواب، کلکاریوں اور خوشیوں سے بھرے خواب..........!

صبح ہوتی تو پھر وہی اداسی ـــ اور غم سے بوجھل لمحے ـــ جارج، ماریا کے چہرے پر بڑھتی پژمردگی دیکھ دیکھ کر پریشان تھا۔ اس کی صحت بھی اثر انداز ہو رہی تھی ـــ اس کا کھلا کھلا

شاداب چہرہ پوری طرح مرجھاتا جارہا تھا— یہ سب دیکھ کر جارج نے کئی ڈاکٹروں سے مشورہ کیا۔ڈاکٹروں نے کئی ٹیسٹ کرائے، کئی ماہ تک علاج کیا،لیکن امیدوں کی کونپلیں نہیں کھلیں،تب ڈاکٹروں نے انہیں ٹیسٹ ٹیوب بے بی حاصل کرنے کا مشورہ دیا اور اس کے حاصل کرنے کے لئے سارے راستے بھی بتائے۔

جارج نے ماریا کی خوشیوں کے لئے سارے دشوار گزار راستوں کو طئے کرنے کا فیصلہ کیا اور مذید وقت ضائع کئے بغیر وہ بھارت کے سفر پر نکل گیا— یہاں پہنچ کر جارج نے کئی ہسپتال کے چکر لگائے اور آخر کار ایک دن ایک ہسپتال میں اسے کامیابی مل گئی— معاملہ طئے ہوجانے کے بعد وہ ایک آدمی کے ساتھ ٹیکسی میں ایک گاؤں کے لئے نکل گیا— کئی گھنٹے کی مسافت طئے کرنے کے بعد ان کی ٹیکسی ایک بستی میں رُکی— ٹیکسی سے اتر کر جارج نے چاروں طرف نظر ڈالی اور اس کی زبان سے بے اختیار نکلا— ''اوہ گاڈ........''

اس کی نگاہوں کے سامنے جھگی، جھونپڑیوں سے پوری بستی آباد تھی۔ان کے ارد گرد کالے کالے، ننگ دھڑنگ بچے تھے، مرد اور عورتیں تھیں اور ان سبھوں کے جسم، بس ہڈیوں کے ڈھانچے تھے۔ایسا لگتا تھا کہ گاؤں کے یہ تمام لوگ تپ دق میں مبتلا ہیں، بھوک اور بیماری سے سبھوں کا گہرا لگاؤ ہے......

جارج کو ساتھ لے کر آنے والے شخص سنجئے کمار نے بھی گاؤں کی بے ثباتی پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور آگے بڑھنے لگا— ایسا لگ رہا تھا کہ یہ گاؤں اس کے لئے اجنبی نہیں تھا— ٹیڑھے میڑھے راستوں اور جھونپڑیوں سے گزرتا ہوا وہ تیزی سے آگے بڑھتا جارہا تھا۔بیچ بیچ میں وہ گاؤں اور یہاں کے لوگوں کے بارے میں جارج سے انگریزی میں بڑی روانی سے بتاتا بھی جارہا تھا— چلتے چلتے وہ ایک بے حد خستہ حال، ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی کے قریب رک گیا— جھونپڑی کے دروازے پر ہی اسے مطلوبہ بوڑھی عورت مل گئی— عورت پر نظر پڑتے ہی سنجئے نے اسے مخاطب کیا— ''کیسی ہے رمیا''؟

رمیا نے سنجے کو پہچاننے کی کوشش کی اور چند ساعتوں بعد ہی اس کی آنکھوں سے جھانکتی

ہوئی اجنبیت ختم ہوگئی اور اس نے نقاہت بھرے لہجہ میں کہا۔۔۔

''ٹھیکے ہیں بابو، ہم نی کے کا، کا ٹھیک اور بے ٹھیک۔۔۔ سب برابر ہے۔۔۔ تو بتاوا، کیسے کیسے ادھر آوے کے''؟

''او ہے کام سے آئے ہیں'' سنجے نے جواب دیا۔

سنجے کی بات سن کر رمیا کی آنکھوں میں چمک سی جا گی۔۔۔ لیکن اسے کچھ تشویش بھی ہوئی۔۔۔ پھر بھی اس نے سنجے سے پوچھا۔۔۔ ''کتنا روپیہ دیب''؟ ''وہی پانچ (۵) ہزار روپئے'' سنجے نے فوراً کہا۔

نا بابو نا۔۔۔ بڑی مہنگائی بڑھ گیلے ہئی، ہمر بیٹوا بھی ابھی تک بیمارے پڑل ہے اور............''

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے، کچھ اور لے لینا'' سنجے نے بلا تاخیر کہا، جیسے وہ رمیا کی اس بات کو سننے کے لئے پہلے سے تیار تھا۔

''نا بابو۔۔۔ بہتے کسٹ اٹھاوے کے پڑے ہے، او گر، ہمرا سب کے۔۔۔ اس بار دس (۱۰) ہجار لگتو''۔ رمیا کی ان باتوں میں اس کا درد کراہ رہا تھا۔ سنجے کو بھی دس ہزار [illegible] ہی لگا۔ اس لئے وہ فوراً تیار ہوگیا۔

''ٹھیک ہے، ہم تیار ہیں۔۔۔ پانچ ابھی لے لو اور پانچ ہزار بعد میں''۔۔۔

سنجے کی رضامندی کو سنتے ہی رمیا، جھونپڑی کے اندر چلی گئی۔۔۔ اس کے اندر جاتے ہی لڑنے جھگڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔۔۔ اور ادھر ان آوازوں سے بے پرواہ سنجے جارج کو بتا رہا تھا۔

یہ رمیا ہے، دیکھنے میں (۷۰) ستر سال کی لگتی ہے، لیکن اس کی عمر بمشکل پچاس سال ہوگی۔۔۔ دراصل غریبی نے کمر توڑ دی ہے۔ اس کے ہسبینڈ کی ڈیتھ ہو چکی ہے، جوان بیٹا ہے، سائیکل رکشہ چلاتے چلاتے اسے ٹی بی ہوگیا ہے۔ اس کی جوان بیوی اور ایک بچہ

ہے— آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں ہے— گاؤں کے پاس ہی ایک رائس مل ہے، صبح جا کر وہ مل کے باہر خراب پھینکے ہوئے چاول میں سے کھانے کے لائق کچھ چاول چنتی ہے، کبھی یہ نہیں ملا تو جنگل کے پھل جمع کرتی ہے اور یہ بھی نہیں ملا، تو کچھ ایسے پیڑ ہیں جن کے چھال کو ابال کر یہ لوگ اپنا پیٹ بھرتے ہیں۔ زیادہ تر ان لوگوں کو ایک ہی وقت کے کھانے پر گزارہ کرنا پڑتا ہے۔ رمیا کی بہو بہت اچھی ہے، اس کا نام سکنا ہے، وہ گاؤں کے باہر نہیں جاتی ہے کہ لوگوں کی نگاہیں اس کے جسم کو بھوکی نگاہوں سے دیکھنے لگتے ہیں۔ یہ بھی خوب ہے کہ ایک بھوکی عورت سے دولت مند لوگ اپنی بھوک مٹانا چاہتے ہیں— اس کا مطلب ہوا کہ بھوکے امیر بھی ہیں اور غریب بھی، بس فرق اتنا ہے کہ................"

سنجے کی بات مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ جھونپڑی کے اندر سے رمیا، اپنی بہو سکنا کا ہاتھ پکڑے باہر نکلی— سکنا کو دیکھ کر جارج کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

سکنا بمشکل بیس (۲۰) بائیس (۲۲) برس کی ہوگی۔ اس کے جسم کے انگ انگ سے جوانی پھوٹ رہی تھی، پیوند لگے بوسیدہ کپڑوں سے اپنے پر شباب جسم کو چھپانے کی کوشش میں بھی وہ کامیاب نہیں تھی— سانولا، سلونا چہرہ— بڑی بڑی آنکھیں، متناسب قد، لیکن چہرے کی تازگی اور شادابی پر غربت نے سایہ ڈال رکھا تھا۔

سکنا کو دیکھتے ہی سنجے نے جارج کی جانب دیکھا جارج نے بھی آنکھوں کے اشارے سے او کے کہا۔

کافی دیر تک سنجے، رمیا اور سکنا کے درمیان باتیں ہوتی رہیں۔ سکنا بڑی مشکلوں سے تیار ہوئی، رمیا کے غضبناک چہرہ کو دیکھ کر وہ قدرے سہم گئی تھی۔

سنجے نے جارج کے دیئے روپیوں کے بنڈل میں سے پانچ ہزار روپے رمیا کی جانب بڑھایا اور کہا یہ لو آدھا اور آدھا بچہ ہونے کے بعد۔

رمیا نے سنجے کے ہاتھوں سے روپے جھپٹ لئے اور کہا— "جاؤ، بابو کل صبح نو بجے آ جانا— ہم دونوں تیار رہب"

رمیا کا جواب سنتے ہی جارج اور بنجے واپسی کے لئے مڑ گئے— ٹیکسی کے قریب آ کر جارج نے ایک بار پھر بستی کو بغور دیکھا اور کچھ سوچتا ہوا، وہ ٹیکسی میں بیٹھ گیا، بنجے پہلے ہی بیٹھ چکا تھا۔ٹیکسی فراٹے بھرنے لگی اور اس کی رفتار سے کہیں زیادہ تیز رفتار جارج کا ذہن دوڑ رہا تھا۔اس کے ذہن میں طرح طرح کے سوالات ڈوب ابھر رہے تھے!!

O

دوسرے دن صبح سویرے پھر دونوں اسی راستے پر سفر کر رہے تھے۔گاؤں پہنچ کر رمیا اور سکنا کو ٹیکسی میں بٹھایا اور طئے پروگرام کے مطابق ہسپتال پہنچے۔ڈاکٹر سے پروگرام طئے تھا۔ ان سبھوں کے ہاسپٹل میں داخل ہوتے ہی ٹیسٹ ٹیوب بے بی کا پروسس شروع ہو گیا۔

تمام مراحل سے گزرنے کے چند روز بعد جارج ،لندن کے لئے روانہ ہو گیا جہاں ماریا بے صبری سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ جارج نے ویسے تو فون پر ماریا کو سب کچھ بتا دیا تھا، پھر بھی ماریا ساری باتیں جارج سے براہ راست سننا چاہتی تھی۔ جارج نے ماریا کو جب ساری تفصیلات بتائیں تو وہ خوشی سے اچھل پڑی اور جارج کو اپنی بانہوں میں بھر لیا اور بے اختیار اس کی زبان سے نکلا— ''ریلی —یو آر گریٹ''

O

پہلے ماریا اور جارج کا جو وقت کاٹے نہیں کٹتا تھا، وہ خوشیوں کی آمد سے بڑی تیزی سے کٹنے لگا۔ جارج ہر دو چار ہفتہ پر بنجے سے فون پر سکنا کی خیریت دریافت کرتا، ساتھ ہی ساتھ بچے کا حال بھی ضرور پوچھتا اور جب بنجے یہ بتاتا کہ—

''ایوری تھینگ از او کے''

تب وہ اطمینان کی سانس لیتا اور ایک نئے جوش وخروش سے گھر کو ننھے منّے مہمان کے لئے آراستہ کرنے لگتا—ماریا نے پہلے ہی ڈھیر سارے کپڑے اور کھلونے مال سے لا کر رکھ لیا تھا۔ دونوں روزانہ دیر تک بچے کے بارے میں گفتگو کرتے ، نام کیا ہوگا، کس اسکول میں پڑھائیگے ، بڑا ہو کر وہ کیا بنے گا۔

O

وقت بڑی تیزی سے گزر گیا اور نو ماہ ہوتے ہی جارج اور ماریا بھارت پہنچ گئے۔ پروگرام کے مطابق سکنا ہسپتال میں داخل ہو چکی تھی، رمیا بھی اس کے ساتھ تھی اور جارج و ماریا کے یہاں پہنچنے کے ایک ہفتہ بعد ہی سکنا نے ایک خوبصورت لڑکا کو جنم دیا۔

بچہ کو دیکھتے ہی جارج اور ماریا کی خوشی سے باچھیں کھل گئیں۔ ماریا نے جارج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا— ''ہی از جسٹ لائک یو''—

جارج نے بھی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''او۔ یس!''

بچہ کو سکنا اپنی بانہوں میں بھرے ہوئے تھی، اچانک بچے نے روتے ہوئے بھوک کا اظہار کیا— سکنا بچے کے منھ کو ماتا کے سوتے سے لگانے لگی، یہ دیکھتے ہی جارج چیخ پڑا— اوہ— نو— نو—

جارج کا مطلب سمجھ کر پاس کھڑے ڈاکٹر نے سکنا کو اس حرکت کے لئے سختی سے منع کیا اور آگے بڑھکر اس نے بچے کو اُٹھا لیا— بچہ بھوک سے لگا تار رو رہا تھا اور سکنا کی ممتا تڑپ رہی تھی— سکنا بے اختیار بستر چھوڑ کر کھڑی ہو گئی اور ڈاکٹر کے پیچھے دوڑتی ہوئی جا کر اس کے پیر پکڑ لئے— اس کی آنکھوں سے زار و قطار آنسو بہہ رہے تھے اور وہ کہہ رہی تھی—

''نا ڈاگڈر بابو..... ہمرا، ایکرا سے الگ نہ کرا، ہم ایکرا بگیر نہ رہب، ہمرا پر دیا کرا، ڈاگڈر بابو............ سکنا کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا تھا اور وہ ڈاکٹر سے اپنے بچے کے قربت کی بھیک مانگ رہی تھی۔

لیکن ڈاکٹر نے اس کی التجا پر کوئی توجہ نہیں دی اور بچہ کو لئے ہوئے ایک دوسرے کمرہ میں چلا گیا، سکنا اسی طرح روتی، تڑپتی رہی— یہ دیکھ کر رمیا کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے اور اس نے سمجھاتے ہوئے سکنا کو پکڑ کر بستر پر لٹا دیا۔ لیکن سکنا کے آنسو تھم نہیں رہے تھے۔

دوسرے دن ماریا اور جارج ہسپتال سے بچے کو لے کر ٹیکسی میں سوار ہو رہے تھے، دونوں نے بچے اور ڈاکٹر کو تھینکس کہا— اندر ہسپتال کے کمرہ کے شیشہ سے سکنا نے جارج

کے ہاتھوں میں بچہ کو دیکھا تو وہ دوڑتی ہوئی باہر نکلی اور چیختی ہوئی ٹیکسی کی جانب دوڑی ـــ'' ناصاحب نا لے جا ہمرا بچوا کے''۔

لیکن سکنا کی اس درد بھری چیخ سے بے پرواہ ـــ ٹیکسی بڑی تیزی سے آگے بڑھی، اس کے سائلنسر سے ڈھیر سارا کالا دھواں نکلا، جس میں سکنا کا پورا وجود معدوم ہو گیا۔

وحشی اور مسیحا کے درمیان

سلمان اپنے باغ کے پیڑ، پودھوں میں پانی کا پائپ لئے آبپاشی کرر ہاتھا کہ اچانک اس کی چھ سال کی گڑیا جیسی بیٹی ماریا جو باغ کے آس پاس پھیلے پھولوں کے درمیان کھیل رہی تھی ،روتی ہوئی اس کے قریب آئی.........پاپا...................پاپا...................۔

سلمان نے جلدی سے پانی کے پائپ کو دور پھینکا اور ماریا کو گود میں اٹھاتے ہوئے بولا۔

''ارے.........ارے..................رے،میری بیٹی رورہی ہے،کیا ہوامیری بیٹی کو؟''

ماریا نے روتے ہوئے سلمان کے سامنے اپنے داہنے ہاتھ کی ایک انگلی بڑھائی اور بتایا یہاں پر بہت درد ہورہا ہے۔

سلمان نے بغور ماریا کی انگلی کو دیکھا اس کی ایک انگلی میں ایک کانٹا چبھا ہوا تھا اس نے جلدی سے اس کانٹے کو نکالا اور پھر ماریا کی آنکھوں کے بہتے ہوئے آنسوؤں کو پوچھتے ہوئے بولا۔

''یہ دیکھو،کانٹا نکل گیا،اب درد ختم ہو جائے گا،اس لئے اب تم چپ ہو جاؤ۔''

یہ کہتا ہوا سلمان ،ماریا کو گود میں اٹھائے اندر اپنے کمرہ میں آگیا اور ڈھیر ساری ٹافیاں اور کھلونے اس کے سامنے رکھ دئے اور چپ کرانے کے لئے طرح طرح کی

باتیں کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد ہی ماریا کی انگلی کا درد کم ہو گیا اور وہ مسکرانے لگی۔

ماریا سلمان کی اکلوتی بیٹی ہے، دو سال قبل تک سلمان، اس کی بیوی رضیہ اور ان دونوں کی محبت و پیار کی مرکز ماریا، ان تین افراد پر مشتمل خاندان کے خوبصورت مکان میں ہر سمت خوشیاں ہی خوشیاں تھیں کہ اچانک ایک دن ان کی ساری خوشیاں بکھر گئیں۔ سلمان اپنے دفتر گئے ہوئے تھے جہاں وہ انجینئر تھے اور بجلی کے اہم پروجیکٹ کو آخری شکل دینے میں مصروف تھے، ان کی مصروفیت کی وجہ کر رضیہ گھر اور باہر کا کام خود ہی کرتی، اس دن ماریا کو آیا کے پاس چھوڑ کر کچھ سامان لانے مارکیٹ گئی تھی کہ اچانک مارکیٹ میں ایک بم بلاسٹ ہوا، کئی لوگوں کے پرخچے اڑ گئے، ان میں رضیہ بھی تھی۔

اس دن سے ماریا کی نظریں ہمیشہ صدر دروازے پر ٹکی رہتیں، ماں اسی دروازے سے اس کے لئے ویڈیو گیم لانے کا وعدہ کر کے گئی تھی۔

وقت دبے پاؤں اپنی رفتار سے آگے بڑھتا رہا، اس حادثہ کو دو سال گزر گئے، لیکن سلمان کو وقت کی یہ رفتار بہت دھیمی لگتی، اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وقت کی رفتار تھم سی گئی ہے وہ سوچتا کہ ماریا جلدی سے بڑی ہو جائے اسکول اور کالج کی تعلیم مکمل ہوتے ہی اسکی شادی کر کے اس کی دنیا بسا دی جائے جہاں وہ اپنے شوہر اور بچوں کے درمیان رچ بس جائے گی اور وہ بے رحم ماضی کو بھول کر حال اور مستقبل کی خوبصورت اور سکون کی وادیوں میں کھو جائے گی۔

لیکن............ایک دن چمکتی تیز دھوپ چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی، اچانک تیز کالی آندھی اٹھی ہر سمت اندھیرا پھیل گیا اور دیکھتے دیکھتے اس کالی آندھی نے سلمان کے باغ کے کئی ہرے بھرے پودوں کو جن میں پھول اور کلیاں لگی تھیں جڑ سے اکھاڑ دئے۔

اسی دن ماریا کو پیٹ میں درد ہوا اور حسب عادت سلمان پریشان ہو گئے۔ فوراً ہی ماریا کو اپنی گاڑی میں بٹھایا اور آندھیوں سے مقابلہ کرتے ہوئے اپنے فیملی ڈاکٹر اور قریبی دوست ڈاکٹر سدھاکر کے گھر پہنچ گئے۔ موبائل سے اپنے آنے کی اطلاع ڈاکٹر سدھاکر کو دے دی

تھی اس لئے ڈاکٹر ان کے منتظر تھے اور ان کے پہنچتے ہی ماریا کا چیک اپ کیا اور سلمان کی پریشان ہو جانے کی عادت سے واقف ہونے کی بناء پر اس نے کہا۔

''ارے سلمان تم خواہ مخواہ پریشان ہو جاتے ہو، کچھ نہیں بس ذرا گیس پرابلم ہے، میں کچھ دوائیں اور انجکشن دے رہا ہوں، کل صبح تک ٹھیک ہو جائے گی۔''

سلمان بھی ڈاکٹر کی اس طرح کی گفتگو کا عادی تھا، دراصل ماریا کی ذرا بھی تکلیف اس کے لئے ناقابل برداشت ہوتی اور وہ بے چین ہو جاتا۔

سلمان، ماریا کو واپس گھر لے آئے۔ انجکشن اور دواؤں کے اثر سے رات آرام سے ماریا سوئی۔ لیکن صبح ہوتے ہی وہ پھر پیٹ میں شدید درد سے کراہنے لگی۔

سلمان نے ڈاکٹر کو فون کیا'' ڈاکٹر اس وقت ماریا کی تکلیف زیادہ بڑھ گئی ہے، اس لئے پلیز آپ میرے گھر آجائیں۔''

ڈاکٹر سدھا کر نے بھی پہنچنے میں دیر نہیں کی اور پہنچتے ہی بغور چیک اپ کیا، انجکشن اور دوائیں دینے کے بعد بھی درد ختم نہیں ہوا۔ اس لئے ڈاکٹر کو تشویش ہوئی۔ اس نے کچھ ٹیسٹ لکھے اور رپورٹ آنے کے بعد دوائیں بدلنے کی بات کہی اور وقتی طور پر تکلیف کم کرنے کا ایک انجکشن دے کر ڈاکٹر اپنے ہاسپٹل کے لئے روانہ ہو گیا۔

چند دنوں بعد ہی ڈاکٹر کے پاس سارے ٹیسٹ کی رپورٹ آگئیں اور رپورٹ کو جیسے ہی ڈاکٹر نے دیکھا اس کی زبان سے بے اختیار نکلا .... اوہ............ نو'' رپورٹ مے بی رونگ (Report may be wrong).

ڈاکٹر سدھا کر نے خود کو سمجھانے کے لئے یہ جملہ کہا ضرور لیکن درحقیقت رپورٹ دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے، اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور کرسی کی پشت سے سر ٹکا دیا، چہرے پر اس کے پسینے کی بوندیں نمودار ہو گئی تھیں۔

ٹھیک اسی وقت فون کی گھنٹی بجی، اس نے کانپتے ہاتھوں سے فون کا ریسور اٹھایا اور مضمحل آواز میں کہا'' ہیلو............''

دوسری جانب سے آواز آئی۔

''میں سلمان بول رہا ہوں، ماریا کے ٹیسٹ کی رپورٹ آگئی ڈاکٹر؟''

ڈاکٹر خاموش رہا، جواب دے تو کیا، سلمان نے پھر اپنا سوال دہرایا۔تب ڈاکٹر نے کہا''ہاں آگئی ہے، بٹ آئی ایم ناٹ ایگری وتھ دس رپورٹ۔''

''کیا مطلب؟ سلمان نے گھبراہٹ بھرے لہجے میں پوچھا۔

''آپ شام میں مجھ سے ملیں''،اور یہ کہہ کر ڈاکٹر نے فون رکھ دیا۔

ڈاکٹر سارا دن مضطرب رہا،اس نے کئی سینئر ڈاکٹروں سے ڈسکس کیا لیکن کہیں سے بھی اسے امید کی کرن نظر نہیں آئی ،وہ بے چینی کے عالم میں ٹہلتا رہا۔شام ہوتے ہی سلمان ڈاکٹر سے ملنے پہنچ گئے اور ڈاکٹر کو پریشان دیکھا تو اس کے ذہن میں کسی انہونی کے خدشہ نے سر ابھارا۔

''کیوں ڈاکٹر کیا بات ہے، بہت پریشان لگ رہے ہو؟''

''ارے نہیں سلمان''ڈاکٹر نے اپنے ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔''دراصل رپورٹ............''

'کیا رپورٹ...........ڈاکٹر صاف صاف کہو۔''

''رپورٹ اچھی نہیں ہے۔''

ڈاکٹر کا یہ جملہ کسی بم کے دھماکہ سے کم نہیں تھا۔

''کیا، کیا ہوا، میری ماریا کو............؟؟؟''سلمان چیخ پڑے۔

ڈاکٹر سدھا کر چند ساعت خاموش رہے اور پھر لڑکھڑاتی زبان سے اس نے کہا ......ماریا کے آنت (Intestine) میں کینسر ہے اور وہ بھی کافی ایڈوانس اسٹیج میں ہے۔''

''نہیں..........نہیں ڈاکٹر ایسا کیسے ہوسکتا ہے رپورٹ ضرور غلط ہے،تم پھر ٹیسٹ کراؤ۔''

''ہاں میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

دوسرے ہی دن ایک بار پھر ماریا کے کئی طرح ٹیسٹ کے لئے سیمپل لئے گئے۔ اور چند دنوں بعد ہی رپورٹ آ گئیں اور یہ ساری رپورٹ وہی تھیں جو پہلے تھیں۔''

ڈاکٹر رپورٹ دیکھ کر ایک بار پھر سکتے میں آ گیا، وہ سوچنے لگا اب کس طرح وہ سلمان اور ماریا کا سامنا کرے گا اور اس سے پہلے کہ سلمان کا رپورٹ جاننے کے لئے فون آئے یا وہ خود آئے ڈاکٹر خود ہی سلمان سے ملنے نکل پڑا۔ راستے میں رک کر اس نے شہر کے سب سے بڑے اور مشہور ڈاکٹر ششانک سے ڈسکس کیا اور انھیں بھی ساتھ لے لیا۔

سلمان نے ڈاکٹر سدھاکر اور ڈاکٹر ششانک کو گھر میں داخل ہوتے دیکھا تو اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ خبر اچھی نہیں ہے۔

سلمان نڈھال ہو کر ایک صوفہ پر بیٹھ گیا اس کے قریب ہی دونوں ڈاکٹر بھی بیٹھ گئے۔ تینوں دیر تک خاموش بیٹھے رہے اور گفتگو کا سرا ڈھونڈھتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد خاموشی کو توڑتے ہوئے ڈاکٹر سدھاکر، سلمان سے مخاطب ہوا اور پوچھا۔

''ماریا کہاں ہے؟''

ڈاکٹر کا یہ جملہ سلمان کی سماعت سے ٹکرایا وہ خلاء میں گم تھا۔ اچانک وہ چونکا اور بولا ماریا، ماریا اوپر اپنے کمرے میں ہے مجھ سے اس کی تکلیف اس کی کراہ اس کی بے چینی اور بے بسی دیکھی نہیں جاتی ڈاکٹر، پاپا بہت درد ہے.......... پاپا.......... پاپا.......... کی رٹ لگائے ہوئے ہے۔ کچھ کیجئے ڈاکٹر، ماریا آپ کی صرف پیشنٹ نہیں ہے وہ آپ کی بیٹی بھی ہے، اسے اس کی ہنسی، اس کی مسکراہٹ اور اس کی خوشیاں لوٹا دیں ڈاکٹر، پلیز ڈاکٹر۔ یہ کہتے کہتے سلمان پھپھک کر بالکل بچوں کی طرح رو پڑے۔

ڈاکٹر سدھاکر اور ڈاکٹر ششانک دونوں جلدی سے صوفہ پر سے اٹھے اور دونوں نے سلمان کے کاندھے پر محبت بھرا ہاتھ رکھا اور کہا......

''ہمت سے کام لیں............''

سلمان بہت دیر تک روتے رہے، دونوں ڈاکٹر ڈھارس بندھاتے رہے تھوڑی دیر بعد تینوں ماریا کے کمرے میں داخل ہوئے، ماریا سامنے ہی بستر پر پڑی کراہ رہی تھی، اسے دیکھ کر ڈاکٹر سدھا کر چونک پڑے۔ چند دنوں میں ہی ماریا کا گلابی اور شاداب چہرہ زرد پڑ چکا تھا، اس کی بڑی بڑی چمکتی آنکھیں بے رونق ہو گئی تھیں، اس کا بھرا بھرا جسم ہڈی کے ڈھانچے میں تبدیل ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر سدھا کر کو دیکھ کر اس کے سوکھے ہوئے ہونٹ ہلے۔ ڈاکٹر انکل ....بہت درد ہے............۔ اس کے ان الفاظ میں اتنا درد تھا کہ ڈاکٹر سدھا کر کی آنکھیں بھر آئیں وہ جلدی سے ایک کنارے ہو گئے اور اپنی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو اپنے رومال میں جذب کرنے لگے، سلمان بھی وہاں پر سے ہٹ گئے۔

ڈاکٹر ششانک جو کئی طرح کے آلے لے کر آئے تھے ماریا کا تھوڑو چیک اپ کرنے کے بعد ایک بار پھر تمام رپورٹ کو بغور دیکھا۔ ان کے چہرہ سے مسلسل مایوسیاں جھلک رہی تھیں۔ اس درمیان ڈاکٹر سدھا کر اور سلمان اپنے اپنے جذبات پر قابو پا کر ڈاکٹر ششانک کے بے حد قریب آ گئے۔ ڈاکٹر ششانک بہت دیر تک بیٹھے سوچتے رہے اور پھر وہ ڈاکٹر سدھا کر سے مخاطب ہوئے۔

''دس از اے کیس آف ایوتھینیسا (Euthanasia)۔''

ڈاکٹر ششانک کی یہ بات سن کر ڈاکٹر سدھا کر اور سلمان کو ایسا لگا جیسے ان کے کانوں کے قریب ایک زوردار بجلی کڑکی ہو۔

ڈاکٹر ششانک یہ کہتے ہوئے واپسی کے لئے مڑ گئے، تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر سدھا کر بھی اپنی آنکھوں کے بہتے ہوئے آنسوؤں کو پوچھتے ہوئے اپنے گھر روانہ ہو گئے۔

ماریا کو دی گئیں تمام ہائی ڈوز دوائیں اور انجکشن نے کام کرنا بند کر دیا۔ تکلیف کی شدت بڑھتی جا رہی تھی اور جیسے جیسے تکلیف کی شدت بڑھ رہی تھی اس کی کراہ اب چیخ میں بدل گئی تھی۔ پوری پوری رات پاپا............ بہت درد ہے، پاپا............ آہ............ پاپا............۔

ماریا کی مسلسل چیخ اورکراہ ۔ڈاکٹرششانک کا یہ جملہ''دس ازاے کیس آف ایوتھینیسیا......''ایک دوسرے سے گڈ مڈ ہوکرسلمان کے دل و دماغ پرہتھوڑے برسا رہے تھے۔

رات کا آخری پہر آگیا،سلمان کسی پتھر کی طرح ساکت ہوکرمسلسل ماریا کوتک رہا تھا اور پھراس نے اچانک ایک فیصلہ کیا،بڑی تیزی سے الماری کھولی اور بوکس میں رکھے ریوالور کو نکالا،اس کے اندر کی گولیوں کو چیک کیا پوری چھ گولیاں تھیں۔وہ ریوالور لئے ماریا کے قریب آئے،اسے خوب پیار کیا،اس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور پھراس کی کنپٹی پرریوالور کی نوک رکھ کرٹریگر دبادیا،ریوالور سے ٹھائیں کی ایک آواز کے ساتھ ہی ماریا کی بے دم سی چیخ نکلی اوراس کا سرتکیہ سے نیچے ڈھلک گیا،چند ساعت بعد سلمان نے ریوالورکواپنی کنپٹی پررکھا اور ٹریگر پررکھی انگلی کودبادیا،ایک ٹھائیں کی آواز کے ساتھ ہی ایسی دلدوز چیخ ابھری کہ سلمان کے باغ کے پیڑوں پربیٹھے پرندے پھڑپھڑا کراڑے اورآسمان کی وسعتوں میں کھو گئے۔

دشمن روشنی کے

آج میں تقریباً بیس برسوں بعد اپنے آبائی گاؤں شانتی نگر میں داخل ہوا ہوں۔

طیارہ کے سفر کے بعد ٹرین کی لمبی مسافت اور پھر ٹیکسی کی اوبڑ کھابڑ روڈ پر ہچکولے ...... عام حالات میں تو میں تھک کر چور ہو جاتا، لیکن اپنے لوگوں سے ملنے اور اپنے پرانے شہر کو دیکھنے کی خوشی نے سفر کی تھکان کو قریب نہیں آنے دیا تھا ... میری بیوی کے چہرے پر بھی خوشیوں کا پرتو جھلک رہا تھا، ہاں دونوں بچے ہم دونوں کی اندرونی خوشی سے بے خبر کافی تھکے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔

ٹیکسی روڈ کی خستہ حالت کی وجہ کر کافی دھیمی رفتار سے چل رہی تھی، اس کی پچھلی سیٹ کی دائیں جانب میری بیوی بیٹھی تھی درمیان میں میری بیٹی ثمینہ، بائیں جانب کی کھڑکی کے قریب' میں بیٹھا تھا اور بیٹا اگلی سیٹ پر براجمان تھا۔ سبھوں کی نگاہیں شہر کی مختلف عمارتوں اور چوراہوں کو بغور دیکھ رہی تھیں۔ مجھے کچھ ایسی دوکانیں اور عمارتیں نظر آئیں جو نئے رنگ و روپ لے چکی تھیں، انہیں دیکھ کر نہ جانے کیوں میں بجھ سا جاتا، لیکن جب مجھے کوئی مکان یا دوکان اُسی پرانی حالت میں نظر آتے، انہیں دیکھ کر مجھے بڑا اچھا لگتا، جی چاہتا ٹیکسی رکواؤں اور بے اختیار اس پرانی دوکان و مکان کے قریب پہنچ جاؤں اور ان جگہوں کو بہت قریب سے دیکھوں، چھوؤں، جہاں پر کبھی کسی لمحہ میرا لمس تھا' میرے ابا اور دادا جان کو جن در و دیوار نے دیکھا تھا۔

میں ان ہی احساسات و جذبات کے تلاطم میں ڈوب ابھر رہا تھا کہ اچانک ایک چوراہے پر ایک نئے مجسمہ کو دیکھ کر میں چونک پڑا، بے اختیار میں نے ٹیکسی رکوائی اور ٹیکسی کا دروازہ

کھول کر تقریباً دوڑتا ہوا اس کے قریب گیا، اور نزدیک پہنچ کر میں نے جو کچھ دیکھا...... اسے دیکھ کر میرے خوشیوں سے بھرے احساسات و جذبات کی ساری روشن قندیلیں اچانک بجھ گئیں۔

میں بہت ہی تھکے قدموں سے واپس آیا' بجھے دل سے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور بڑی خاموشی سے اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

میری اس حالت کو دیکھ کر میری بیوی اور بچوں نے ایک ساتھ سوال کیا......

''کیوں' کیا ہوا''

''نہیں کچھ نہیں' بس یوں ہی...... میری آواز میں نقاہت تھی، بے دلی سے جواب دے کر سیٹ کی پشت سے ٹیک لگالی اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

اپنی آنکھیں میں نے ضرور موند لی تھیں لیکن میرے دل و دماغ میں برسات کی موسلا دھار بارش میں جیسے بجلیاں کوندتی ہیں ویسی ہی بجلیاں کوندنے لگیں یہ بجلیاں اندھیری رات کو لمحہ بھر کے لئے روشن تو ضرور کر دیتی ہیں لیکن ان کی کرخت اور بھیانک آواز پورے وجود کو دہلا کر رکھ دیتی ہیں............ کوندتی ہوئی ان بجلیوں کی روشنی میں میری یادیں جھلملانے لگیں، وحشتناک اور ہیبت ناک۔

اب سے بیس سال قبل اچانک میرے اوپر ایک بجلی ایسی گری کہ میرے پورے وجود کو بکھیر دیا...... اور میں اپنے سینے پر اپنی بے بسی اور بے کسی کا پہاڑ لئے اپنی بیوی کے ساتھ اس شہر کو ہی نہیں ملک کو بھی خیر آباد کہنے پر مجبور ہوا۔

میری بیوی نرگس، دو سال کا پیارا اور خوبصورت سا بیٹا کیف اور میں...... زندگی بڑی پُر بہار تھی...... باپ، دادا کی قائم کی ہوئی تجارت کو میں نے اپنی بھر پور محنت سے ترقی کی بلندیوں پر لے گیا تھا...... اور ترقی کی یہی بلندیاں، میرے لئے مصیبتوں کا پہاڑ بن گئیں۔ رام اوتار سنگھ جیسے نیک ایماندار اور ہر کے دکھ سکھ کے ساتھی...... جو شہر کے نمائندہ بھی تھے، ان سے میری قربت تھی۔ ان کا اکثر میری دوکان پر آ کر بیٹھنا چائے پینا، پان کھانا اور

خوش گپیاں کرنا، شاید...... شاید۔

نئے انتخاب میں رام اوتار جی کے مقابلے میں پشو پتی کھڑا ہو گیا تھا...... جس دن یہ خبر پھیلی، لوگوں نے دبی زبان میں خوب مذاق اڑایا، ہونھ کہاں رام اوتار جی اور کہاں وہ موالی غنڈہ، قاتل اور زانی پشو پتی...... کمبخت کی ضمانت بھی نہیں بچے گی......

لیکن جب الیکشن کا نتیجہ سامنے آیا تو شہر کا ہر شخص حیرت زدہ تھا، یہ کیسے ممکن ہو گیا...... یہ تو ناممکن تھا لیکن غنڈوں کی طاقت اور روپئے کی حِدت نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا...

راتوں رات کایا پلٹ ہو گئی...... پہلے وہ جو جرائم انتظامیہ کے خوف سے چوری چھپے کرتا تھا، وہ اعلانیہ کرنے لگا، آئے دن نوجوان لڑکیاں اغواء ہونے لگیں، دوکانوں، مکانوں، بینکوں میں ڈاکے پڑنے لگے، قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو گیا...... شہر کے لوگ خاموش تماشائی بنے ہوئے تھے اور انتظامیہ پشو پتی کی حفاظت میں مستعد تھا۔

ایسا لگنے لگا، جیسے پورے شہر پر کالے بادل چھا گئے ہوں اور کسی سمت سے بھی روشنی کی کوئی کرن نہیں، ہر طرف اندھیرے کی حکمرانی......

اسی اندھیرے میں اچانک ایک دن میرے اوپر بھی بجلی کڑکی اور میں کانپ کر رہ گیا...... میرا خوبصورت اور پیارا سا دو سال کا بیٹا کیف اغوا کر لیا گیا...... اور دوسرے ہی دن پچاس لاکھ روپئے کے مطالبہ کا خط ملا......

میں ایک بڑی دوکان کا مالک ضرور تھا، لیکن پچاس لاکھ کی رقم دینا میرے لئے ناممکن تھا۔ میں نے اغواء کاروں سے رحم کی بھیک مانگی، مدد کے لئے انتظامیہ کے دروازے کھٹکھٹائے...... لیکن میری صدا بے اثر رہی۔

میرے دوستوں نے مشورہ دیا کہ اگر اپنے بیٹے کی زندگی چاہتے ہو تو کسی طرح انتظام کر کے پچاس لاکھ روپئے دے دو ورنہ تمہارا کوئی سننے والا نہیں، یہ شہر ایسے ہی لوگوں کا شہر ہے جہاں سب کے سب اندھے، بہرے اور گونگے ہو گئے ہیں لوگ دیکھتے ضرور ہیں لیکن کچھ دکھائی نہیں دیتا، سنتے ہیں لیکن کچھ سنائی نہیں دیتا، خوف و دہشت سے تمام لوگوں کی قوت

گویائی بھی سلب ہوگئی ہے۔

میں مضمحل چہرہ اور بوجھل قدموں سے گھر واپس آ گیا...... میری بیوی غم اور صدمے سے نڈھال تھی اور اس وقت کچھ امید اور آس لئے مسلسل داخلی دروازے کو تک رہی تھی......اور مجھے اس طرح خالی ہاتھ لوٹتا دیکھ کر، وہ چیخ پڑی...... کیا ہوا؟ کہاں گیا میرا بیٹا؟ کمبختوں نے اُسے نہیں چھوڑا؟ مجھے میرا بیٹا لا دو............ مجھے میرا بیٹا لا دو، کسی بھی حال میں، کسی بھی قیمت پر...... میرا بیٹا لا دو......! اس کی آواز میں اس قدر درد و کرب تھا کہ میں لڑکھڑا گیا۔

میں ہر جانب سے مایوس اور نامراد ہو گیا، تو بڑی مشکلوں سے پانچ لاکھ کی رقم لے کر اغواء کاروں کی بتائی جگہ پر پہنچا' لیکن پچاس لاکھ کی جگہ پانچ لاکھ کی رقم دیکھ کر اغواء کاروں نے میرے اوپر خوب طنزیہ قہقہے لگائے اور کہا ''اتنے سے کام نہیں چلے گا'' جتنا کہا گیا ہے اتنا لے کر آؤ ورنہ...... لفظ ''ورنہ'' میں کون سی دھمکی پوشیدہ تھی یہ سمجھ کر ہی میں کانپ گیا، میں نے ان لوگوں سے بڑی منت ساجت کی لیکن پتھر بھی کہیں پگھلتا ہے؟

ان حالات میں میرے لئے پوری دوکان فروخت کر دینے کے سوا دوسرا کوئی چارا نہیں تھا، اور میں نے بے رحم حالات کے آگے سپر ڈالی دی اور پوری دوکان کو فروخت کر دیا...... پورے دس لاکھ کی رقم ملی اور میں پندرہ لاکھ روپے لے کر مطلوبہ جگہ پہنچا...... لیکن اغوا کاروں کے انتظار کی گھڑیاں ختم ہو چکی تھیں...... مجھے اس جگہ اپنے ننھے سے بیٹے کیف کی سر کٹی ہوئی لاش ملی' اس کی آنکھیں کھلی تھیں جیسے وہ کچھ پوچھنا چاہ رہا ہو۔ اس حالت میں اسے دیکھتے ہی ایک دلخراش چیخ میرے منہ سے نکل گئی اور میں بے اختیار اس سے لپٹ پڑا۔

شہر میں میرے بیٹے کے قتل کے واقعہ کا چرچا کئی دنوں تک رہا لیکن حیرت واستعجاب کسی کو نہیں تھا، اس لئے کہ لوگ ایسے حادثات اور واقعات سننے، دیکھنے اور جھیلنے کے عادی ہو گئے تھے۔

کئی ماہ تک ہم لوگ غموں سے نڈھال رہے اور آخر کار ایک دن ہم نے فیصلہ کر لیا، اس شہر ہی کو نہیں بلکہ اس ملک کو ہی چھوڑ دینے کا......اور............اور............!

دوسرے ملک میں پہنچ کر ہم دونوں نے نئے سرے سے اپنی زندگی کو سجانے اور سنوارنے کی کوشش کی...... یہیں بیٹی شمینہ اور پھر بیٹا شہزاد کی پیدائش ہوئی...... حال نے ماضی کے دُھندلکوں کو بھلانے میں کافی مدد کی...... لیکن اکثر کیف کی کسک بدن میں جھرجھری پیدا کر دیتی...... چند برسوں بعد ایک دن ہمارے انور بھائی نے فون پر بتایا کہ پشوپستی کا کسی نے بڑی بے رحمی سے قتل کر دیا...... اس دن اس خبر پر ہم دونوں بے حد مسرور نظر آئے کہ آخر کار وہ اپنے کیفرِ کردار کو پہنچ گیا۔

لیکن آج...... جب میں بیس برسوں بعد یہاں آیا ہوں اور ایک چوراہے پر جو مجسمہ مجھے نظر آیا، اسے دیکھ کر میں انگشت بدنداں رہ گیا...... ٹھیک چوراہے پر جہاں پر میں ٹیکسی سے اترا تھا، وہاں پر میں نے دیکھا پشوپتی کا قدِ آدم پتھر کا مجسمہ کھڑا تھا اور اس کے ٹھیک نیچے لکھا تھا...... ''اَمر شہید پشوپتی، جن کا جیون ہمارا آدرش ہے''

اچانک جھٹکے سے ٹیکسی رُکی' انور بھائی ٹیکسی کا گیٹ کھول کر مجھے آواز دے رہے تھے، میں چونک پڑا...... بوجھل قدموں سے نیچے اترا اور انور بھائی گلے لگ گئے...... میں انہیں کنارے لے گیا اور پوچھا یہ چوراہے پر پشوپتی کا مجسمہ دیکھا......

ہاں تو اس میں حیرت اور تعجب کی کون سی بات ہے اب تو تمہیں یہاں ہر چوراہے پر ایسے ہی چہروں کے مجسمے اور کتنے نظر آئیں گے۔

عزّت دار

اس لڑکے نے ہم لوگوں کا جینا دوبھر کر دیا ہے، کمبخت پیدا ہوتے ہی کیوں نہ مر گیا، ایسی اولاد سے تو اچھا تھا کہ بے اولاد ہی رہتی، خاندان کی ناک کٹوادی ہے، اس منحوس......''

اختر میاں جیسے ہی گھر میں داخل ہوئے، انہیں اپنی بیگم کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی، وہ سمجھ گئے کہ ضرور آج پھر صاحبزادے نے محلّے میں کوئی فتنہ برپا کیا ہے اور لوگ شکایت کے ساتھ ساتھ دو چار کھری کھوٹی اس کی ماں کو سنا گئے ہیں، ورنہ دھان پان سی نحیف ولاغر بیگم کی اتنی تیز آواز......

اختر میاں نے سب کچھ سمجھ کر اپنی سائیکل باہر کے برآمدے میں کھڑی کی اور گھر کے اندر داخل ہوئے۔ ان کے داخل ہوتے ہی بیگم کی آواز کو جیسے بریک لگ گیا اور صاحب زادے جو سر جھکائے کھڑے تھے، بھاگتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

ایسا کیوں ہوا؟ اختر میاں، اس بات کو بھی اچھی طرح سمجھتے تھے کہ صاحبزادے کے اس قدر بگڑنے کی ذمّہ دار اس کی ماں ہی تھی۔ بے جالاڈ پیار اور شرارت پر ان کا یہ فرمان کہ ابھی بچہ ہے بڑا ہوگا تو ٹھیک ہو جائے گا، لیکن بچہ جیسے جیسے بڑا ہوا ویسے ویسے اس کی شرارت بھی بڑھتی گئی اور اب تو وہ گھر میں کم باہر ہی زیادہ شرارت کر رہے تھے۔ شرارت نہیں شرارت تو معصوم بچے کیا کرتے ہیں۔ اب وہ آوارہ گردی اور غنڈہ گردی پر اتر آئے تھے۔ شاید ہی کوئی دن ایسا گزرتا ہوگا، جس دن اس کی شکایت کرنے، دھمکی دینے اور برا بھلا کہنے محلّے کے

لوگ نہ آتے۔ اکلوتا بیٹا جو ٹھہرے...... ماں کے ساتھ ساتھ اختر میاں کی بھی شدید خواہش تھی کہ بیٹا خوب پڑھے لکھے۔ بڑا آدمی بنے، نام کمائے، لیکن یہ خواب بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا پڑھائی سے وہ ہمیشہ دور دور ہی رہے۔ جب کبھی اختر میاں سختی کرتے یا باز پرس کرتے تو ماں دوڑتی آتیں کیوں آپ سزا دے رہے ہیں، ابھی بچہ ہے، بڑا ہوگا...... اور بڑا ہو کر اس نے اس طرح نام روشن کیا کہ آئے دن محلے والوں کی کھری کھوٹی باتیں اور گالیاں سننے کو مل رہی تھیں۔

اختر میاں خاموشی سے اپنے کمرے میں ایسے داخل ہو گئے جیسے انہوں نے کچھ سنا ہی نہ ہو اور جا کر اپنے بستر پر ڈھیر ہو گئے۔ دن بھر کی تھکان، پرائیویٹ فرم کی کلرکی، کسی کولہو کے بیل کی طرح ہوتی ہے۔ بدن کے رگ رگ سے خون نچوڑنے کے بعد ہی وہ پہلی تاریخ کو ایک ہزار روپئے یوں ہتھیلی پر رکھتے، جیسے سارے زمانے کی خوشیاں انہیں سونپ رہے ہوں۔ اس مہنگائی کے دور میں ایک ہزار روپے ایسے غائب ہو جاتے جیسے گرم توے پر پانی کا ایک قطرہ...... اور پھر پورا مہینہ بک جھک، ٹینشن، ہنگامہ...... کبھی بیوی سے جھڑپ، کبھی بیٹے کو پھٹکار کبھی اکلوتی بیٹی پر غصہ اور کبھی...... جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اختر میاں کی صحت جواب دے رہی تھی۔ چالیس سال کی عمر میں ہی وہ ساٹھ پینسٹھ برس کے لگنے لگے تھے۔ لاغر نحیف جسم، گالوں پر جھریاں، سفید بال۔ کون کہہ سکتا تھا کہ کبھی اختر میاں بھی ایسے خوبرو نوجوان تھے کہ کئی حسین لڑکیاں ان پر جان نچھاور کرنے کو تیار رہتی تھیں۔ لیکن ظالم وقت اور حالات نے انہیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ اختر میاں نے بی۔اے میں داخلہ لیا ہی تھا کہ اچانک والد چل بسے اور اپنے ساتھ گھر کی خوشیاں بھی لیتے گئے اور ان کے دیکھے ہوئے سارے خواب ریزہ ریزہ ہو کر ان کے پورے وجود کو لہولہان کر گئے اور وہ ایک ایک ریزہ کو اپنے لہو لہان جسم سے نکالنے میں منہمک ہو گئے کہ بدن سے رستے ہوئے خون بند ہو جائیں تو وہ پھر خوشیوں کو سمیٹنے میں لگ جائیں اور خوشیوں کو اپنی مٹھیوں میں قید کر لیں، لیکن خوشیاں ان کی مٹھیوں میں ریت کی طرح پھسل جاتیں۔ خوشیاں سمیٹنے میں جب وہ ناکام رہے تو وہ خود کو

سمیٹنے کی کوشش کرنے لگے ویسے بھی خاندان کے لوگ ان کی غربت اور مفلسی دیکھ کنارہ کش ہوتے گئے۔ اس لئے اختر میاں مزید سمٹ کر رہ گئے۔ میاں بیوی، ایک بیٹی اور ایک بیٹا۔ شادی کے بعد پہلی بیٹی پیدا ہوئی تھی، جس کی خبر سن کر وہ بے اختیار کراہ اٹھے تھے۔ ان کی نظروں کے سامنے جوان بیٹی کا دکھ جھیلتے والدین کے سوکھے اور زرد چہرے گھومنے لگے تھے۔ بر کی تلاش اور جہیز کی لمبی فہرست وہ کہاں سے پورا کر سکیں گے لیکن انہوں نے ذہن کو جھٹک دیا تھا کہ ابھی بہت دیر ہے، ابھی سے اس فکر کا سایہ اس معصوم بچی پر کیوں پڑنے دوں اور یہ سوچ کر وہ آگے بڑھے تھے اور بے اختیار بچی کو گود میں اٹھا کر پیار کرنے لگے تھے۔ ...... ہاں بیٹے کی پیدائش پر وہ بے حد خوش ہوئے تھے اور اپنے دفتر سے قرض لے کر مٹھائیاں تقسیم کی تھیں۔ انہیں یقین تھا کہ میرا یہ بیٹا برسوں سے پڑے اداس اور خاموش گھر کے چاروں طرف خوشیوں کے چراغ روشن کردیگا اور میرا یہ سونا سونا، بے جان سا گھر جگ مگ جگ مگ کر اٹھے گا، بیٹا بڑا آدمی بنے گا، بڑی شان و شوکت ہوگی، بڑے بڑے لوگ آئیں گے اور......اور......

لیکن قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔ اختر میاں نے اپنی اوقات سے کہیں زیادہ بیٹے کی فرمائشوں اور خواہشوں کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ خود تکلیف اٹھائی مگر بیٹے کو اس محرومی کا شکار نہ ہونے دیا۔ ماں نے بھی بیٹے کے ہر مطالبہ کو پورا کرنے کی کوشش کی، لیکن ......اس کا نتیجہ جو سامنے آیا وہ یقینی طور پر بے حد حوصلہ شکن تھا۔ برائی کی طرف بڑھتے بیٹے کے قدم سے اختر میاں اور اس کی بیگم ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرنے لگے۔ ماں نے پہلے ہی سپر ڈال دی تھی اور اپنی شکست تسلیم کرتے ہوئے ایک دن کہہ دیا تھا کہ بے شک یہ اسی لاڈ پیار کا نتیجہ ہے کہ آج اس حال کو پہنچا، ورنہ کس کی مجال کہ کوئی گھر آ کر بدزبانی کر جائے لیکن اب تو اپنے اس نالائق اولاد کی وجہ کر گالیاں بھی سننا پڑ رہی ہیں۔ ایسی ذلت اور رسوائی کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

اختر میاں اپنے بستر پر لیٹے انہیں خیالات میں گم تھے کہ بیگم نے چائے لا کر دی۔ ان کا

چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ بہت روئی ہیں، ان کا اداس اور غمگین دیکھ کر وہ اپنے غصہ کو پی گئے کہ اندر ہی اندر ٹوٹی اور بکھری ہوئی اس عورت سے کیا شکوہ اور غصہ کروں۔ اختر میاں نے انہیں اپنے قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا، لیکن ابھی وہ ان کے قریب ٹھیک سے بیٹھ بھی نہیں پائی تھیں کہ اچانک باہر دروازے پر دستک ہونے لگی۔ چائے کی پیالی بستر پر چھوڑ کر اختر میاں باہر دروازے کی جانب دوڑے اور دروازہ کھول دیا...... باہر پولیس کھڑی تھی، ساتھ میں محلے کے کچھ لوگ بھی تھے دروازہ کھول کر ابھی پوری بات سمجھ بھی نہیں پائے تھے کہ پولیس انہیں ایک طرف دھکا دیتی ہوئی گھر کے اندر داخل ہوگئی۔ اختر میاں چیخنے لگے یہ کیا بدتمیزی ہے۔ یہ کیا بے ہودگی ہے۔ کس کے حکم سے آپ لوگ میرے گھر میں داخل ہو رہے ہیں، کون سا وارنٹ ہے آپ کے پاس۔ لیکن پولیس والوں نے ایک نہ سنی اور دھڑ دھڑاتے ہوئے گھر میں داخل ہوگئے۔ اختر میاں نے پلٹ کر دیکھا، پولیس ارشد کے کمرے میں داخل ہو رہی تھی اور بیگم برآمدہ کے ایک پایہ کے سہارے بت بنی کھڑی تھیں۔ ان کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیلی ہوئی تھیں اور چہرہ بالکل زرد تھا اور پھر انہوں نے دیکھا کہ پولیس ارشد کو پکڑے لئے جا رہی ہے، تو وہ چیخ پڑیں۔ نہیں نہیں، چھوڑ دو میرے بیٹے کو۔ اب یہ غلطی نہیں کرے گا میں اس کا وعدہ کرتی ہوں۔ اس کی جو سزا ہو مجھے دے دو لیکن پولیس والوں نے ایک نہ سنی۔ اختر میاں تو جیسے پتھر کے مجسمہ میں تبدیل ہوگئے تھے۔ پولیس والے بھدّی بھدّی گالیاں دیتے ہوئے۔ سالہ دادا گیری کرتا ہے، سردار بنا ہے موالیوں کا، محلے والوں کا جینا حرام کر دیا ہے، اب سالے چل جیل میں سڑا دوں گا......'' اور پولیس والے بڑی بے دردی سے گھسیٹتے ہوئے ارشد کو گرفتار کر کے لے گئے۔

سارے خواب سارے ارمان چکنا چور ہوگئے، کیا خواب تھے لیکن...... ارشد کو دو سال کی قید ہوگئی۔ یہ خبر سن کر اختر میاں اور ان کی بیگم ایک آہ سرد بھر کر رہ گئے، بس خاموشی سے دونوں ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ انہوں نے سوچا ارشد کے جیل جانے کے بعد شکوہ شکایت کا سلسلہ روز روز کے ہنگامے اور گالی گلوج کا سلسلہ ختم ہو جائے گا اور سکون کی زندگی گذرے

گی لیکن ان کا یہ سوچنا غلط ثابت ہوا، محلے والوں نے جو رویہ اپنایا تھا وہ پہلے سے بھی زیادہ ہتک آمیز اور غیرت کو للکارنے والا تھا، لوگ اب گھر پر آ کر برا بھلا نہیں کہتے۔ لیکن گھر سے نکلنے پر ایسی ایسی آوازیں کستے کہ ان کا سر شرم سے جھک جاتا ایک دن انہوں نے صاف صاف سنا تھا" سالا بڑا شریف بنتا ہے، بیٹے کو ٹریننگ دی ہوگی، تبھی تو بیٹا ایسا نکلا، گھر میں آمدنی کیسے بڑھتی۔ پڑھایا لکھایا نہیں، تو چور ڈاکو اور قاتل ہی بنے گا نہ......"

اختر میاں یہ سن کر بڑی تیزی سے سائیکل کا پینڈل مارتے ہوئے دفتر کی جانب بھاگتے تھے وہ واقعہ کو بھی پی گئے کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا لیکن ایک دن تو انتہا ہوگئی۔ انہیں ایسی امید نہ تھی کہ محلے والے اتنا گر سکتے ہیں۔ دفتر سے شام کے وقت جب گھر پہنچے تو ان کی بیگم نے روتے ہوئے بتایا کہ آج محلے والوں نے نکڑ پر کالج سے لوٹتی ہوئی بیٹی پر گندے جملے پھینکے ہیں اور کہا ہے کہ شریفوں کے محلے میں یہ لوگ رہنے کے قابل نہیں ہیں......"

اختر میاں پوری بات سنے بغیر ہی غصہ سے آگ بگولا ہو گئے وہ چیختے ہوئے دروازے کی جانب بڑھے۔" آج میں ان لوگوں کو دیکھ لوں گا، بہت برداشت کر رہا ہوں، قصور میرے بیٹے کا ہے، لیکن اس کی سزا ہم لوگوں کو کیوں اور پھر وہ تو اپنے کیے کی سزا بھگت ہی رہا ہے" ابھی وہ باہر برآمدے تک ہی پہنچے تھے کہ ان کی بیگم اور بیٹی روتی ہوئی ان کی جانب بڑھیں اور انہیں دبوچ لیا۔ چھوڑیئے جانے دیجئے، بات مت بڑھایئے ہم لوگ ان کے سامنے کمزور ہیں، وہ لوگ ایک ہو رہے ہیں...... بڑی مشکل سے اختر میاں قابو میں آئے اور ہانپتے ہوئے نڈھال ہو کر بستر پر گر گئے۔

بستر پر لیٹے لیٹے ایک بات ان کے ذہن میں آئی کہ بیٹی اب جوان ہوگئی ہے اس کے ہاتھ پیلے کر کے جلد از جلد رخصت کر دیا جائے، ورنہ نہ جانے اور کتنی ذلتوں اور رسوائیوں کا سامنا کرنا پڑے گا یہ بات ان کے ذہن میں گھر کر گئی۔ اور وہ بیٹی کا رشتہ ڈھونڈنے لگے۔ لیکن اس زمانے میں بیٹی کا رشتہ ڈھونڈھنا سمندر سے موتی نکالنے سے زیادہ مشکل کام ہے کئی دروازے کھٹکھٹائے منت سماجت کی، کبھی بات آگے بڑھی بھی تو جہیز کی لمبی فہرست

نے ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا اور پھر وہی خلاء کہیں کچھ نہیں، سب کچھ سونا سونا اداس اداس۔

اسی بھاگ دوڑ میں دو سال گزر گئے اور ایک دن ارشد جیل سے رہا ہو کر گھر آ گیا، اختر میاں نے اسے دیکھا اور دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ ماں اور بہن دوڑ کر اس سے لپٹ گئیں۔ اختر میاں کا بھی دل چاہا کہ اپنے بیٹے کو گلے لگا لیں' لیکن اتنی کڑواہٹوں نے جنم لے لیا تھا کہ وہ ایسا چاہ کر بھی نہ کر سکے اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ ارشد نے ایک نظر ان پر ڈالی اور پھر سر جھکا لیا۔

ارشد کی جیل سے واپسی نے اختر میاں کو بڑے تذبذب میں ڈال دیا، ایک طرف اولاد کی محبت اور دوسری جانب اس کی وجہ سے ذلت ورسوائیوں کی چبھن وہ کیا کریں، کیا نہ کریں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بیوی کی گرتی ہوئی صحت اور بیٹے سے اس کی والہانہ لگاؤ نے ان کی زبان پر تالے ڈال دئے تھے۔ وہ بیٹے کے خلاف نہ کچھ بول سکتے تھے نہ کوئی سخت قدم اٹھا سکتے تھے۔ اس گھر میں اس کا رہنا انہیں گراں گزر رہا تھا آخر کار ایک دن انہوں نے ایک فیصلہ کیا کہ وہ اس کے کسی بھی معاملے میں دخل نہ دیں گے۔ اب وہ کوئی بچہ نہیں ہے کہ اسے سمجھایا جائے۔ بائیس سال کا اچھا خاصا نوجوان ہے۔ اسے خود اتنی عقل بمجھ ہونی چاہئے کہ وہ اچھے برے کی تمیز کر سکے۔

وقت گزرتا رہا۔ ارشد کو گھر آئے کئی ماہ ہو گئے لیکن کہیں سے بھی کوئی شکایت نہیں، کوئی ذلت آمیز جملے نہیں، اختر میاں کو لگا کہ جیل سے واپسی کے بعد ارشد میں تبدیلی آ گئی ہے، شاید اب وہ سدھر گیا ہے۔ شاید...... شاید...... تبھی تو نکڑ پر کھڑے لوگ انہیں دیکھ کر جملے کسنے کے بجائے سلام کرنے لگے ہیں۔ سائیکل دیکھتے ہی جو لوگ راستے سے ہٹتے نہیں تھے وہ اب ان کے لئے راستہ چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ سب اختر میاں کو بڑا اچھا لگنے لگا۔ اب تو ان کے گھر میں بھی رونق رہنے لگی ہے۔ ہر کمرے، میں بلب ساتھ ساتھ ٹیوب لائٹس لگ گئی ہے۔ باہر کے برآمدے کو گھیر کر ڈرائنگ روم بنا دیا گیا ہے اور اس میں صوفہ اور چند کرسیاں بھی سلیقے

سے رکھ دی گئی ہیں کھانا بھی عمدہ بننے لگا ہے ایک دن رنگین ٹی۔وی بھی گھر میں نظر آئی۔ دفتر سے واپس آتے تو گھر کے باہر کئی اسکوٹر اور کاریں کھڑی ملتیں اور اندر داخل ہوئے تو دیکھتے کہ ڈرائنگ روم میں دیدہ زیب لباس میں ملبوس لوگ ارشد سے محو گفتگو ہیں۔کبھی کبھی انجانہ سا خوف ذہن میں ابھرتا، یہ سب کہاں سے اور کیسے؟ اور آخر ایک دن انہوں نے اپنی بیگم سے پوچھ لیا، جس کے جواب میں بیگم نے کہا۔

آپ بہت شکی ہیں، معلوم نہیں، ارشد نے اچھا سا بزنس شروع کیا ہے، آپ کو اپنے بیٹے کی پرواہ ہی کب رہتی ہے جو......''

بیگم کا جواب سن کر اختر میاں خاموش ہو گئے لیکن نہ جانے کیوں ذہن ان باتوں کو قبول نہیں کر رہا تھا انہوں نے سر جھٹک دیئے کہ مجھے ان سب باتوں سے کیا لینا دینا۔ میں نے تو اسے اس کے حال پر چھوڑ ہی دیا ہے۔ بس فکر ہے کہ کسی طرح سے بیٹی کی شادی ہو جاتی، اپنی زندگی تو کسی نہ کسی طرح کٹ ہی جائے گی۔اور اچانک اختر میاں کے گھر پر کچھ لوگ اس کی بیٹی کا رشتہ مانگنے آئے اور کہا'' بس ہم صرف آپ کی اجازت چاہتے ہیں، بقیہ تمام باتیں ارشد بابو سے ہو چکی ہیں ارشد بابو؟ اختر میاں کے ذہن کو جھٹکا لگا وہ...... وہ...... کون ہوتا ہے میرے معاملے میں دخل دینے والا، لیکن حقیقت سے کیسے آنکھیں چرائی جا سکتی تھیں چٹیل میدان میں دور دور تک کوئی سایہ دار درخت نہیں تھا، وہ خاموش رہے اور اچھا لڑکا اچھے لوگ دیکھ کر حامی بھر لی۔

بیگم بھی بہت خوش ہوئیں اور جب اختر میاں کو شادی کے اخراجات کے لئے پریشان دیکھا تو وہ ہنستے ہوئے بولیں......'' آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں، ارشد نے ساری ذمہ داری لے لی ہے۔''

دیکھتے دیکھتے پورا گھر جگ مگ جگ مگ کرنے لگا۔ بارات بھی آگئی اور سارا انتظام ایسا کہ اختر میاں کے خواب و خیال میں بھی یہ نہ تھا۔ مہمان کے آنے کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ وہ شامیانے کے ایک گیٹ پر کھڑے مہمان کا استقبال کر رہے تھے کہ اچانک ایک چمچماتی

ہوئی لال بتی والی سفید کار آ کر سامنے کھڑی ہوگئی۔اس کار کے ٹھیک پیچھے پولیس فورس سے بھری ایک جیپ گاڑی تھی۔اختر میاں کا دل دھڑکنے لگا، یہ کیا ہوا؟ کیا بات ہوگئی؟ لیکن ان کی ساری پریشانی پل بھر میں دور ہوگئی۔جب انہوں نے دیکھا کہ کار سے اتر کر ریاست کے ایک وزیر مسکراتے ہوئے، ارشد کے ساتھ ان کی طرف چلے آرہے ہیں وزیر ان کے قریب آئے ان کے گلے لگ گئے اور شادی کی مبارک باد دی اور آگے بڑھ کر معزز لوگوں کے درمیان جا کر بیٹھ گئے۔

اختر میاں سناٹے میں کھڑے تھے۔میرا یہ بیٹا تو سچ مچ میری خوشیوں اور تمناؤں کا مرکز نکلا۔میری یہ عزت یہ وقار، یہ عظمت......میں تو کب کا یہ سب ذہن سے کھرچ کر نکال چکا تھا لیکن میرے اس بیٹے نے تو......دل چاہا دوڑ کر ارشد کو سینے سے لگالیں۔لیکن وہ ایسا نہ کرسکے، نہ جانے کیوں، وہ کون سا کانٹا تھا' جو ایسے لمحوں میں گلے میں اٹک جاتا اور گلے کا پھانس بن جاتا۔ان ہی ادھیڑ بن میں ادھر ادھر ٹہلنے لگے پھر ایک جگہ وہ کھڑے ہوگئے۔یہاں پر مدھم روشنی تھی۔کسی نے انہیں دیکھا نہیں۔کچھ لوگ ارشد کے بارے میں گفتگو کررہے تھے۔اختر میاں چونک پڑے اور بے اختیار اس جانب متوجہ ہوگئے کہ لوگ کیا بول رہے ہیں۔حالانکہ باتیں کرنے والے سرگوشی میں باتیں کررہے تھے مگر......

ایک کہہ رہا تھا۔"ان کا گھر تو بالکل بدل گیا، کیا شان وشوکت ہے، کیا ٹھاٹ باٹ ہے، شادی کا یہ انتظام ہی دیکھو نا؟"

جواب میں دوسرے نے دھیرے سے کہا۔"ہوگا کیوں نہیں، ارشد اس وقت شہر کا کوئی معمولی آدمی نہیں، وہ شہر کا سب سے بڑا ڈان ہے۔اس کے ایک اشارے پر لوگ گردن اتار کر پیش کردیتے ہیں۔"

اس آدمی کے یہ الفاظ کسی بم کے دھماکے کی طرح اختر میاں کے کانوں سے ٹکرائے' انہیں ایسا لگا ان کے جسم کا شاندار لباس، یہ عزت، یہ وقار، یہ عظمت جگ مگاتے قمقمے کی طرح کرایہ کے ہیں، کسی بھی لمحہ، کسی بھی پل لوگ آئیں گے اور انہیں اٹھالے جائیں گے اور

پھر وہ ننگے، مادر زاد ننگے کھڑے رہ جائیں گے۔ ان کا سر چکرانے لگا انہوں نے سنبھلنے کی کوشش کی، لیکن خود کو سنبھال نہ سکے اور شامیانے کے ایک بانس پر پورے بوجھ سے گر پڑے اور وہ بانس اکھڑ گیا اور پھر ایک پر ایک بانس اکھڑنے لگے اور طنابیں گرنے لگیں۔

ہنسانے والے

ڈگ ڈگ ڈگ..... ڈگ ڈگ

ڈگڈگی کی آواز سنتے ہی محلّے کے لوگ دوڑ پڑے۔ آس پاس سے گزرنے والے بوڑھے، بچے، عورتیں، جوان سبھی ان کے گرد جمع ہو جاتے اور جب وہ دونوں دیکھتے کہ اچھی خاصی بھیڑ لگ گئی ہے تو وہ لوگوں کے بیچ اپنا سامان رکھتے اور پھر ان کا شروع ہو جاتا تماشہ۔

ڈگ..... ڈگ..... ڈگ.....

''تو جمورے شروع ہو جا، دکھا اپنا کمال۔''

''ہاں استاد، یہ لو ابھی دکھاتا ہوں اپنا کمال۔'' اور یہ کہتا ہوا ایک چھلانگ لگاتا اور سر کے بل کھڑا ہو جاتا۔

بچّے ان کے تماشے دیکھ کر تالیاں بجاتے، قہقہے لگاتے اور دوسرے لوگ بھی ان کے کرتب کو دیکھ کر ہنسنے پر مجبور ہو جاتے۔ تھوڑی دیر میں تماشہ ختم ہوتا اور وہ دونوں لوگوں کے سامنے اپنے بوسیدہ چادر پھیلا دیتے۔ دو تین جگہ اس طرح کے تماشے دکھا کر اتنے پیسے جمع کر لیتے کہ وہ اپنی ماں اور اپنے پیٹ کی آگ بجھا کر رات گئے سو جاتے اور پھر صبح ہوتے ہی دونوں نکل پڑے۔ گلی گلی، کوچہ کوچہ..... ڈگ ڈگ ڈگ..... ڈگ ڈگ.....

ان دونوں کی قسمت نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔ کبھی ان لوگوں نے بھی سپنے سجائے تھے۔ خوشنما اور رنگ برنگ سپنے، لیکن کاتب تقدیر نے ان سپنوں کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا اور ان

کا ہرا بھرا گھر اجڑ گیا تھا۔ وہ رات کتنی سیاہ اور بھیانک تھی۔ اس رات کا ایک ایک منظر ان کے سامنے رقصاں رہتا۔

رات کا کھانا کھا کر وہ لوگ خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ ان کا باپ بڑا ذہین تھا، اسے اپنی ذہانت پر بڑا فخر تھا۔ دن بدن بڑھتی ہوئی پٹرول کی قیمت اور اس کی کمی نے اس کے ذہن کو جھنجھوڑ دیا تھا۔ اور وہ ایک نیا تجربہ کر رہا تھا، سورج کی روشنی سے تیز رفتار موٹر گاڑیوں کو کیسے چلایا جاتا ہے اور کئی سال کی انتھک محنت اور لگن نے اسے ایک راہ دکھا دی تھی اور بہت جلد دنیا کے سامنے اپنا تجربہ پیش کر کے اپنے ملک کی پریشانی کو دور کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے ملک کا وقار بڑھانا چاہتا تھا۔ وہ روزانہ اپنی بیوی اور بچوں کو اپنے تجربے اور اس میں ملنے والی کامیابی کی تفصیل بتاتا اور لوگ دل ہی دل میں آنے والی خوشگوار اور شاندار زندگی کی رعنائیوں میں کھو جاتے۔ اس رات ان کا باپ بہت خوش تھا، اس کا تجربہ پورے طور پر کامیاب رہا تھا اور وہ دوسرے دن پورے ملک کو یہ خبر دے کر چونکانے والا تھا کہ اچانک ہر طرف سے ایک شور اٹھا، دلدوز چیخ و پکار– وہ لوگ چونک پڑے۔ دروازہ پیٹا جانے لگا۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو دیکھا ایک پڑوسی خوف سے کھڑا کانپ رہا ہے۔ بہت مشکل سے وہ بس اتنا کہہ سکا– "بھاگو، دنگا ہو گیا۔" یہ سن کر اس کا باپ پریشان ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس نے فوراً بچوں کو لے کر بیوی کو گھر کے پچھلے دروازے سے نکل جانے کو کہا۔ اس کی بیوی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا، نہیں میں آپ کے ساتھ جاؤں گی۔"

"دیکھو ضد نہ کرو، تمہاری یہ ضد ہم سب کو ختم کر دے گی۔" اس نے جواب دیا اور صدر دروازے سے باہر نکل گیا۔ ماں دونوں بچوں کو لے کر پچھلے دروازہ سے باہر نکلی اور بھاگتی چلی گئی۔ ان کے ساتھ سینکڑوں لوگ بھاگ رہے تھے۔ ہر طرف شور، چیخ و پکار، آگ اور خون پورا ماحول خوفناک اور وحشت ناک ہو رہا تھا۔ وہ لوگ دوڑتے دوڑتے ایک جگہ ٹھوکریں کھا کر گرے اور پھر اندھیرے کی دبیز چادر نے انھیں دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا۔ دوبارہ آنکھیں کھلیں تو بھیانک رات گزر چکی تھی اور صبح کا اجالا پھیل رہا تھا۔ لیکن اس وقت تک ان

کا سب کچھ جل چکا تھا۔ان کے خوشنما خواب، رنگین سپنے، انگڑائیاں لیتی ہوئی تمنائیں سب جل کر خاک ہو چکی تھیں۔ ہر طرف دھواں ہی دھواں اور ان کے سامنے لاشوں کے انبار میں ان کے باپ کی لہولہان لاش پڑی تھی۔

وقت بڑی تیزی سے گزرتا رہا۔ بہت جلد لوگوں کے چندے، ہمدردیاں ختم ہو گئیں اور اب وہ اس دوراہے پر کھڑے تھے جہاں سے دور تک کوئی راستہ نہیں جاتا تھا۔

ماں کی گرتی صحت، دواؤں اور بھوک کی شدت نے انہیں کشکول اٹھانے پر مجبور کرنا چاہا لیکن ضمیر نے اسے گوارا نہیں کیا۔ پھر بچپن کا شوق کام آیا اور ایک دن ان دونوں نے ڈگڈگی اٹھالی اور شروع ہو گیا سلسلہ۔

''تو جمورے دکھا اپنا کمال''

غموں سے چور اور دکھ درد کی گہرائیوں میں ڈوب کر وہ لوگوں کو ہنسانے لگے۔ آہستہ آہستہ بے رحم وقت نے ان کے زخموں پر مرہم رکھ دیا۔لیکن ان کی ماں کے لہولہان جسم کے اندر کے زخم ہمیشہ ہرے رہے، دونوں بیٹوں کی ساری کوششوں کے باوجود اس کے چہرے پر کبھی مسکراہٹ نہیں آئی اور ایک دن وہ ان زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسی۔ دونوں بیٹے چیخ پڑے۔''نہیں ماں، نہیں تو ہمیں چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔اب کس کے سہارے جیوں گا۔ کس کی گود میں سر رکھ کر پل دو پل کا سکون اور ماتا کا پیار ملے گا۔ ماں......'' لیکن ماں ابدی نیند سو چکی تھی، تمام صعوبتوں سے وہ آزاد ہو چکی تھی، ہر دکھ درد سے وہ مکتی پا چکی تھی۔ان دونوں کی چیخ پکار سن کر آس پڑوس کے لوگ جمع ہوئے۔ہمدردوں نے دو بول بولے اور چل دئے۔ اس کے سوا وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔ماں کے آخری سفر کی تیاری؟ ان کے سامنے مسئلہ بن کر کھڑی تھی۔ان دونوں نے دو چار لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے ؛'' بابا کچھ پیسے دے دو میری ماں مرگئی ہے۔'' جواب میں لوگوں کی گالیاں اور دھتکار ملی؛'' جا بھاگ' سالے تم لوگوں کی روز ہی ماں مر جاتی ہے۔سالوں نے بھیک مانگنے کا ایک نیا دھندا بنالیا ہے، ان سالوں کی شکل تو دیکھو آنکھوں میں ایسے آنسو بھر رکھا ہے، جیسے سچ مچ ان کی ماں مرگئی ہے۔'' لوگ انہیں

دھتکارتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔ اب کیا کیا جائے۔ رات سے صبح اور صبح سے دوپہر ہوگئی، کفن دفن کا کوئی انتظام نہیں ہوا۔ دونوں نے ایک دوسرے سے سوال کیا، لیکن جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ تو کیا ہماری ماں اسی طرح پڑی رہے گی؟ اچانک ان کے دماغ میں ایک خیال آیا اور پھر......ان کے ہاتھوں میں ڈگڈگی تھی اور جب بھیڑ لگ گئی ہمیشہ کی طرح ایک نے ہانک لگائی۔ ''ہاں تو جمورے دکھا اپنا کمال۔'' اور دوسرے نے ''یہ لو استاد، دکھاتا ہوں ابھی اپنا کمال۔'' یہ کہتا ہوا وہ بندروں کی طرح قلانچیں بھرتا سر کے بل کھڑا ہو گیا۔ بچوں نے تالیاں بجائیں اور بڑے بے اختیار ہنس پڑے۔ وہ نئے نئے کرتب دکھانے لگے اور لوگ قہقہے لگاتے رہے۔ اس بات سے بالکل بے نیاز کہ آج انہیں ہنسانے والوں کا دل کتنا رو رہا ہے، وہ اپنی ماں کی لاش کو دفنانے کے لئے ہنس رہے ہیں اور ہنسا رہے ہیں۔

کرتب دکھا کر انہوں نے چادر بچھادی اور اس چادر پر روپے دو روپے گرنے لگے۔ چند لمحوں بعد ان دونوں نے سارے پیسے یکجا کئے اور غم سے نڈھال تھکے، قدموں سے چل دئے، اپنی ماں کے کفن دفن کی تیاری کے لئے!

انقلاب

آج پورے تیس برسوں بعد اس گاؤں میں داخل ہو رہا ہوں اپنے اس گاؤں کو دیکھنے کی تمنا کب سے دل میں دبائے تھا۔لیکن امریکہ جیسے بڑے ملک کے بڑے شہر کی بھاگ دوڑ میں کتنی تمنائیں جنم لیتی ہیں اور دم توڑ دیتی ہیں۔میری یہ تمنا وقتی طور پر دب جاتی لیکن، جب کوئی لمحہ اپنا ہوتا اور اپنے لوگ یاد آتے تو اپنا یہ گاؤں ضرور یاد آتا اور آخر کار آج میں پورے تیس برسوں بعد میں اپنے گاؤں میں داخل ہو رہا ہوں ..... میرا یہ پرانہ گاؤں اور گذشتہ تیس برسوں تک میرے دل و دماغ میں بسا یہ گاؤں-اب وہ گاؤں نہیں رہا-کتنی تبدیلی آگئی ہے۔

گاؤں میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے اپنی پرانی یادوں کے سہارے یہاں کے قبرستان جاتا ہوں، پہلے یہ قبرستان کتنا پھیلا ہوا تھا،لیکن آج یہ چاروں طرف سے گھر کر کتنا سمٹ گیا ہے، میں اپنے دادا آبا کی قبر تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں' لیکن یادداشت ساتھ نہیں دے رہی ہے۔یا شاید قبروں کی بھیڑ میں وہ قبر گم ہوگئی۔میں انداز کے سہارے ایک نیم کے پیڑ کے قریب کھڑا ہو کر اپنے دادا آبا کو یاد کرتا ہوں اور فاتحہ پڑھتا ہوں۔فاتحہ کے بعد دادا ابا کی یادیں بے چین کرنے لگتی ہیں، میری آنکھیں بھر جاتی ہیں۔میں آنسو پونچھتا ہوا قبرستان سے باہر نکل آتا ہوں-باہر نکل کر وہ کنواں تلاش کرتا ہوں، جس میں ریہٹ لگا تھا اور اسکے ٹھنڈے ٹھنڈے پانی سے میں اپنے دوستوں کے ساتھ نہایا کرتا تھا۔ لیکن وہ ریہٹ غائب تھا، کنواں بھی موجود نہیں تھا' بلکہ اس کی جگہ ایک مکان کھڑا تھا، مجھے

ایک جھٹکا سا لگا۔ دس بیس قدم کے فاصلے پر راستے کے کنارے بنا وہ بڑا سا چبوترہ تلاش کرتا ہوں؛ جس پر شام کے وقت دن بھر کے تھکے ماندے گاؤں کے لوگ بیٹھ کر خوش گپیاں کرتے تھے۔ ایک دوسرے کی خیر خبر لیتے اور پھر تبصرہ کرتے اور یہ تبصرہ گاؤں، شہر، ضلع، صوبہ، ملک اور بیرون ملک تک کے حالات پر رات گئے تک جاری رہتا۔ ان دنوں امریکہ اور برطانیہ وغیرہ کا ذکر خصوصی انداز میں کیا جاتا، بلکہ ان ملکوں کو جادونگری بنا کر پیش کیا جاتا، جسے سن کر وہاں پر موجود ہر شخص کے دل میں ان جادونگری کی سیر کرنے کی تمنا انگڑائیاں لینے لگتیں۔ اس چبوترے پر کبھی کبھی دبی زبان میں امیر اور زمیندار کسانوں کے ظلم اور استحصال کی باتیں بھی ہوتیں، لیکن یہ باتیں اتنے چپکے چپکے اور سہمے سہمے انداز میں ہوتیں کہ ذرا فاصلے پر بیٹھا شخص بھی نہیں سن پاتا تھا۔ گاؤں کے اس چبوترے کی بڑی اہمیت تھی۔ گاؤں کے اندر ہونے والی بہت ساری تبدیلیوں میں بڑا اہم رول رہتا تھا۔ اس چبوترے پر کئی اہم پنچائتیں بھی ہوئی ہیں۔ لیکن افسوس کی آج وہ دوستی محبت بھائی چارگی اور عدل وانصاف کا گواہ چبوترہ غائب ہے۔ میں نے سوچا وہ چبوترہ غائب ہے، تو پھر رہیمو دادا، قدرت دادا، سکھ لال جی، ستیہ نارائن سنگھ جی، ہریا، سکھ لال یادو، رمیا، کرپال سنگھ، رام شرن شرما، مادھو کرمی، رحمان خاں، خالق انصاری وغیرہ کہاں پر ایک ساتھ مل جل کر بیٹھتے ہوں گے۔ کہاں پر بیٹھ کر ایک دوسرے کا دکھ سکھ بانٹتے ہوں گے۔ شاید اس چبوترہ کے ختم ہونے کا ہی یہ اثر ہے کہ اکثر مجھے امریکہ میں اخباروں سے یہاں کی ایسی خبریں دیکھنے کو ملتیں جنہیں پڑھ کر دل دہل جاتا۔ ایک ساتھ پچیس تیس لوگوں کو قتل کر دینے کی رپورٹ اور تصویریں، درندگی کے ایسے ہولناک حادثہ کی خبر کا اثر میرے دل ودماغ پر کئی دن رہتا لیکن پھر آہستہ آہستہ نارمل ہو جاتا۔ میں سوچتا آج جب امریکہ، روس، برطانیہ، چین، شام، فرانس اور دوسرے ممالک میں نسلی فسادات اور اختلافات کے لاکھوں، کروڑوں لوگ شکار ہو رہے ہیں۔ ریشہ دوانی استحصال، ظلم تشدد، عالمی غنڈہ گردی اور انتہا پسندی کا بازار گرم ہے۔ ایسے میں ان ممالک کی گرم ہوا ان گاؤں تک پہنچانا ممکن نہیں۔ اور شاید......

اچانک میری سوچ کا دائرہ سمٹ گیا، میری نظروں کے سامنے گاؤں کے کئی لوگ کھڑے مجھے بہت غور سے دیکھ رہے تھے، ایک اجنبی کو اس طرح گاؤں میں دیکھ کر وہ حیران تھے۔ میرا یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ کل تک جو گاؤں میرا تھا یہاں کا چپہ چپہ گلی گلی کوچہ کوچہ جانا پہچانا تھا۔ آج میں یہاں پر ایک اجنبی کی طرح کھڑا تھا۔ میں ان لوگوں کے قریب جاتا ہوں اور پوچھتا ہوں۔

''بھائی، یہاں پر آس پاس کہیں پر کھ لال جی کا گھر تھا۔''

ان لوگوں میں سے ایک آگے بڑھ کر بولا......

''ایہئے جا، ان کر گھر بلئی، لیکن اوتو کب کے سورگ باس ہو گیلن۔''

''اور ان کا پریوار؟ میں نے بیچ ہی میں سوال کیا۔

''ان کر پریوار؟...... وہ شخص بولتے بولتے کچھ جھجھک رہا تھا۔'' ہاں ہاں، ان کا پریوار کہاں ہے؟ میں نے استفسار کیا۔'' او سب تو پرے سال کے کانڈ میں کھتم ہو گیلن، ان کا مکنو جل کر راکھ ہو گیلئی اور......''

مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ میں کچھ دیر خاموش رہا۔ ہم نے اپنی یادوں کے سہارے اپنے ایک حلیم دادا کے بارے میں پوچھا۔

''او بھی تو کب کے سورگ باس ہو گیلن، ہاں ان کے پریوار سہر میں جا کر رہے ہتن۔''

اور شہابو چچا۔؟

ہاں او تو ہتی، ان کے لیکن لوگ سہر میں رہے ہتن، کبھی کبھی آوا ہتن۔ سہابو گنواں کہت ہیں کہ ای گاؤں جندگی بھر ہم نہ چھوڑب۔ ہمار باپ دادا کے نسانی ای جا......''

''وہ کہاں ملیں گے۔ ذرا مجھے ان کے گھر تک پہنچا دیجئے۔''

''میں نے بیچ ہی میں ان کی بات کاٹ کر پوچھا۔

''ہاں ہاں جرور، چلا ہمرا ساتھ۔''

اور میں ان لوگوں کے ساتھ ہوگیا، راستے میں کئی لوگ ملے۔ مجھے زیادہ دور نہیں چلنا پڑا۔ چند ہی قدم کے فاصلے پر ایک خاموش اور اجڑے ہوئے مکان کے دلان میں ایک چوکی پر ایک بوڑھا اور نحیف شخص لیٹا ہوا خلاء میں گھور رہا تھا، اتنے ڈھیر سارے لوگوں کو اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ شخص اٹھ بیٹھا۔

''کا ہے رے رموا؟ انہوں نے سوال کیا۔

اے گو سہر سے آدمی ایلئے ہیں، رودا کے بارے میں پوچھلے ہئی۔ سو ہم رودا کے پاس لے لے آئینلئی۔''

میں سمجھ گیا، یہ بوڑھا شخص ہی شہابو چچا ہیں۔ انہوں نے مجھے غور سے دیکھا اور پہچاننے کی کوشش کی، لیکن ان کی آنکھوں سے اجنبیت ٹپک رہی تھی، شہابو چچا میں ہوں انور۔ آپ کے دوست خیرالدین کا بڑا لڑکا۔''

''اوہ۔ انور ہو تم! ارے کیسے کیسے یہاں آئے بھئی؟ کیسے کیسے ہم لوگوں کی یاد آئی؟''

شہابو چچا کھڑے ہو گئے اور مجھے گلے لگا لیا۔ دیر تک گلے لگائے رہے مجھے بڑا اچھا لگا! کتنی اپنائیت تھی، کتنی شفقت تھی۔ یہ میرے اپنے چچا نہیں تھے، لیکن ان کی محبت اور شفقت دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ یہ میرے اپنے نہیں ہیں۔ مجھے یاد آیا امریکہ۔ جہاں اپنے بھائی بھی غیروں کی طرح ملتے ہیں۔

شہابو چچا نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب بٹھایا اور دیر تک میری اور میرے لوگوں کی خیریت پوچھتے رہے۔

تھوڑی دیر بعد دستر خوان لگا اور کھانے پینے کی کئی چیزیں آ گئیں وہاں پر موجود گاؤں کے لوگوں نے بھی کھانے میں ساتھ دیا۔ اسی دوران میں نے شہابو چچا سے پوچھا۔ چچا ایسا کیا ہے کہ آپ اس گاؤں میں اکیلے پڑے ہیں، شہر میں اپنے بچوں کے ساتھ نہیں رہتے؟ شہابو چچا کچھ دیر تک خلاء میں گھورتے رہے اور پھر بالکل کھوئے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ اس گاؤں کے چپے چپے میں میرے باپ دادا کی نشانیاں ہیں میں کیسے انہیں چھوڑ سکتا ہوں۔

لوگ گاؤں چھوڑ چھوڑ کر شہر میں بس رہے ہیں، جائیں ضرور جائیں، لیکن میں مرتے دم تک اپنی جڑوں کو چھوڑ نہیں سکتا۔''

شہابو چچا کی یہ بات سن کر مجھے اپنے آپ میں بڑی شرم محسوس ہوئی، ایک میں ہوں اور میرے جیسے نہ جانے کتنے لوگ، جو اپنی جڑوں کو چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے یا بھاگنے پر مجبور ہو گئے اور......

شہابو چچا نے مجھے زیادہ دیر ان خیالوں میں بھٹکنے نہیں دیا، وہ وہاں پر بیٹھے گاؤں کے لوگوں کا تعارف کرا رہے تھے۔

''ان سے ملو یہ رام سیوک داس ہیں، گاؤں کے مکھیا ہیں۔ ان کا بیٹا شہر میں بڑا انجینئر ہے، یہ رام پرساد یادو ہیں گاؤں کے لوگوں کیلئے بہت کام کرتے ہیں، ان کے دونوں بیٹے شہر میں آفیسر ہیں اور یہ ہردوار کرمی ہیں، ان کا بیٹا صوبہ کا بہت بڑا لیڈر ہے، بڑی شان سے گاؤں میں آتا ہے اور یہ......''

شہابو چچا وہاں پر موجود تمام لوگوں کی تفصیل بتا رہے تھے اور میں حیرت اور خوشی کے جذبے میں ڈوبا جا رہا تھا۔ شہابو چچا کہہ رہے تھے۔ ہاں ٹھاکر نریش سنگھ کے بارے میں سن کر تمہیں افسوس ہوگا ان کی حالت اچھی نہیں ہے۔ ان کے سارے لڑکے عیش و آرام کے عادی بن کر اپنی پوری جائداد ختم کر ڈالی اور آج دانے دانے کو محتاج ہیں، سنا ہے ان دنوں وہ رام کرت مہتو کے یہاں منشی کا کام سنبھالے ہوئے ہیں......''

مجھے یاد آیا، وہ دن جب ان کے شاہانہ ٹھاٹ تھے ان کے دروازے پر ہاتھی جھومتا تھا۔ نوکر چاکر، گاڑی ......کیا نہیں تھا ان کے پاس۔ شہابو چچا اپنی باتوں میں اپنی یادداشت کا بہترین مظاہرہ کر رہے تھے۔ میں بڑی دلچسپی سے ان کی باتیں سن رہا تھا' آہستہ آہستہ لوگ مجھ سے ہاتھ ملا کر چلے گئے، صرف میں اور شہابو چچا رہ گئے تو میں نے ان سے پوچھا۔

''یہ مکھ لال جی کیا قصہ ہے۔؟''

''بیٹا مکھلال جی نے بدلتے وقت کی نبض نہیں پہچانی اور سات بیٹوں کا باپ بن کر ہمیشہ

دولت کے نشے میں چور رہا۔غریب، مزدوروں، براہلوں پر ظلم وتشدد اور ان کا استحصال کرتا رہا۔اس کی چنگاری دہکتی آگ میں تبدیل ہوگئی آخر کار ایک دن اس آگ نے مکھ لال اور اس کے پورے خاندان کو جلا کر راکھ کردیا، ہمارے رحمو خاں کا بھی یہی حال ہوا۔برج بہاری سنگھ بھی اسی آگ کے شکار ہوئے، ویسے بھی اب پہلے والی بات نہیں رہی، زمانہ بدل چکا ہے جو لوگ بدلتے وقت کی چاپ نہیں سنتے، وہ منہ کی کھا رہے ہیں، آئے دن گاؤں میں بندوقیں گرج رہی ہیں، تیز ہتھیار چمک رہے ہیں۔لاشوں کے انبار لگ رہے ہیں اور......"

شہابو چچا جذباتی ہوگئے تھے ان کی آواز بھرا گئی تھی اور میں سوچ رہا تھا!

تو گویا اب یہاں کے لوگ بھی جاگ چکے ہیں، یہاں بھی انقلاب آچکا ہے......!

❁

ہم قدم

ہر روز کی طرح آج بھی دفتر دیر سے پہنچا، انچارج آفیسر نے اچٹتی نظروں سے دیکھا، کہا کچھ نہیں، اسے بھی شاید میری بے چارگی اور بے بسی پر ترس آتا تھا اور شاید وہ بھی اس سے واقف تھا کہ میری صبح و شام کیسی ہوتی ہے، صبح سے شام اور شام سے رات گئے تک کام اور کام میرا مقدر ہے۔

دوسروں کے لئے صبح خوشگوار ہوتی ہوگی، شام سہانی اور رات پر بہار لیکن میرے لئے صبح و شام اور رات میں کوئی فرق نہیں، کہیں کوئی بہار نہیں، بس خزاں ہی خزاں، ہر وقت، ہر لمحہ تیز آندھیوں اور جھکڑوں کا ہی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے مجھے آس پاس کے لوگوں پر کہ وہ ہنسنے اور قہقہے لگانے کے لئے وقت کیسے نکال لیتے ہیں، لیکن نہیں، میں بھی ہنستا اور قہقہے لگاتا ہوں لیکن میری ہنسی اور قہقہے کتنے کھوکھلے اور بے جان ہوتے ہیں۔ کینٹین میں بیٹھ کر چائے کی چسکی کے ساتھ سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے میرے فلک شگاف قہقہے سن کر کون کہہ سکتا ہے کہ میں اندر ہی اندر کتنا ٹوٹا ہوا ہوں، کتنا بکھرا ہوا ہوں، میرا پورا وجود کس طرح زخم آلود ہے۔

میری نظریں فائل پر مرکوز تھیں اور ہاتھ میں قلم لیکن میں خود کہیں اور تھا، شاید میں خود اپنے وجود کے تعاقب میں تھا...... کہ اچانک رمیش کی آواز گونجی۔

''ارے یار انور، یہ تم کہاں ہو؟''

''آں، ہاں، کیا ہوا رمیش۔'' میں خیالوں کی دنیا سے واپس آ گیا۔

''ارے یار ادھر دیکھو، آج کا اخبار، ہمارے شہر کو خوبصورت بنانے کیلئے ۱۰ ارکروڑ کی گرانٹ ملی ہے۔''

مزا آئے گا یار، ہر طرف صاف شفاف سڑکیں ہریالی ہی ہریالی، روشنی ہی روشنی......اور ......''

''اور جن کی زندگی میں کوئی روشنی نہ ہو، کوئی ہریالی نہ ہو، ان کے بارے میں کوئی خبر ہے آج کے اخبار میں۔''

''تو ہمیشہ الٹی سیدھی باتیں کرتا ہے۔ یار تو پاگل ہے یا پھر فلسفی۔''

''نہیں رمیش میں پاگل ہوں اور نہ فلسفی، بس زندگی کی تلخ حقیقتوں نے میرے منھ میں کڑواہٹیں بھر دی ہیں''

میری اس بات پر رمیش کیا کہہ رہا تھا، اسے میں سنتے ہوئے بھی نہیں سن پا رہا تھا، اس لئے کہ میری نظروں کے سامنے اندھیروں میں ڈوبے میرے گھر کی چہار دیواری تھی، جہاں ہر روز نہ جانے کتنی خواہشوں، چاہتوں اور ارمانوں کو دفن کیا جاتا ہے، میرے گھر کے ہر فرد کے اندر ان گنت تمناؤں کے مقبرے بسے ہوئے ہیں۔ ہر شخص کی انگلی میری ہی طرف اٹھی رہتی ہے۔ یہی ہے میرے ارمانوں کا قاتل، یہی ہے میری خواہشوں کا قاتل یہی ہے...... اتنی انگلیوں کو دیکھ کر میں سوچتا ہوں، میں کس پر انگلی اٹھاؤں، میں کسے قاتل ٹھہراؤں، میں کسے اپنے ارمانوں، اپنی چاہتوں، اپنی خواہشوں کے باغ کو خاکستر کرنے کا قصوروار بتاؤں، میں......''

''اوہ، تم کہاں کھو گئے میں بکے جا رہا ہوں اور تم ہو کہ بس خاموش ہو......''

''ہاں یار رمیش، میں سن رہا ہوں، میں سب کچھ سن رہا ہوں، سچ مچ بڑا مزہ آئے گا، بڑا اچھا لگے گا ہمارا شہر، بیوٹی فیکیشن کے بعد، اتنے روپے میں تو ہمارا شہر جگ مگ، جگ مگ کر اٹھے گا......اور کیا ہے رمیش آج کے اخبار میں......''

میں نے رمیش کی توجہ دوسری طرف مرکوز کرانی چاہی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ رمیش یا کوئی بھی میرے اندر جھانک کر میری حقیقت سے واقف ہو، میری زندگی کی مسخ شدہ تصویر دیکھے میش نے بھی میری جانب زیادہ توجہ نہیں دی اور آج کی نئی نئی خبریں سنانے لگا۔

انور آج کے اخبار میں کئی اہم خبروں کے ساتھ ساتھ ایک شاندار آرٹیکل اکیسویں صدی پر ہے، ہم لوگ اب جلد ہی اکیسوی صدی میں داخل ہونے والے ہیں۔ ہم نے واقعی کتنی ترقی کر لی ہے آج کا دور کمپیوٹر، روبوٹ ڈرون اور راکٹ کا دور ہے، لائف کتنی فاسٹ ہوگئی ہے۔''

''لائف فاسٹ ہوگئی ہے؟ ہونہہ، کاش میں رمیش کو بتا تا کہ پچھلے بیس سال سے میری لائف کتنی سلو (Slow) ہے میری زندگی کی گاڑی بس رینگ رہی ہے، یہ بھی میرا کتنا بڑا المیہ ہے کہ راکٹ اور کمپیوٹر کے دور میں بھی میری زندگی کی رفتار اس قدر دھیمی ہے' جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ہے، میں نے کتنی کوششیں کی کہ میری زندگی کی گاڑی راکٹ کی رفتار سے نہ سہی، سوپر فاسٹ ٹرین کی رفتار سے آگے بڑھے، اسے تیز سے تیز کروں لیکن چند قدم کا فاصلہ طئے کرنے کے بعد مڑکر دیکھتا ہوں تو خود کو وہیں پاتا ہوں، جہاں سے میں نے سفر شروع کیا تھا۔ بیوی، چار بچے بوڑھی ماں، جوان بہن کہنے کو تو ایک چھوٹا خاندان، لیکن ان کی ضرورتوں اور خواہشوں کا بھاری بھر کم بوجھ میرے قدم آگے بڑھنے نہیں دیتے ......

ماں پچھلے دو سال سے مسلسل بیمار ہے۔ جب بھی اس کی طبیعت زیادہ بگڑتی ہے تو اگلے ماہ کی تنخواہ ملنے پر کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھانے کا وعدہ کرتا ہوں اور وٹامن کی چھوٹی موٹی لال پیلی گولیوں سے علاج کم اور تشفی زیادہ کرانے کی کوشش کراتا ہوں۔

''ان گولیوں سے اب تم بہت جلد اچھی ہو جاؤ گی ماں۔''

لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ ان گولیوں سے کبھی اچھی نہیں ہوگی، اس لئے کے یہ گولیاں اس کی بیماری کا علاج نہیں، جوان بہن کے ہاتھ جلد پیلے کر دینے کا وعدہ کرتا ہوں، لیکن میں سمجھتا ہوں اور میری بہن بھی سمجھتی ہے کہ جسم ڈھانکنے کے لئے میں کئی ماہ سے جسے ایک

دوپٹہ نہیں مہیا کرا پا رہا ہوں، تو ہاتھ پیلے کرنے کیلئے چالیس پچاس ہزار کے جہیز کا مطالبہ کس طرح پورا کر سکوں گا۔ بیوی کی اداس اور خاموش نگاہیں کہنے کو بہت کچھ کہتی ہیں اور میں جان کر بھی انجان بنا رہتا ہوں......

''انور بابو بڑے صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔'' چپراسی کی آواز مجھے چونکنے پر مجبور کر دیتی ہے، رمیش سامنے بیٹھا اکیسویں صدی میں داخلے والے مضمون میں پوری طرح کھویا ہوا تھا، میں تیزی سے اٹھا اور بڑے صاحب کے چیمبر میں داخل ہوا۔

''انور دیکھو، یہ ایک لاکھ روپے کا چیک ہے، اسے ریلیف فنڈ (Drought Relief Fund) کے لئے روانہ کر دو اور اس فنڈ کی خبر تمام اخباروں میں بھیج دو کہ میں نے خشک سالی سے متاثر افراد کی راحت کیلئے ڈراوٹ ریلیف فنڈ میں ایک لاکھ روپے کا ڈونیشن دیا ہے''

''جی سر، ابھی یہ کام کئے دیتا ہوں۔''

میں یہ کہتا ہوا اس کے چیمبر سے باہر آتا ہوں اور اپنی سیٹ پر بیٹھ کر چیک کو رجسٹرڈ ڈاک کے حوالے کرنے اور اخباروں کے لئے خبر بنانے میں مصروف ہو جاتا ہوں۔

میرا قلم کاغذ پر چل رہا تھا اور ذہن زندگی کی حقیقتوں کے تلاطم میں ڈوب ابھر رہا تھا......

ایک لاکھ روپے کا چیک سوکھے سے متاثر افراد کے لئے، اس کی پبلسٹی اور ایک لاکھ سے چار لاکھ کا ٹنڈر، اسے کہتے ہیں بزنس......کاش کسی کو یہ معلوم ہوتا کہ میرے گھر کے اندر برسوں سے کتنا زبردست سوکھا پڑا ہے......میرے گھر کے لوگوں کے چہرے اور ان کی آنکھوں سے ہر پل سوکھا جھانکتا رہتا ہے، گھر کا آنگن، برتن، در و دیوار سب کچھ سوکھا سے متاثر ہے لیکن میرے گھر کا سوکھا تو ایسا ہے جو ہریالی سے ڈھکا ہے، ببول کی ہریالی کے نیچے صحرائی زمین اپنے اوپر کتنا بوجھ لئے ہوئے ہے، اس کی فکر کون کرے۔

''ارے یار انور، پانچ بج گئے، کیا ارادہ ہے۔''

ہاں ہاں چل رہا ہوں رمیش۔ چپراسی کو بلا کر سپرد ڈاک کرنے کے لئے کئی لفافے دیئے

اور اپنا پرانا بوسیدہ تھیلا اٹھاتا ہوا رمیش کے ساتھ آفس سے باہر نکل گیا۔

ہر روز کی طرح آج بھی بس اسٹینڈ کی جانب بڑھا اور رمیش نہرو پارک کی طرف۔

''رمیش تم ہر روز پارک کیوں جاتے ہو' کیا تمہیں گھر جلد پہنچنے کی خواہش نہیں ہوتی ؟''

''ارے یار بس یونہی۔''

''نہیں رمیش پلیز آج یہ معمہ بھی حل کر ہی دو۔''

''میں ہر روز اس بات پر غور کرتا ہوں کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو......؟''

میری باتیں سن کر رمیش کی آنکھوں میں ایک عجیب سی اداسی چھا گئی، چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ بولا...... دراصل میں اتنی جلدی گھر جا کر اپنے لوگوں کی سوالیہ نظروں کا شکار ہونا نہیں چاہتا۔ رات گئے گھر پہنچ کر پھر تو بکھر جانا ہی ہے۔''

رمیش کی بات سن کر میں کچھ دیر خاموش رہا، پھر دھیرے سے بولا، چلو یار میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔!

اسٹاروار

صبح سویرے ہی منگورام گاؤں سے شہر کی جانب چل پڑا تھا۔ آج اسے شہر پہنچ کر پانچ بورے چاول فروخت کر کے ضروریات کا سامان خریدنا تھا۔

بیل گاڑی مدھم چال سے چل رہی تھی۔ منگورام کے سامنے سورج جیسے جیسے اوپر اٹھ رہا تھا، ویسے ویسے اس کے ہاتھ بیلوں کی پیٹھ پر چابک برسا رہے تھے، زبان بھی اسی رفتار سے چل رہی تھی...... ہیا...... ہیا...... چل...... سرا تھنن......'' بیل چابک کی مار کھا کر دس بیس قدم بڑی تیزی سے چلتے، اس کے بعد وہ پھر اپنی پہلے والی رفتار پر آجاتے ...... اسی وقت منگورام کے سر کے اوپر سے ایک بے آواز طیارہ دھوئیں کی لکیر چھوڑتا ہوا برق رفتاری سے گذر گیا، تو منگورام کو عجیب سا لگا اور بے اختیار اس کی زبان سے نکلا......

''اے گو راکتوا پرکا آدمن ہئی، جے کہاں سے کہاں نکل گیلئی، اے گو ہم ہیو، جے بھور کھنی سے چلے ہیا اور دو دو گھنٹوں میں دو کوس نہ آگے بڑھ لی......''

اور اس کے ہاتھ پہلے کی طرح پھر چابک برسانے لگتے، سڑاپ...... سڑاپ...... سڑاپ کی آواز بیلوں کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کی آواز میں کبھی دب جاتی اور کبھی ابھر جاتی لیکن منگورام کے ہوہو...... ہاہا...... چلا...... چلا...... کی صدا برابر سنائی دیتی۔

دس بجتے بجتے وہ بازار پہنچ گیا۔ گدام میں اس نے مول تول کر کے چاول فروخت کئے اور ضروریات کا سامان خریدنے کے لئے ادھر ادھر کا چکر لگانے لگا۔

بازار میں مختلف دوکانوں کا چکّر لگاتے ہوئے اس نے ایک بات بڑی شدت سے محسوس کی کہ ہر طرف امن وشانتی کی باتیں کی جارہی تھیں ۔لوگ آپس میں نہ جانے کیا کیا باتیں کر رہے تھے ۔آئر لینڈ میں دو بڑی طاقتوں کے سر براہوں کی چوٹی کانفرنس سے اب پوری دنیا کے لوگ اسٹاروار سے محفوظ رہیں گے ۔اسلحہ کی ہوڑ ختم ہو جائے گی ،ریگن اور گورباچیوف کے درمیان ضرور معاہدہ ہو جائے گا اور پوری دینا میں امن وشانتی کی فضا قائم ہو جائے گی ۔موت کے منڈلاتے بادل ختم ہو جائیں گے اور......اور......

ان باتوں میں صرف ایک بات اس کے پلّے پڑی ،امن وشانتی کی ۔اس کے چھوٹے سے ذہن میں یہ بات سما گئی کہ امن وشانتی کی باتیں کی جارہی ہیں اور لوگ بے حد پر امید ہیں ۔اس بات سے اسے ایک انجانی سی خوشی محسوس ہوئی ۔شام کے وقت جب وہ گاؤں واپس ہونے لگا،تو وہ بہت خوش تھا......اس کی نظروں کے سامنے اس کے اوپر آئے دن مظالم ڈھانے والے ،بات بات پر گالیاں دینے اور جان سے مارڈالنے کی دھمکیاں دینے والے بڑے کسان نرم پڑتے نظر آنے لگے ۔اس نے تصوّر کی آنکھوں سے دیکھا کہ گاؤں کا بدمعاش اور دولت مند کسان بنواری لال اسے گلے لگا رہا ہے اور کہہ رہا ہے ۔ارے منگلوا،اب تورا کوئی پھکر کرنے کی جرورت نا ہے،تو جب چاہے ہمرا کنواں سے پانی لے سکتا ہے ،ہمرا گھر لے آ جا سکتا ہے ،تورا پر گاؤں میں اب کوئی روک ٹوک ناہی رہے ......منگلو رام خوشی میں بیلوں کی لگام کبھی زور سے کھینچتا کبھی ڈھیلا چھوڑ دیتا۔منگلو رام کے اندر کا خوف جو برسوں سے سمایا ہوا تھا،دور،بہت دور نکلتا ہوا محسوس ہونے لگا،ایک انجانی قوت اس کے اندر کے خوف کو ختم کئے دے رہی تھی اور وہ خود کو بڑا ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا اس کی نظروں کے سامنے مختلف سمت میں فاختائیں اڑتی ہوئی نظر آنے لگیں ۔

شام ڈھلتی جارہی تھی ۔دن کا اجالا دھیرے دھیرے تاریکی میں بدل رہا تھا۔لیکن منگلو رام کو آج کسی قسم کا خوف محسوس نہیں ہوا۔وہ بے فکری سے گنگناتا گیت گاتا چلا جارہا تھا۔

پورے چار گھنٹہ کی مسافت طئے کرنے کے بعد اس کا گاؤں قریب آنے لگا،بازار سے

واپسی میں آج اسے کافی دیر ہوگئی تھی، اس لئے گاؤں کے قریب پہنچتے پہنچتے اسے تقریباً دس بج گئے تھے۔ کچھ دیر کے لئے نکلی چاندنی کو کالے کالے بادل نے اپنی سیاہ چادر میں چھپالیا تھا، اسلئے ہر طرف اندھیرے کا راج معلوم ہو رہا تھا۔ مسلسل چلتے چلتے منگلو نے کئی جھپکیاں بھی لے لی تھیں۔ گاؤں سے قریب پہنچنے کا اسے جب احساس ہوا تو اس نے اپنے گاؤں کی جانب ایک نظر ڈالی اور بے اختیار اس کی زبان سے نکلا۔

''ارے ای کا۔'' اور پھر اچانک اس کے اندر کا سکون واطمینان' بے چینی اور خوف میں بدل گیا۔ دیر سے بیل گاڑی کے ایک کنارے پر رکھا چابک اس کے ہاتھ میں آ گیا اور سڑاپ ۔سڑاپ۔سڑاپ کی تیز آواز بیلوں کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کی ٹن ٹن ٹن کی آواز میں ڈوبنے ابھرنے لگی۔ منگلو گاؤں کی جانب سے اٹھتے ہوئے شعلوں کو دیکھ کر بڑا بے چین اور مضطرب ہو گیا تھا' اس کی نظروں کے سامنے گاؤں میں ہوئے پچھلے برس کا ایک بھیانک حادثہ گھوم رہا تھا۔ منگلو رام جیسے جیسے گاؤں کے قریب بڑھ رہا تھا ویسے ویسے اٹھتے ہوئے شعلے آسمان کی طرف لپک رہے تھے۔

ابھی وہ گاؤں کے پہلے کنویں کے قریب ہی پہنچا تھا کہ بیل گاڑی سے کود پڑا، آگ کی لپٹوں کے ساتھ ساتھ فلک شگاف چیخ وپکار بھی اس کی سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔ وہ تقریباً دوڑنے لگا......تیز......بہت تیز......اس کے قدم بڑی تیزی سے اٹھتے ہوئے شعلوں کی جانب بڑھ رہے تھے اور جب وہ آسمان کو چھوتے ہوئے شعلوں کے قریب پہنچا' تو یہ دیکھ کر حیران اور ششدر رہ گیا کہ وہ خود اپنے ہی مکان کے قریب کھڑا ہے۔ اس کی نظروں کے سامنے اس کا مکان دھڑا دھڑ جل رہا تھا۔ مکان کے آس پاس سے انسانی چیخ وپکار آسمان میں شگاف ڈال رہی تھی......وہ دیوانہ وار اپنے مکان کی جانب بڑھا، ابھی وہ جلتے ہوئے مکان کے قریب ہی پہنچا تھا کہ اندھیرے سے دو گولیاں چلیں اور منگلو رام کی چیخ بھی پہلی والی چیخوں میں شامل ہوگئی۔

دوسرے دن منگلو رام کے خاکستر مکان کے گرد پولیس اور اعلیٰ افسران کی بھیڑ اکٹھا تھی۔

ایک جونیئر آفیسر زرات میں پیش آنے والے حادثے کی تفصیل بتا رہا تھا۔ پریس رپوٹروں کے قلم اور پریس فوٹوگرافروں کے کیمرے بڑی تیزی سے چل رہے تھے۔

تیسرے دن تمام اخبارات کے صفحہ اوّل پر منگلورام اور اس کے خاندان کے دس افراد کی جلی ہوئی لاشوں کی تصاویر کے ساتھ ساتھ طبقاتی کشمکش اور اس کے ہولناک نتائج کی روداد شائع ہوئی تھی۔

اسی روز ریڈیو اور ٹیلی ویژن آئرلینڈ میں دو بڑی طاقتوں کے درمیان ہوئی کانفرنس کی ناکامی پر اہم شخصیتوں کے بیانات اور مستقبل میں استاروار کے خوف کی تفصیلات نشر کر رہے تھے اور منگلورام کے گاؤں میں فاختاؤں پر خونی درندے جھپٹ رہے تھے اور چمگادڑیں پھڑ پھڑا رہی تھیں۔

دوپہر

گرمی کی چلچلاتی دھوپ میں راموا پنی پوری طاقت پیڈل پر ڈالتا ہوا رکشہ پر بیٹھے شخص کو اس کی منزل کی جانب لئے جا رہا تھا۔کہیں بھیڑ دیکھتا تو گھنٹی بجانے لگتا ہے اور بھیڑ کم نظر آتی تو کاندھے پر پڑے گمچھے سے اپنے شرابور چہرے اور گردن سے پسینہ پونچھنے لگتا۔

''بس بائیں طرف روک دو،''

سواری کی آواز سنتے ہی اس کے ہاتھ بے اختیار بریک پر گئے اور رکشہ چند قدم کے فاصلے پر رک گیا۔

سواری رکشہ سے اترا اور پاکٹ سے دو روپئے کا ایک نوٹ نکال کر رامو کی طرف بڑھا دیا۔رامو نے گمچھے سے پسینہ خشک کرتے ہوئے دو روپئے کا نوٹ دیکھا اور اپنی احتجاج کو گڑگڑاہٹ میں بدلتے ہوئے بولا۔''بابواتنی دور سے اور دو روپیہ؟''

''ابے چپ۔لینا ہے تو لے ورنہ بھاگ۔''

''بابو،ایک گو روپیہ اور دیئے دو۔''

''کہا نہ،اس سے زیادہ نہیں ملے گا اور دو روپئے کا نوٹ رکشہ کی سیٹ پر ڈال کر گالیاں بکتا ہوا سامنے کے''سلی پوائنٹ''میں داخل ہو گیا۔جہاں لوگ خشک گلے میں ٹھنڈے

مشروبات اتار کر فرحت پا رہے تھے۔

رامو نے اپنی بے بس اور مجبور خاموشی کے ساتھ دو روپے اٹھا لئے اور اس شخص کا نظروں سے تعاقب کیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ آدمی سامنے کھڑا ''کولڈ ڈرنک'' کی ایک بوتل ہاتھ میں لے کر اس کی ٹھنڈک کا اندازہ لگا رہا ہے اور یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ بوتل اتنی ٹھنڈی ہے کہ اسے منہ میں لگاتے ہی دیر سے خشک گلا نہ صرف تر ہو جائے گا، بلکہ جسم کے اندر اتر کر گرمی اور تکان کو بھی دور کر دے گا۔ اس نے بوتل منہ سے لگا لی۔

رامو دھوپ میں کھڑا پسینہ خشک کرتے ہوئے اس آدمی کے ساتھ کئی دوسرے آدمی کو بوتل ہاتھ میں لیتے، پھٹاک سے بوتل کا منہ کھلتے اور پھر اسے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

اسے یاد آیا کہ پرسوں رکشہ میں بیٹھے ایک جوڑے نے اسی طرح کی دو بوتلیں اس سے منگوائی تھیں۔ دوکان سے بوتل لاتے ہوئے اس کے ہاتھوں نے کتنی ٹھنڈک محسوس کی تھی۔ اسے ایسا لگا تھا جیسے ٹھنڈک اس کی کھردری اور سخت ہتھیلیوں سے ہوتی ہوئی اس کے جسم کے اندر اتر رہی ہے۔ اس کا جی چاہا وہ دونوں ٹھنڈی بوتلیں دیر تک اسی طرح اپنے ہاتھوں میں لئے رہے اور اس کی ٹھنڈک کو اپنی ہتھیلیوں سے اپنے جسم کے اندر اتار دے، لیکن وہ جیسے ہی بوتل لئے رکشہ کے قریب پہنچا، لڑکا اور لڑکی نے اس کے ہاتھ سے بوتلیں جھپٹ لیں اور منہ سے لگا لیا۔ دونوں رامو کے احساسات و جذبات سے بے خبر کولڈ ڈرنک کو آہستہ آہستہ سپ کرنے لگے اور ادھر رامو۔ للچائی نظروں سے ان دونوں کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے سوچ رہا تھا۔

''ایک دن، ہم ہو پیب'' (ایک دن میں بھی پیوں گا)

آج پھر اس کے سامنے بوتل کے کارک پھٹاک پھٹاک کھل رہے تھے اور اس کی شیتلتا اور ٹھنڈک کو لوگ اپنے اپنے جسم کے اندر اتار رہے تھے۔ بوتل کی ٹھنڈک اور شیتلتا کو اس نے ایک بار پھر تصور میں اپنی ہتھیلیوں پر محسوس کیا۔ گرمی عروج پر تھی، ایسا لگتا تھا جیسے سورج

اب بس سوا نیزے پر آنے ہی والا ہے۔ پیاس کی شدت سے گلے میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ اس نے اپنے جسم پر جھولتے ہوئے چیتھڑے میں سے ایک بوسیدہ سا بٹوا نکالا۔ اس وقت وہ بھی اپنے گلے میں چبھتے ہوئے کانٹے کو اپنی اس خواہش سے ختم کرنا چاہتا تھا۔ بٹوا میں سے کل سات روپئے نکلے۔ پانچ روپیہ اس نے رکشہ کے مالک کے ''جمع'' کیلئے رکھا۔ اب دو روپئے بچ رہے تھے۔ دو روپئے لے کر وہ فخر سے سینہ پھلائے، لیکن کچھ ہچکچاہٹ کے ساتھ ''سلی پوائنٹ'' داخل ہوا۔

''بابو، اے گو ٹھنڈا کا بوتل ہمرا دیو۔'' (بابو ایک ٹھنڈی بوتل مجھے بھی دینا)

دوکان کے مالک نے عجیب سی نظروں سے اس کے گندے پسینے سے شرابور بوسیدہ کپڑے اور جسم کو دیکھا اور غرا کر پوچھا۔ ''کیا تو پئے گا۔''

''ہاں بابو بڑی گرم لگتے ہئی۔'' (ہاں بابو بڑی گرمی لگ رہی ہے)

دوکان دار کا مالک اور وہاں پر کھڑے تمام لوگ ایکبارگی ہنس پڑے اور ان تمام لوگوں کی ہنسی سے راموکو ایسا لگا جیسے اس کے جسم پر جھولتے ہوئے چیتھڑوں کو بھی ان لوگوں نے نوچ کر پھینک دیا ہو۔ ہنسی پر قابو پاتے ہوئے دوکان کے مالک نے کہا۔ اچھا، لا، روپئے۔''

''ای۔لو۔'' (یہ لو)

''ابے دو روپئے میں ہی جہنم جیسی گرمی سے نجات چاہتا ہے۔ دس روپئے لا۔ دس روپئے۔''

''ابے پیسے نہیں ہیں، تو جا بھاگ۔''

رامو بجھے ہوئے قدموں سے دوکان سے باہر نکل آیا۔ وہ سوچنے لگا، دس روپئے تو بہت ہوتے ہیں۔ دس روپئے میں تو سیر بھر آٹا مل جائے گا۔ آج نہیں پیوں گا بھی شام تک روزانہ سے زیادہ کماؤں گا تب ٹھنڈی بوتل پیوں گا'' یہ سوچتا ہوا وہ رکشہ لے کر آگے بڑھ گیا۔

گرمی کی شدت سے جسم سلگ رہا تھا اور گلے میں کانٹے کی چبھن بڑھ گئی۔ کچھ دور جانے

پر اسے میونسپلٹی کا ایک نل نظر آیا، جس سے بوند بوند پانی ٹپک رہا تھا۔ اس نے نل کے گرم گرم پانی سے اپنے خشک گلے کو تر کیا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ خود کو یقین دلاتا رہا کہ ایک دن ٹھنڈی بوتل پی کر اس کی ٹھنڈک اپنے جسم میں اتارے گا ضرور۔ نل پر سے اس نے گردن اٹھائی تو دیکھا ایک آدمی اس کی مرضی جانے بغیر اس کے رکشہ پر سوار ہے، وہ رکشہ کے قریب آیا سوار شخص سے منتیں کرنے لگا، بڑی جور بھوک لگل ہے بابو، کھائے لا جائی ہیا۔"

"نا.........کیسے جائے گا، سالے چل نہیں تو دو تھپڑ دوں گا۔"

رامو نے خوف زدہ ہو کر جلدی سے رکشہ کے پینڈل پر اپنے پاؤں رکھ دیئے۔

کنے چلیئے بابو؟" (کدھر چلوں بابو؟)

"بھارت ٹاکیز۔"

اور رامو خالی پیٹ گرمی سے نڈھال ہونے کے باوجود اپنی باقی بچی ہوئی طاقت سے رکشہ دوڑانے لگا۔

دن بھر کولہو کے بیل کی طرح رکشہ میں جُتا رہنے کے بعد شام کو رکشہ مالک کو پانچ روپے جمع دیئے اور ایک کنارے بیٹھ کر دن بھر کی اپنی کمائی کا حساب لگانے لگا۔ سارے روپے گننے کے بعد اس کی باچھیں کھل گئیں۔ پورے بارہ روپے بچ رہے تھے کل سے آج اس نے دو روپے زیادہ کمائے تھے۔ بنیا کی دوکان سے آٹا، دال، تیل، گڑ، مصالحہ اور آلو وغیرہ لینے کے بعد اس کے پاس دو روپے بچ رہے تھے۔ اسے بڑی خوشی محسوس ہوئی۔ کل کمائی کر اور ٹھنڈی بوتل پیب جرور.........

دوسرے دن صبح سویرے ہی وہ بازار آ گیا اور رکشہ میں جُت گیا، سواریوں نے اسے دوپہر کو بس اسٹینڈ کے قریب کی جھگی میں بیٹھ کر ستو بھی کھانے کا موقع نہ دیا۔ دن بھر سخت دھوپ اور تمازت نے اس کی کھوپڑی کو بھون ڈالا تھا۔ اور تمام دن وہ خود کو یقین دلاتا رہا تھا کہ آج وہ ٹھنڈی بوتل ضرور پئے گا۔ ہاتھوں میں لے کر دیر تک اس کی ٹھنڈک کو محسوس کرے گا تب ہونٹوں سے لگائے گا۔

شام کے وقت جمع دینے کے بعد اس کے پاس پچیس روپے بچے تھے۔ آٹا، چاول، دال، تیل، گڑ، اور بیڑی وغیرہ لینے کے بعد اس کے پاس پورے دس روپے بچ گئے۔ وہ بڑا خوش ہوا۔ آج اس کی دیرینہ آرزو پوری ہوگی۔ خوشی خوشی وہ ''سیلی پوائنٹ'' کی طرف بڑھنے لگا، راستے بھر وہ تصور میں ٹھنڈی بوتل کو ہاتھ میں لیتا، اس کی ٹھنڈک کو ہتھیلیوں سے اپنے جسم کے پور پور میں اتارتا، پھر بوتل کو ہونٹوں پر رکھتا، پھر دھیرے دھیرے پیتا...... ٹھنڈک ہی ٹھنڈک...... ایک سروری کیفیت...... خوشی سے جھومتا ہوا وہ دوکان کے قریب پہنچا...... پہلا زینہ...... دوسرا زینہ اور پھر کاؤنٹر...... لیکن ابھی وہ اپنے بوسیدہ بٹوہ میں سے دس روپے نکال بھی نہ پایا تھا، کہ اچانک اس کے کانوں میں اسکی بیوی کی بنتی (التجا) گونجنے لگی۔

''ببوا کے دودن سے بکھار (بخار) لگل ہئی، آج اُکرا لا دوائیا جرو لے لی ہا'' (دو دن سے بخار لگا ہے، آج اس کے لئے دوا ضرور لیتے آنا)

بیوی کی یہ بنتی یاد آتے ہی وہ اچانک واپسی کے لئے مڑ گیا، دونوں زینہ اس نے ایک ساتھ طئے کیا اور بھاگتا ہوا ہومیو پیتھ کے ڈاکٹر رام سروپ کے یہاں قطار میں لگ گیا۔

اولڈ ایج ہوم

ہوائی جہاز جیسے ہی رن وے پر اترا تفضل حسین نے اپنے اندر سرور کی ایک لہر دوڑتی محسوس کی۔ پورے دس سال بعد آج اپنے ملک کی سرزمین پر وہ قدم رکھنے والے ہیں، جس سے وہ ناطہ توڑ کر چلے گئے تھے۔ تفضل حسین کا ہوائی جہاز سے اترتے ہی اپنے ملک کی مٹی سے اٹھنے والی خوشگوار ہوا کے جھونکوں نے استقبال کیا۔ کسٹم کے جھمیلوں سے چھٹکارا پا کر وہ جیسے ہی باہر نکلے سامنے کئی جانے انجانے چہرے نظر آئے ۔ایک چہرے کی متلاشی نگاہوں نے انہیں پہچان لیا، بڑھ کر لپٹ گئے۔ ''ابو۔''

''اوہ شمشاد، میرے پیارے بیٹے۔''

باپ بیٹے کی آنکھوں میں محبت کے آنسو تیرنے لگے اور وہ بے حد جذباتی ہو گئے۔ تفضل حسین کافی دیر تک اپنے بیٹے کو اپنے سینے سے لگائے رہے۔ ان دس برسوں میں دونوں کے گلے شکوے دور ہو چکے تھے۔ وقت اور دوری نے باپ بیٹے کے دلوں کے درمیان کی کھائی کو پاٹ دیا تھا۔

ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر اپنے چھوٹے بیٹے شمشاد کے بغل میں بیٹھ کر تفضل حسین سگریٹ کے کش پر کش لیتے ہوئے پرانی یادوں میں کھو گئے۔

شمشاد تفضل حسین کی نگاہ میں نالائق اور غیر ذِمّہ دار بیٹا تھا۔ جس نے کبھی بھی اپنے باپ کی قربانیوں کی پرواہ نہیں کی، ان کی محبت اور پیار کو اہمیت نہیں دی۔

بڑے بیٹے سرور کو ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کے بعد انگلینڈ میں فیلوشپ مل گئی تھی۔ وہ انگلینڈ گیا تو وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ کبھی کبھار بس خط سے یاد کر لیتا۔ اس کی شادی کی اطلاع بھی بس شادی کارڈ کے ذریعہ ہی ملی اور سرور کی یہ تمام باتیں تفضل حسین کی نگاہ میں اس کی مصروفیت کے باعث ہوئیں، ورنہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ سرور کو وقت ملتا اور وہ اپنے باپ سے ملنے نہ آتا۔ شادی کرتا اور مشورہ نہ کرتا۔ ادھر شمشاد کی دن بہ دن کی نازیبا حرکتوں سے وہ ذہنی اور جسمانی اذیتوں کے شکار ہو گئے تھے۔ انہیں غم تھا تو بس اس بات کا کہ جن بیٹوں کی پرورش کے لئے انہوں نے سارے سکھ اور آرام کو تج دیا، وہ آج سکھ اور آرام میں ہوتے ہوئے بھی ان کے دکھ کو نہیں سمجھ رہے ہیں۔ شمشاد اور سرور پانچ اور سات سال کے تھے کہ ان کی ماں دونوں بیٹوں کی پرورش کی ذمہ داری ان کے سپرد کر کے لمبے سفر پر روانہ ہو گئیں اور تفضل حسین پوری ایمانداری کے ساتھ اپنی ذمہ داری پوری کرنے میں لگ گئے۔ جوانی کے دن تھے، اس لئے کئی ہمدردوں نے دوسری شادی کا مشورہ بھی دیا، لیکن اپنے بیٹوں کے بہتر مستقبل کے لئے اپنی جوانی بھرے بہار کے دن کو قربان کر دیا، وہ جانتے تھے کہ دوسری بیوی کا سلوک ان کے بچوں کے ساتھ کیسا ہوگا۔

کئی گھنٹے کی مسافت طئے کرنے کے بعد تفضل حسین کی ٹیکسی رُکی، تو ان کے سامنے ایک چھوٹا سا مکان تھا، مکان کے برآمدے میں کئی چھوٹے بڑے بچے کھڑے تھے۔ شمشاد کے ٹیکسی سے باہر نکلتے ہی بچوں کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ دادا ابا آ گئے۔ ''دادا ابا آ گئے'' ''دادا ابا آ گئے'' کا شور مچاتے ہوئے بچے ٹیکسی کے گیٹ پر آ کھڑے ہوئے...... تفضل حسین بھی انداز سے سمجھ گئے کہ یہ بچے شمشاد کے ہیں۔ ٹیکسی سے اتر کر سبھوں کو پیار کیا۔ بہو نے بھی دروازے پر آ کر سلام کرتے ہوئے استقبال کیا۔ اندر کمرے میں پہنچ کر تفضل حسین کو ہر چیز بڑی عجیب سی لگی۔ لندن سے آنے کے بعد ایک قصبے کا مکان...... اپنا مکان ہوتا تو اس کی

ادھڑی ہوئی درودیوار سے انسیت اور محبت ہوتی، لیکن خواہش نہیں رہتے ہوئے بھی شمشاد کی خوشی کے لئے بھیگی آنکھوں کے ساتھ اپنا مکان فروخت کردیا تھا، جن کے لئے سارے سکھ چین تج دیا اس کے لئے مکان کی کیا اہمیت۔

تفضل حسین کو اپنے ملک آئے کئی ماہ ہو گئے۔ آہستہ آہستہ انہوں نے خود کو ایک بار پھر یہاں کے ماحول اور فضا میں Adjust کر لیا اور adjust ہونے میں کوئی پریشانی بھی نہیں ہوئی کہ جڑیں تو ان کی یہیں تھیں اور پھر دس سال کا عرصہ طویل ہونے کے باوجود اتنا بھی طویل نہیں تھا کہ اپنے ماضی کو فراموش کر دیتے۔ لندن میں قیام کے دوران اکثر انہیں اپنا گھر، اپنے دوست احباب کی یاد آتی اور یہ یادیں کئی بار آنسو بن کر ان کی آنکھوں میں لرزنے لگتیں۔ غم اور آنسو، تو ان کا جیسے مقدر بن گئے تھے۔

اپنی جڑوں کو روندتے ہوئے وہ لندن گئے تھے، سرور کے پاس خوشیاں سمیٹنے، لیکن کاتب تقدیر نے تو ان کی قسمت میں کچھ اور ہی لکھ دیا تھا۔

دراصل ڈاکٹر سرور سے تفضل حسین کو کچھ زیادہ ہی امیدیں وابستہ تھیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ سرور کے دل میں اپنے باپ کے لئے بے پناہ جگہ ہوگی۔ اسے ضرور یاد ہوگا کہ اس کے باپ نے اس کے لئے کتنی مصیبتیں جھیلی ہیں، کتنی راتیں آنکھوں ہی میں کاٹی ہیں اپنی ہر خواہش اور چاہت کو صلیب پر چڑھا کر اپنے بیٹوں کے لئے خوشیاں چاہی ہیں، ان کے بہتر مستقبل کے لئے ہر جتن کیا۔ شاید یہی احساس تھا کہ مکان فروخت ہو جانے کے بعد جب ان کے پاس کچھ نہیں بچا اور شمشاد اور اس کے بیگم کے رویہ میں تبدیلی اور سرد مہری آنے لگی تو ان کی زندگی اذیت ناک ہو گئی۔ بات بات پر طنزیہ جملے اور جلی کٹی سن کر وہ رو پڑتے۔ برداشت سے جب باہر ہو گیا تو وہ سرور کو خط میں ساری باتیں لکھنے پر مجبور ہو گئے۔ کئی خط کے جواب میں جس دن تفضل حسین کو لندن کا ٹکٹ اور ویزا ملا، اس دن تفضل حسین کی خوشی کی انتہا نہ رہی اور جس وقت ان کے جہاز نے ٹیک آف کیا تفضل حسین کو ایسا لگا جیسے ان کے سارے دکھ درد دور بہت دور رہ گئے۔ اب آرام ہی آرام، زندگی کے باقی بچے دن سکھ چین سے

گذاریں گے۔

لندن پہنچ کر تفضل حسین کو یہاں کی ہر چیز نئی اور اجنبی سی لگی لیکن سرور اور اس کے بال بچوں کے درمیان وہ سب کچھ بھول گئے۔ لیکن آہستہ آہستہ یہاں بھی وہی سب کچھ شروع ہوگیا جس سے نجات حاصل کرنے وہ یہاں آئے تھے۔

سرور دن بھر ہاسپٹل میں رہتے اور اس کی بیگم کو ہر وقت اس کا گھر میں پڑے رہنا ناگوار گزرنے لگا وہ خود کو بھی فری محسوس نہیں کرتی۔ ناگواری جھنجھلاہٹ میں بدلی اور جھنجھلاہٹ نے نفرت کی صورت اختیار کرلی۔ سرور کے غائبانہ میں وہ اکثر جلی کٹی سنانے سے بھی باز نہیں آتی۔

''سرور نے کہاں سے میرے کئے یہ مصیبت بلالی ہے۔ اُف کوئی بھی وقت ایسا نہیں جب میں آزادی سے کچھ کرسکوں۔''

حالانکہ تفضل حسین اسی وقت اپنی بہو سے کچھ کہتے، جب وہ بہت ضروری سمجھتے، اخبار رسائل اور ناول وغیرہ ہی وقت گزارنے کا ذریعہ تھے۔ ہاں شام' سرور اور بچوں کے ساتھ ...... ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر خوش گپیاں اور ٹیلی ویژن دیکھنے میں گزرتی۔ لیکن جب سے انہوں نے محسوس کیا کہ بیگم کے ساتھ ساتھ سرور کو بھی اس کا ڈرائنگ روم میں زیادہ دیر تک بیٹھنا ناگوار گزرتا ہے تو وہاں بھی جانا بند کردیا اور خود کو کمرے میں مقید کرلیا۔ بس وقت پر سرور کی بیگم کھانا، ناشتہ پٹک جاتی۔ وہ اٹھتے اور بڑی بے دلی سے کھانا کھاتے اور پھر وہی بستر۔

ایک دن تفضل حسین نے اپنی بہو کو سرور سے کہتے سنا کہ بچے اب بڑے ہورہے ہیں۔ انہیں الگ ایک کمرے کی ضرورت ہے کچھ انتظام کیجئے۔

جواب میں سرور نے کہا کہ'' بچوں کو ابّو کے کمرے میں Adjust کردو' کیا پریشانی ہے۔''

''آپ ڈاکٹر ہوکر بھی ایسی باتیں کرتے ہیں' آپ کے ابّو ہر وقت کھانستے رہتے ہیں، بچوں کی صحت اثر انداز ہوگی۔'' بہو کہہ رہی تھی۔

''تو کیا کیا جائے تم ہی کوئی حل نکالو؟'' سرور کی آواز تھی

''آپ کیوں نہیں اپنے ابو کو Old age home بھیج دیتے ہیں، وہاں ان کا دل بھی لگے گا۔

بہو کی یہ بات سن کر ایک جھٹکا سا لگا تفضل حسین کو۔ آنکھیں بھر آئیں اور وہ سسکنے لگے رات گئے تک وہ سسکتے رہے اور ان کی سسکی ڈرائنگ روم میں ٹیلی ویژن کے پاپ میوزک کی تیز آواز میں دم توڑتی رہی۔

صبح سویرے خلاف معمول سرور کمرے میں آئے اور تفضل حسین سے مخاطب ہوئے۔

''ابو ایسا ہے کہ آپ تنہا کمرے میں پڑے رہتے ہیں۔ اس سے آپ کی صحت پر اثر پڑ رہا ہے اس لئے ہم نے سوچا ہے کہ آپ کو Old age home پہنچا دیا جائے وہاں آپ کے کئی ہم عمر مل جائیں گے، آپ کا دل بھی لگے گا۔''

تفضل حسین رات سے ہی تیار بیٹھے تھے۔ کچھ بولنا چاہا' لیکن جذبات نے زبان گنگ کر دی۔ بڑی مشکل سے اتنا ہی کہہ سکے۔'' تم نے جو سوچا ہے، وہ ٹھیک ہی ہے۔ مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔''

اس طرح تفضل حسین Old age Home پہنچا دئے گئے۔ شروع کے چند ماہ میں سرور دیکھنے اور ملنے آتے رہے۔ آہستہ آہستہ آنے کا وقفہ بڑھتا گیا اور پھر ایسا ہوا کہ عید کے موقع پر "Wish you a happy Eid" کہنے چلے آتے اور پھر انتظار کا طویل سلسلہ۔

دس برس لندن میں گذر گئے اور اس گذرے ہوئے وقت کی گرد نے شمشاد اور اس کی بیوی کی بدسلوکیوں کو دھندلا دیا تھا اور پھر یہاں کی اذیت بھری زندگی۔ زندگی کا ایک ایک لمحہ عذاب لگ رہا تھا۔ تنہائی میں اپنا ملک، اپنے لوگ، بیتی یادیں انہیں تڑپانے لگیں اور آخر کار انہوں نے کچھ انتظام کر کے اس بے وفا ملک کو چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔

جن جڑوں کو روندتے ہوئے تفضل حسین لندن روانہ ہوئے تھے انہیں جڑوں کو ایک بار پھر سینچنے کی کوشش شروع کر دی۔

لندن سے واپس آنے کے بعد ایک دو سال تو پلک جھپکتے گذر گئے۔لوگوں سے ملنے ملانے کا سلسلہ رہا۔لندن کی خوبیاں اور خامیاں،اپنے ملک سے موازنہ،اپنے لوگوں کی یادوں کا ذکر۔لوگ بھی انکی باتیں بہت غور سے سنتے کہ انکے درمیان لندن کا ذکر کرنے والا کہاں کوئی تھا۔شمشاد اور انکی بیگم و بچے بھی انکا کافی خیال رکھتے۔لندن ریٹرن جو ٹھہرے۔

لیکن آہستہ آہستہ جب یہ شک پوری طرح یقین میں بدل گیا کہ میاں تفضل حسین لندن سے خالی ہاتھ ہی لوٹے ہیں' تو ان کے رویہ میں پھر تبدیلی رونما ہونے لگی اور جس دن ان لوگوں کو مکمل یقین ہو گیا کہ تفضل حسین جس طرح گئے تھے اسی طرح خالی ہاتھ ہی واپس آئے ہیں۔اسی دن سے ان لوگوں نے اپنا رویہ بالکل بدل دیا۔

تفضل حسین کو اس بدلے ہوئے رویئے کی وجہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ان کا دل دماغ، سوچتے سوچتے مفلوج ہونے لگا۔کیا سوچا تھا اور کیا ہو رہا ہے۔کیا اسی دن کے واسطے اپنی ساری خوشیاں ان دونوں بیٹے کے شاندار مستقبل کے لئے قربان کر دیں۔اب وہ کہاں جائیں؟ کیا کریں؟ کچھ بھی تو نہیں بچایا۔اپنی زندگی کے بچے ہوئے دن کو گزارنے کے لئے۔اپنے بیٹوں کے شاندار مستقبل کو اپنا مستقبل مان لیا تھا۔شاید ان سے یہیں پر بھول ہوئی تھی۔

شمشاد اور اس کی بیگم نے تقریباً ان سے بات کرنا بھی بند کر دیا تھا۔بس وقت بے وقت کھانا اور ناشتہ کے نام پر چند روٹیاں سامنے ڈال دی جاتیں۔خواہش نہیں ہونے کے باوجود چند لقمہ انہیں کھانا پڑتا۔ظالم زندگی ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

دکھ درد کے شدید احساس نے انہیں فکرمند بنا دیا تھا۔کھانے پینے سے لاپرواہی اور دواؤں کی عدم موجودگی نے دن بہ دن انہیں بے حد کمزور کر دیا' ایک دن باتھ روم سے نکلتے وقت توازن برقرار نہ رکھ سکے اور گر پڑے۔تکلیف کی شدت سے وہ کراہنے لگے،دن بھر وہ

اسی طرح بستر پر کراہتے رہے ۔شام کے وقت شمشاد دفتر سے لوٹے تو بہو نے انہیں کچھ سمجھایا۔بات شمشاد کی سمجھ میں آ گئی ۔اور فوراً ہی ایک آٹو رکشہ کر کے ایک سرکاری ہسپتال میں ڈال آئے ۔ڈاکٹر نے معائنہ کے بعد بتایا کہ کمر کی ایک ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔شمشاد ڈاکٹر کی بات سن کر گھر چلے گئے اور پھر لوٹ کر واپس نہ آئے ۔سرکاری ہسپتال کے ڈاکٹروں سے جب ان کی کراہ اور تکلیف نہ دیکھی گئی تو مجبوراً رحم کھاتے ہوئے ایکسرے کرا کر پلاسٹر کر دیا اور ایک بستر پر ڈال دیا۔بستر پر پڑے ہر لمحہ ان کی نگاہیں ہسپتال کے داخلی دروازے پر ٹکی رہتیں ۔شاید شمشاد، بہو یا...... بچے اتنے بے درد اور بے رحم ہو جائیں گے ۔یہ لوگ......

عضو معطّل کی طرح وہ ہسپتال کے بستر پر یہاں کے عملہ کے رحم وکرم پر پڑے ہوئے تھے اور جب بھی کوئی نرس یا ڈاکٹر ان کے قریب آتا وہ اس سے بس ایک سوال کرتے ،کیا یہاں Old age home نہیں ہے، پلیز ، مجھے وہاں پہنچادو، پلیز......

ان کی ہر وقت کی فریاد اور التجا سن کر ایک مریض کو دیکھنے آئے شخص نے کہا۔

''کیا اس بڈھے کو معلوم نہیں ہے کہ یہاں Old age Home قبرستان کو کہتے ہیں!''

قیدی

بھولو، رمیا اور سدھو نے گاؤں کے ٹھاکر برجیش سنگھ کے بچوں کو صاف ستھرے، رنگ برنگ کپڑے پہنے اسکول جاتے ہوئے اوران کی گاؤں میں آؤ بھگت دیکھ کر اپنی پلکوں پر خواب سجائے تھے۔ لیکن یہ خواب صرف خواب ہی رہے۔ اوراب وہ غلام تھے، ان کے ہاتھ پاؤں غلام تھے، ظلم تشدد کے خوف نے ان کے دل ودماغ پر بھی پہرے بٹھادیئے تھے۔ کبھی چپکے سے آزادی کا خیال دل کے کسی ویرانے میں آجاتا، تو فوراً آنکھوں کے سامنے کوڑے اور موٹے موٹے ڈنڈے ان کے جسموں پر برستے ہوئے نظر آنے لگتے اور پھر حالات کی ستم ظریفی پر وہ آہ بھر کر رہ جاتے اور دری قالین کی بنائی میں مصروف ہوجاتے۔

رات گئے کارخانہ سے چھٹی ملتی اور دو روٹی اور دال کھا کر تینوں سردیوں میں بھی سرد فرش پر ایک ایک بوری ڈال کر لیٹتے تو دن بھر اور نصف شب کے تھکے ماندے ان بچوں کو نیند کی دیوی فوراً ہی اپنی آغوش میں لے لیتی۔

شروع میں جب ان تینوں کو راموناٹی اغوا کر کے ان کے گاؤں سے لایا تھا اور قالین کے کارخانہ کے مالک کے ہاتھوں تھوڑے سے روپئے کی خاطر ان کے جسم و جان اور قسمت سونپ گیا تھا، ان دنوں یہ لوگ دن میں تو روتے اور بلکتے ہی رات میں بھی ان کی آنکھوں میں نیند کی بجائے آنسو ہی آنسو تیرتے رہتے تھے۔

وہ تینوں اکثر ایک دوسرے سے سوال کرتے۔

''آ کھر ہم نی کا کسور کرنے بانی جوای سجا ل لے بھی۔''

تینوں دیر تک سوچتے ،لیکن انہیں اس کا جواب نہیں ملتا' تو ان میں سے سب سے بڑا چودہ پندرہ برس کا سدھو، وہ اپنے تجربے کی روشنی میں کہتا۔

''ای سب کارن ہئی ،ہم نن کے گریب ہووے کے ،ای جمانہ میں بہت بڑا پاپ ہئی گریبی ،اکرے ،ہم نن کے سجا ملنتے ہئی۔''

یہ کہہ کر سدھو خاموش ہو جاتا اور رمیا اور بھولو کے ساتھ بوری پر لیٹے لیٹے ادھڑی ہوئی چھت کو تکنے لگتا ،اور سوچتا ،کتنا فرق ہے اس چھت میں اور اپنے گاؤں کے مٹی سے بنے مکان کی پھوس والی چھت میں ،کتنا اطمینان اور سکون تھا اُس چھت کے نیچے......!

وہ سب صبح سویرے گاؤں کے بہت سارے بچوں کے ساتھ گاؤں کے بڑے لوگوں کی گائے ،بیل بھینس لے کر میدانوں میں چلے جاتے ،گائے ،بھینس ،بیل گھاس اور پتے وغیرہ کھاتے اور وہ رمیا اور بھولو بھی اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ کبھی کبڈی کھیلتے ،کبھی کسی پیڑ پر رسی باندھ کر جھولے جھولتے ،کبھی لکا چوری کھیلتے اور ساتھ ہی ساتھ موسم کے مطابق ان کے منہ بھی چلتے رہتے ،کبھی ان کے ہاتھوں میں گنّے ہوتے ،کبھی امرود ،بیر یا آم ہوتے اور کبھی کھیت سے اکھاڑے ہوئے چنے کی جھنگریاں ہوتیں اور اسی کھیل کود میں دن کیسے گذر جاتا' اس کا پتا ہی نہیں چلتا۔شام کا دھندلکا ،جب پھیلنے لگتا ،تو انہیں گھر جانے کی فکر ہوتی اور جب گھر پہنچتے ،ان کی ماں ،بہن اور باپ وغیرہ سب مل کر گرم گرم باجرے کی روٹیاں ،ساگ اور پیاز کھاتے ،کتنا مزہ تھا اس کھانے میں۔

ان کی پیاری پیاری ماں ،ان کی بھولی بھولی بہنیں ،ان کا کھیت پر سے واپس آیا ہوا ،تھکا ماندہ باپ ،کتنے سکھ اور آرام سے سوتے ،کئی سال ہو جائے گا' ان سے بچھڑے ہوئے کتنا روتے ہوں گے وہ لوگ اور سوچتے سوچتے بے اختیار ان کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ،جنہیں جلدی جلدی اپنی پھٹی اور بوسیدہ سی بنیان میں جذب کر لیتے کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے۔اگر کسی نے دیکھ لیا تو پھر ڈنڈوں اور کوڑوں کی بارش شروع ہو جائے گی ،ان کے جسموں پر......ان کے جسم کے انگ الگ پر کوڑوں اور ڈنڈوں کے نشانات ،انہیں

خاموش رہنے پر مجبور کرتے ہیں۔اب بھی جب کبھی پروائی چلتی ہے تو ان کے جوڑ جوڑ دکھنے لگتے ہیں۔ایسے میں انہیں یاد آتا کہ جب کبھی کھیلتے وقت ان کے پاؤں یا ہاتھ میں کوئی موچ آجاتی تو ان کی ماں کتنی محبت' شفقت اور لاڈ پیار سے گرم گرم ہلدی چونا لگا تیں اور دوسرے تیسرے ہی دن ان کی تکلیف ختم ہو جاتی......لیکن یہاں...... یہاں تو ڈنڈوں اور کوڑوں سے انہیں پیٹا جاتا اور ان سے ہونے والے زخموں کو ڈنڈوں اور کوڑوں سے ہی ٹھیک کر دئے جاتے ہیں۔

ظلم وتشدد کو یہ لوگ خاموشی سے سہتے ہیں کہ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا ......قالین کے اس کارخانے میں کام کرنے والے دوسرے بڑے بچے، جب کبھی انہیں اداس اور پژمردہ دیکھتے' تو سمجھانے کی کوششیں کرتے کہ اب ان کی یہی قسمت اور مقدر ہے،ہم لوگ بھی جب شروع شروع میں آئے تھے تو اسی طرح روتے دھوتے تھے،لیکن رونے دھونے کی اتنی بڑی سزا ملتی تھی کہ ہم لوگوں نے آنسوؤں سے رونا بند کر دیا اور جب کبھی ماں، باپ بھائی، بہن اور گاؤں کی یاد آتی ہے تو دل ہی دل میں روتے ہیں۔

اسی طرح کئی سال گذر گئے،ان لوگوں نے بھی حالات سے سمجھوتہ کر لیا اور مالک بھی انہیں دل لگا کر کام کرتے ہوئے دیکھنے لگا تو ان پر آہستہ آہستہ ظلم وستم کم ہونے لگا اور کسی حد تک ان پر اعتماد کرنے لگا۔

سدھو، بھولو راور رمیا قالین بناتے وقت کوشش کر کے ایک ساتھ ہی بیٹھتے ایک ایک قالین پر کام کرتے ہوئے ماہ دو ماہ کبھی کبھی تین ماہ لگ جاتے ،روز روز ایک قالین پر کام کرتے ہوئے انہیں قالین سے ایک انجانی سی انسیت اور محبت ہو جاتی اور تکمیل کے مرحلے میں جب قالین ہوتی،تو اس کی ملائمیت اور نرماہٹ کو یہ لوگ ہاتھوں سے چھوتے تو انہیں یہ بڑا اچھا لگتا۔کبھی کبھی تو تیار قالین کے اوپر یہ تینوں لیٹ جاتے اور اس پر الٹ پلٹ کرتے ،ایسے لمحوں میں ان کے اندر ایک انجانی سی طمانیت ،سکون اور اطمینان کا احساس ہوتا اور انہیں وہ دن یاد آنے لگتے۔جب وہ چھوٹے تھے اور ان کی ماں انہیں سینے

پر لٹا کر پیار کرتی ...... یہی وجہ تھی کہ تیار شدہ قالین کو جب مالک بیچنے کے لئے نوکروں سے اٹھوا کر لے جانے لگتا تو انہیں ایسا محسوس ہوتا کہ یہ لوگ قالین کو نہیں، ان کی ماں کو ان سے جدا کر رہے ہیں ۔ روکنے کے لئے ان کے قدم آگے بڑھنا چاہتے ،لیکن مجبوری، خوف اور بے بسی ان کے قدموں میں زنجیریں ڈال دیتیں ۔

یہی مجبوریاں، خوف اور بے بسی آہنی زنجیریں بن کر ان کے قدموں کو، دل و دماغ کو جکڑے ہوئے تھیں، ان کے احساسات و جذبات کچلے جا رہے تھے اور انہیں اکثر آہنی پنجرے میں قید طوطے کی یاد آتی ،فرق یہ تھا کہ طوطے کا مالک ذرا چمکار کر طوطے کے سامنے روٹیاں ڈالتا، لیکن ان کے نصیب میں یہ پیار بھری چمکار بھی نہیں ۔

ایک دن جس دن مالک نے گھر کی صفائی کے لئے گھر پر انہیں بلوایا تھا اور گھر کی صفائی کرتے ہوئے غلطی سے مالک کے ڈرائنگ روم میں پڑی، ان کے ہاتھوں کی بنی قالین پر ان کے پاؤں پڑ گئے تھے ،اور مالک نے گرجتے ہوئے ماں کی گالیاں دیتے ہوئے کہا تھا ''سوٗر کا بچہ، قالین گندہ کر رہا ہے۔''

اور ...... اس دن ...... انہیں ایک زبردست جھٹکا لگا تھا ،ان کے ہاتھوں اور ان کے خون پسینہ سے بنی اس قالین پر، انہیں غلطی سے پاؤں رکھنے کا بھی حق نہیں ...... اور یہ جھٹکا، انہیں برقی کرنٹ کی طرح لگا، جو پل بھر میں انسان کے جسم کا سارا خون نچوڑ لیتا ہے اور انسان بے جان ہو کر رہ جاتا ہے

اس دن کے بعد سے یہ بھی بے جان ہو گئے ۔ان کے دل کے ارمان، جو کبھی مچلتے تھے ،ان کی خواہشات، جو کبھی بلندیوں پر پرواز کرتے تھے ،ایک جھٹکے کے ساتھ دم توڑ چکے تھے ...... اور اب ...... وہ مالک کے لئے ایک انسان نہیں ...... بس کسی مشین کے چند پرزے تھے جو قالینوں کی تہہ در تہہ میں مصروف رہتے !!!

فاصلہ قریب کا

کولتار کی چکنی و شفاف سڑک پر کار دوڑی چلی جا رہی تھی اور میری انگلیاں پچھلی سیٹ پر نصرت کی مخروطی انگلیوں سے الجھ رہی تھیں۔ رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا اس لئے میری حرکت سے صرف نصرت ہی واقف تھی بقیہ تمام لوگ اپنے اپنے خیالوں میں گم تھے۔

یہ دلچسپ سفر ٹھیک ایک گھنٹہ بعد ختم ہوا۔ گاڑی سے اتر کر سبھی اپنے اپنے کمرے میں جا گھسے۔ رات کافی ہو چکی تھی، اس لئے سبھوں کو نیند نے پریشان کر رکھا تھا۔ میں اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ لحاف کی گرمی سکون بخشنے لگی لیکن نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور طرح طرح کے خوبصورت خیالات میرے دل کو گدگدا رہے تھے۔ اور میں سوچ رہا تھا۔ دوسرے کمرے میں لیٹی نصرت بھی میری ہی طرح خوابوں اور خیالوں میں گم ہوگی۔

نصرت کو ڈھاکہ سے آئے ہوئے ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ وہاں کے حالات نے نصرت اور اس کے خاندان والوں کو ڈھاکہ چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ حالانکہ وہاں یہ لوگ آرام و آسائش کی زندگی گزار رہے تھے۔ لیکن وقت کی تیز آندھی نے ان لوگوں کے سارے سکھ چین کو کسی تنکے کی مانند اڑا لے گئی اور پھر لٹ پٹ کر آنسوؤں سے ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ ہندوستان اپنے عزیز و اقارب کے یہاں چلے آئے۔

بربادی کا غم سبھوں کے چہرے سے عیاں تھا۔ نصرت کے چہرے پر بھی اس کا گہرا اثر تھا۔ لیکن ہندوستان آنے کے بعد ہم لوگوں کی محبت اور خلوص نے اس اثر کو کسی حد تک کم کر دیا اور آہستہ آہستہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نظر آنے لگی تھی۔ کبھی کبھی تو وہ میری کسی

بات پر ایسا قہقہہ بلند کرتی کہ میں اسے تعجب بھری نظروں سے دیکھنے لگتا اور سوچتا کیا یہ وہی نٹ کھٹ اور شریر نصرت ہے، جو کبھی مجھ سے بات بات پر جھگڑا کیا کرتی تھی اور غصے کے عالم میں میری کتابیں اور سلیٹ پھینک دیتی اور کہتی تھی......

''دیکھو انول بھائی مجھ سے بات نہ کلو، ولنہ ٹھیک نہیں ہوگا۔'' میں اس کے جواب میں اس کے چھوٹے چھوٹے سنہرے بالوں میں لگے ربن کو کھینچ کو باہر بھاگ جاتا، اور جب واپس آتا تو دیکھتا میرے بکس کی ساری چیزیں بکھری پڑی ہیں۔ میں اُسے مارنے دوڑتا لیکن لوگوں کے بیچ بچاؤ سے معاملہ سرد پڑ جاتا۔

مجھے آج بھی وہ دن یاد ہے جب ہندوپاک کی تقسیم کے بعد چھوٹی سی نصرت اپنے خاندان والوں کے ساتھ پاکستان جارہی تھی۔ اسے جاتے ہوئے دیکھ کر میں بہت رویا تھا اور اس کے ساتھ جانے کو بضد تھا، نصرت بھی بار بار مجھے پکار رہی تھی۔

''آؤ انول بھائی! چلو نہ تم بھی میلے ساتھ، ہم دونوں وہاں کھوب کھیلیں گے...... نصرت کے بلاوے پر میں اپنی امّی کا ہاتھ چھڑا کر اس کے قریب جانا چاہتا تھا، لیکن گیٹ تک پہنچتے پہنچتے گاڑی اسٹارٹ ہو چکی تھی......''

اور آج وہی نصرت کتنی بدل گئی ہے۔

ڈھاکہ سے آنے کے بعد شروع میں ہمارے درمیان کئی دنوں تک شرم و حیا کا پردہ رہا، لیکن جلد ہی وہ مجھ سے بے تکلف ہو گئی اور میرے کمرے میں آکر مجھ سے گھنٹوں باتیں کرتی...... کافی رات گئے تک میں نصرت کے بارے میں سوچتا رہا بچپن کی یاد اور جوانی کے جذبات نے ایک عجب سی لذت پیدا کر دی تھی۔ جسے میں اپنے دل کے نہاں خانے میں محسوس کر رہا تھا۔ رات تین بجے کہیں جا کر مجھے نیند آئی خوابوں کی دنیا میں بھی وہی نصرت اور بھاگتی ہوئی کار میرا پیچھا کرتی رہی۔

صبح دیر سے آنکھ کھلی چائے لے کر ڈرائنگ روم میں اخبار دیکھنے داخل ہوا تو نصرت وہاں پہلے ہی سے موجود تھی۔ چائے کی پیالی تپائی پر رکھ کر اس کے سامنے خاموشی سے بیٹھ

گیا۔ وہ اخبار دیکھنے میں ایسا گم تھی کہ اسے میری آمد کا احساس تک نہ ہوا۔ بیٹھتے ہی میں نے اس کی اس لاپرواہی سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیا۔ اس کے حسن کو اپنی آنکھوں میں سمونے لگا...... نازک نازک متناسب سراپا، اجلا اجالا چاندنی سا رنگ، جھیل کی موجوں، اورلہراتے ہوئے ابشار کی طرح کاندھوں پر بکھرے لانبے بال معصومیت اور پاکیزگی سے آراستہ بڑی بڑی پرکشش سیاہ آنکھیں، جن میں شرم وحیا کے سرخ ڈورے ایسے محسوس ہورہے تھے جیسے کسی نے شراب کو بلوریں جام میں بھر دیا ہو...... میں اسے ایک ٹک گھورر ہا تھا کہ اچانک اسے چھینک آ گئی، چھینکنے کے لئے اس نے گردن اٹھائی تو سامنے مجھے بیٹھے ہوئے دیکھا۔ اس وقت اس کی عجب کیفیت تھی...... ایک طرف چھینک کا زور اور دوسری جانب میری موجودگی کا احساس آ...... آ...... جی...... آپ...... آ...... آ چھیں!

مجھے اس کی اس حرکت پر بے اختیار ہنسی آ گئی۔ کافی دیر تک میں ہنستا رہا' تو میری ہنسی پر وہ جھنجھلا گئی۔

''آپ عجیب آدمی ہیں؟ آ کر یہاں بیٹھ گئے اور مجھے پتہ بھی نہیں چلا؟''

''تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟''

''اچھا چھوڑیئے! دیکھئے یہ خبر آپ نے دیکھی؟

''کون سی خبر؟''

اس نے خبار کی ایک سرخی پر انگلی رکھ کر اخبار میرے ہاتھوں میں تھما دیا...... ڈھاکہ سے ہجرت کئے ہوئے لوگوں کے متعلق خبر تھی کہ جلد ہی ایسے لوگوں کو حکومت پاکستان اپنی پناہ میں لے لے گی۔

خبر پڑھ کر میں نے اس کا چہرہ دیکھا، بالکل سپاٹ تھا۔

''کیوں کیا خیال ہے؟'' میں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔''

''کس سلسلے میں؟''

''یہی پاکستان میں پناہ لینے کے بارے میں؟''

''نہیں اب نہیں، اف یا خدا کیسی کیسی مصیبتیں جھیلی ہیں ہم لوگوں نے اور اب تو اس ہندوستان سے مجھے پیار ہو گیا ہے' میرا مادر وطن......''

''صرف ہندوستان سے یا ہندوستانیوں سے بھی؟'' میں نے بیچ ہی میں سوال کر دیا۔ اور میرے اس سوال پر پہلے تو اس نے مجھے گھور کر دیکھا اور پھر مطلب سمجھ کر نظریں جھکا لیں اور، میں اس کی اس ادا کی سحر میں کھو گیا۔

نصرت میں واقعی مقناطیسی کشش تھی، دن بدن میں اس کی جانب کھنچتا چلا گیا اور کچھ اسی قسم کی کیفیت نصرت کی بھی تھی، یہی وجہ تھی کہ ہم دونوں بہت جلد ایک دوسرے کے قریب، بہت قریب آ گئے اور ایک دوسرے کو شدت سے چاہنے لگے۔

ایک رات دودھیا چاندنی پھیلی ہوئی تھی' لان میں چہل قدمی کر رہے تھے اور ساتھ ہی مستقبل کے بلند و بالا گھروندے بنانے میں مصروف تھے۔ اس نم آلود خوشبو والی اس رات کو ہم دونوں نے زندگی بھر ساتھ نبھانے کی قسمیں کھائیں۔ جیون ساتھی بننے کا عہد کیا۔

وقت دھیمی دھیمی چال سے بڑھتا رہا اور ہم دونوں کی محبت کا نازک پودا بڑھتے بڑھتے تناور درخت میں تبدیل ہو گیا۔ آہستہ آہستہ نصرت کا اصرار بڑھتا گیا کہ میں جا کر اس کے والد سے ملوں اور شادی کی بات طئے کر لوں، کئی دنوں تک اس کی ضد برقرار رہی تو مجبوراً ایک دن مجھے اس کے والد سے ملنے جانا پڑا۔

اپنے ٹائی کی گرہ درست کرتا ہوا میں جیسے ہی کمرے کے اندر داخل ہوا نصرت کے والد نے کہا۔

''آؤ آؤ بیٹا انور' کہو کیسے ہو؟''

''جی ٹھیک ہوں!''

دل دھڑک رہا تھا کہ پتا نہیں نصرت کے والد میری بات مانیں گے بھی یا نہیں، لیکن

پھر فوراً ہی دل کہتا ''نہیں نہیں'' یہ کیسے ہوسکتا ہے، تم کہوتو سہی وہ بھلا انکار کیوں کرنے لگے ۔تم دونوں کی محبت تو ایک چٹان ہے۔ جسے بڑی سے بڑی موج بھی ہلانہیں سکتی ۔ دل کی آواز نے میرے ارادے کومضبوط کیا اور میں نے آخر کہہ ہی دیا......

''چچا جان !اس وقت میں ایک اہم موضوع پر آپ سے گفتگو کرنے آیا ہوں''

''ہاں ہاں! کہو بیٹے کیا بات ہے؟ لیکن ارے ہاں، تمہیں ایک خوشخبری تو سنایا ہی نہیں میں نے، ابھی ابھی پاکستان کی حکومت نے ہم تمام لوگوں کے لئے پاسپورٹ اور ویزا بھیجا ہے، یہ دیکھو جہاز کے ٹکٹ......''

یہ کہہ کر انہوں نے کاغذات اور جہاز کے ٹکٹ میری جانب بڑھا دیا، جنھیں دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ سب پاسپورٹ اور ٹکٹ نہیں بلکہ کئی زہریلے سانپ ہوں۔ میں کانپ اٹھا۔

''ارے انور تمہیں کیا ہوگیا؟''

''جی کچھ نہیں ،ذرا یونہی طبیعت پریشان لگ رہی ہے'' اور یہ کہہ کر میں خاموشی سے اٹھا اور اپنے کمرے میں آکر اپنے بستر پر گر گیا اور دل کا درد آنسو بن کر بہنے لگے ۔ٹھیک تیسرے دن نصرت اور اس کے خاندان کے تمام افراد پھر پاکستان جارہے تھے ۔شاید خوش آئندہ زندگی گزارنے کے......لیکن کسے خبر تھی کہ کسی کی زندگی میں غم کا زہر گھل رہا ہے اور اس بٹوارے کی دیوار نے نہ جانے کتنے دھڑکتے ہوئے دلوں کو کچل دیا ہے، اور اب ایک بار پھر یہ دیوار نہ جانے کتنے چاہنے والوں کی لاشوں پر تعمیر ہو رہی تھی۔

ائیر پورٹ پر کسی عفریت کی مانند جہاز کھڑا تھا۔جس میں بہت سارے لوگ سوار ہے تھے اور آخر میں نصرت بھی سوار ہوگئی ،اس کی آنکھوں میں میری محبت آنسو بن کر جم گئی تھی ......اور پھر جہاز نے جیسے ہی اڑان بھری، میں بے اختیار سسک پڑا۔

جہاز بہت آگے بڑھ چکا تھا اور بیچ میں صرف خلاء ہی خلاء تھا!!!

ریت کی دیوار

یہ میں نے کیا کر دیا؟؟؟

اپنی بیوی کو، بچوں کو پڑوسیوں کو، اپنے خاندان والوں کو اور پورے سماج کو تو میں نے دھوکا دے دیا.........لیکن.........................

رہ رہ کر شفقت اور پیار سے منور وہ چہرہ میری نظروں کے سامنے گھوم رہا ہے اور اس چہرے سے میں خوف زدہ ہوں کہ کہیں یہ سچ نہ بول دے، لیکن مردے بولتے نہیں، میں خود کو سمجھانے کی کوشش کرتا اور کروٹ بدل لیتا ہوں، مگر نیند کوسوں دور کھڑی طنزیہ مسکراہٹ بکھیر رہی تھی۔ ایسی حرکت کے بعد بھی سکون اور اطمینان کی نیند...... ہونہہ!

میں آنکھیں بند کر لیتا ہوں شاید...... شاید نیند آ جائے۔ لیکن نیند کے بجائے پھر رہی چہرہ میری بند آنکھوں میں سماتا جا رہا تھا۔ میں چیخ پڑا، میری بیوی چیخ سن کر جاگ پڑی اور گھبراتے ہوئے بولی۔

''کیا ہوا جی؟''

اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں، آخر جواب دیتا بھی تو کیا۔ میرے جواب سے جھوٹ کا پردہ ہٹ جاتا اور میری پوری گھر گرہستی ریت کے دیوار کی مانند ڈھیر ہو جاتی، جسے میں نے کھڑی کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔

''بس یوں ہی کچھ نہیں، نیند نہیں آ رہی ہے۔'' میں نے بیوی سے جھوٹ کا سہارا لیا۔ جھوٹ --- جھوٹ......اور جھوٹ میں نے اپنے چاروں طرف جھوٹ کی دیواریں کھڑی کر دی ہیں۔

میری بیوی میرا جواب سن کر، مجھے کچھ عجیب نظروں سے دیکھتی ہوئی کروٹ بدل لیتی ہے

اور سونے کی کوشش کرتی ہے۔

میں بستر چھوڑ دیتا ہوں، مجھے بستر پر کانٹے ہی کانٹے محسوس ہوتے ہیں، سکون اور اطمینان کی زندگی جینے کی تمنا میں مجھ سے وہ جرم سرزد ہوگیا جس نے میرا سب کچھ چھین لیا، ......اپنی بیوی بچے کے سکھ کیلئے میں نے کتنی بڑی قیمت ادا کی ہے۔ میں اندر ہی اندر گھٹ رہا تھا۔ کروں بھی تو کیا کہوں بھی تو کیا......میرا المیہ یہ ہے کہ میں اپنے سینے کا بوجھ ڈھوتے رہنے پر مجبور ہوں۔ اندر ہی اندر گھٹتے رہنا اب میرا مقدر بن چکا ہے۔

میری نظروں کے سامنے یادوں کی انگنت چراغ روشن ہوجاتے ہیں اور میں ان جھلملاتے چراغوں میں کھو جاتا ہوں۔

میں اپنے بابا کی گود میں تھا، وہ مجھے پیار کر رہے تھے اور میں ایک کھلونا کے لئے بضد تھا، وہ سمجھا رہے تھے، شام میں وہ کھلونا لا دوں گا، اس وقت ضد نہ کرو، لیکن میری ضد تھی کہ نہیں، مجھے ابھی اور اسی وقت چاہئے اور آخر میری جیت ہوئی۔ بابا میری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتے تھے، وہ مجھے گود میں اٹھائے بازار گئے اور مطلوبہ کھلونا خرید دیا اور میں کھلونا لے کر خوشی سے اچھلنے لگا تھا۔

ایک دن بابا کارخانہ سے تھکے ماندے آئے اور مجھے گم صم اور خاموش دیکھا تو بے چین ہو کر جلدی سے مجھے گود میں اٹھالیا اور میری اداسی کی وجہ پوچھنے لگے، لیکن میں چپ رہا ان کے کافی اصرار پر میں نے بتایا کہ آپ نے سرکس دکھانے کا وعدہ کیا تھا، لیکن اب تک نہیں دکھایا۔ میری بات سن کر وہ ہنس پڑے، دیر تک ہنستے رہے۔ ''بس اتنی سی بات، میں کل تمہیں ضرور سرکس دکھانے لے چلوں گا۔'' انہوں نے وعدہ کیا اور سچ مچ دوسرے دن جب سویرے ہی کارخانے سے چھٹی لے کر آگئے اور مجھے رکشا پر بٹھا کر سرکس دکھانے لے گئے سرکس دیکھنے کے دوران ایک شیر کا بچہ سامنے آیا اسے دیکھتے ہی میری ضد شروع ہوگئی، ''میں وہ شیر کا بچہ لوں گا، میں وہ شیر کا بچہ لوں گا۔'' بابا مجھے سمجھانے لگے۔ نہیں بیٹے، یہ شیر کا بچہ سرکس والوں کا ہے۔ یہ کاٹ لیتا ہے، یہ آدمی کو کھا جاتا ہے، لیکن میں نے ایک نہ سنی

اور پھر میں رونے لگا۔ میری ضد پر انہیں غصہ آ گیا اور ایک چانٹا رسید کر دیا...... میرے رونے کی آواز بڑھتی گئی تو وہ پریشان ہو گئے۔ چانٹا مارنے کا خود انہیں افسوس تھا لیکن وہ کرتے بھی تو کیا، میری ضد ہی ایسی تھی...... وہ مجھے گود میں اٹھا کر باہر لے آئے۔ طرح کی مٹھائیاں، ٹافیاں، بسکٹ اور کھلونے خرید دئے لیکن میری ضد برقرار رہی اور گھر پہنچ کر میں روتے روتے سو گیا۔ صبح جب بابا کارخانہ چلے گئے تو میری موسی نے بتایا کہ بابا رات بھر نہیں سوئے۔ بار بار وہ مجھے سینے سے لگاتے اور چانٹا مارنے پر افسوس کر رہے تھے۔ موسی سے میں نے یہ بات سنی تو ایک لمحہ کے لئے میرے دل میں ہلچل سی مچی لیکن تھوڑی دیر بعد پھر ضد اور شرارت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

میں کچھ بڑا ہوا تو بابا نے ایک اسکول میں نام لکھا دیا، لیکن وہاں بھی وہی شرارت اور کھیل کود۔ ماں کا سایہ سر سے اُٹھ جانا اور کسی بھی بھائی بہن کی عدم موجودگی اور بابا کے بے جا لاڈ پیار نے مجھے بے حد شوخ اور شریر بنا دیا۔ میرا ہر مطالبہ صرف اس لئے پورا کیا جاتا کہ اس کے وجود پر ماں کا سایہ نہیں۔ بھائی بہن کی محبت سے بھی بے خبر ہے۔ ایک بیوہ بوڑھی موسی اور باپ کا سایہ ہی اس پر تھا اور یہ اسی بے جا لاڈ پیار کا نتیجہ تھا کہ مجھے پڑھائی لکھائی سے کبھی کوئی خاص دلچسپی نہ رہی۔ شرارت اور کھیل کود ہی میرا مشغلہ تھا، جس کے نتیجے میں کئی بار فیل ہونے کے بعد میٹرک پاس کر سکا۔ بابا کا خواب تھا کہ میرا بیٹا پڑھ لکھ کر نام کرے گا، ادھورا ہی رہ گیا۔

بابا بوڑھے ہونے لگے تب مجھے نوکری کی فکر ہوئی، لیکن نوکری جب پڑھے لکھے لوگوں کو نہیں ملتی، تو مجھے کہاں ملتی۔ بے روزگاری کا عفریت ہر طرف منہ کھولے نظر آیا اور یہ حالات کی ستم ظریفی ہی تھی کہ مجھ جیسے بے روزگار لڑکے سے بھی لوگ اپنی بیٹی بیاہنے پر رضا مند نظر آئے۔ کئی لڑکیوں کا رشتہ میرے بابا کے سامنے آ چکا تھا۔ بابا بڑے شش و پنج میں تھے کہ کروں تو کیا کروں۔ انہوں نے سوچا ممکن ہے شادی کے بعد لڑکی کی قسمت ساتھ دے اور کوئی روزگار مل جائے اور یہی سوچ کر انہوں نے چنچل سے میری شادی کر دی۔

چنچل بھی اپنی پلکوں پر کئی خواب سجا کر آئی لیکن اسے گھر کے چاروں طرف افلاس کا سایہ ہی منڈلاتا نظر آیا۔دھیرے دھیرے اس کے سارے خواب میری بے روزگاری، افلاس اور بھوک کی حقیقتوں سے ٹکرا ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہونے لگے ،وہ بجھی بجھی رہنے لگی۔اس کے ارمانوں کا خون ہو چکا تھا،اور اس کا لہولہان جسم دن بدن کمزور ہونے لگا۔اسی درمیان ہم دونوں کے پیار کی نشانی راہل نے جنم لیا۔ذمہ داری بڑھ گئی ،افلاس کا سایہ اور پھیل گیا۔ کمانے والا ایک بابا اور کھانے والے کئی۔ایسا لگتا گھر کے سب لوگ مل کر بابا کے بوڑھے جسم کا گوشت بھنبھوڑ رہے ہیں۔میں سوچتا،اچھا ہوا ماں مرگئی اور بابا نے دوسری شادی نہیں کی ورنہ ان کا حشر بھی وہی ہوتا جو آج ہم لوگوں کو ہو رہا ہے۔

عمر اور فکر سے نڈھال بابا بیمار پڑنے لگے اور لمبی بیماری کی وجہ سے اکثر وہ کارخانے سے غیر حاضر رہنے لگے،نتیجہ میں ہر ماہ ان کی تنخواہ کٹنے لگی۔

بابا کی بیماری، بیوی کی آنکھوں سے جھانکتی بے بسی ، بچّے کا بھوک سے بلکنا اور میری بے روزگاری......میں روز اخبار دیکھتا،نوکری کے لئے عرضیاں دیتا،لیکن ہر جگہ پیروی اور رشوت ،میرے پاؤں میں بیڑیاں ڈالدیتیں۔ایک دن اخبار میں نوکری کا کالم دیکھتے دیکھتے میری نظریں ایک خبر پر جم گئیں۔انوکمپا کے آدھار پر ۵۵ رلوگوں کو نوکری ملی۔نہ جانے اس خبر نے مجھ پر کیا جادو کردیا،میری آنکھیں چمک اٹھیں......بابا بیمار تھے...... اگر......انہیں کچھ ہو گیا تو کارخانہ میں مجھے نوکری ضرور مل جائے گی......میرے ذہن میں بجلی کوندنے لگی۔

روپے کی کمی سے بابا کے علاج میں بھی کمی آتی گئی۔بابا کے پیسے سے دوائیں خریدتا،یا سبھوں کو پیٹ بھرنے کے لئے چاول،دال خریدتا......بابا کی بیماری بڑھتی گئی اور میں انتظار کرنے لگا۔ایک غم کے بدلے ہزاروں خوشیاں......میری نظروں کے سامنے چاند تارے جگمگانے لگے۔میری بیوی نئی نویلی دلہن کی طرح سجی سنوری نظر آنے لگی۔اس کے زرد چہرے پر گلاب کھلنے لگے۔میرا بیٹا نئی نئی پوشاکوں میں ملبوس،ڈھیر ساری مٹھائیوں،ٹافیوں اور کھلونے کے ساتھ کھیلتا نظر آنے لگا۔ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں......میں خوشی سے جھوم

اٹھا۔

پاس پڑوس کے لوگ بابا کو دیکھنے آتے اور دیکھ کر کہتے ۔اب ان کا بچنا مشکل ہے...... یہ سن کر میں خوش ہوتا، لیکن ایک لمحہ کیلئے مجھے بڑا غصہ بھی آتا۔ کیوں، میرے بابا کے بارے میں لوگ ایسی منحوس بات کہہ رہے ہیں۔ بھگوان نہ کرے میرے بابا کو کچھ ہو...... لیکن دوسرے ہی لمحہ میری نظروں کے سامنے افلاس اور بے روزگاری کی چٹانوں سے ٹکراتا میرا مستقبل اور ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتی خوشیاں رقص کرنے لگتیں۔ میرے اندر ایک چیخ ابھرتی، جو اندر ہی اندر دم توڑ دیتی۔ میرے اندر ایک کشمکش جاری تھی۔ کبھی بابا کی گود میں کھلونے اور مٹھائیاں لئے خوش ہو رہا تھا اور کبھی میرا بیٹا راہل میری گود میں کھلونوں اور مٹھائیوں کے لئے بضد تھا۔ وہ مچل رہا تھا۔ پھر ایک آواز نے میری سوچ کے دائرہ کو سمیٹ لیا۔ بابا اپنی نقاہت بھری آواز سے مجھے پکار رہے تھے۔ میں دوڑتا ہوا ان کے قریب گیا۔ رات ڈھل چکی تھی۔ ہر سمت خوفناک تاریکیوں کا راج تھا، کہیں قریب ہی کتّوں کے رونے کی صدا فضا کو مزید ہیبت ناک بنا رہی تھی۔ وہ پانی مانگ رہے تھے، میں نے انہیں ہاتھ کا سہارا دے کر اٹھایا اور پانی پلایا...... پانی پی کر وہ لیٹ گئے، میں ان کے قریب بیٹھا سوچتا رہا۔ بابا کی بیماری کو کتنے ماہ ہو گئے ۔نہ جیتے ہیں اور نہ...... یہ کالی بھیانک رات اتنی لمبی کیوں ہوتی ہے؟ صبح کا اجالا پھیلنے میں اتنی تاخیر کیوں ۔میں بابا کے قریب ہو گیا ۔اور...... اور پھر نہ جانے کیا ہوا کہ میرے ہاتھ آہستہ آہستہ بابا کی نحیف گردن کی طرف بڑھنے لگے اور پھر میرے دونوں ہاتھوں کا دباؤ بابا کی گردن پر بڑھنے لگا ۔ایک لمحہ کے لئے میرے یہ ہاتھ رک گئے۔ ذہن میں ایک خیال نے سر ابھارا، یہ میں کیا کر رہا ہوں؟ لیکن دوسرے ہی لمحہ میرے سوچنے، سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو گئی اور میرے ہاتھوں کا دباؤ بابا کی گردن پر مزید بڑھ گیا۔ ایک ساعت کے لئے بابا کی آنکھیں کھلیں اور...... اور پھر وہ آنکھیں بے جان ہو گئیں۔ میں ان بے جان آنکھوں کو دیکھ کر چیخ پڑا۔ چیخ سن کر دوسرے کمرہ میں قریب ہی سوئی ہوئی میری بیوی جاگ گئی۔ وہ دوڑتی ہوئی آئی اور بابا کے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ بھی چیخ پڑی ۔بابا...... بابا

......وہ زار و قطار رونے لگی۔اس کے رونے کی آواز سن کر پڑوسی جاگ گئے۔پھر لوگوں کے آنے کا سلسلہ شروع ہوا......آخر بیماری نے جان لے ہی لی......پڑوسی آپس میں باتیں کر رہے تھے اور میں پتھر کی مورت بن گیا تھا۔لوگ سمجھ رہے تھے کہ باپ کی موت نے مجھے گہرا صدمہ پہنچایا ہے۔

دوسرے دن بابا کا انتم سنسکار کر دیا گیا اور کچھ دنوں بعد مجھے بابا کی جگہ پر کارخانہ میں نوکری مل گئی۔

نوکری کا پروانہ لئے میں خوشی خوشی گھر آیا..........مجھے لگا،جیسے میرے گھر کے چاروں طرف روشنی ہی روشنی جگمگا رہی ہے،خوشیاں ہی خوشیاں رقص کر رہی ہیں۔مجھے بے حد خوش دیکھ کر میرا بیٹا راہل اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر،میری گود میں آنا چاہ رہا تھا لیکن........ ....اچانک نہ جانے کیوں راہل کے اپنی جانب بڑھتے ہوئے ہاتھ دیکھ کر میں کانپ گیا۔ان ہاتھوں سے مجھے خوف محسوس ہونے لگا۔کہیں 'یہ ہاتھ' کبھی 'میرے ہاتھ' نہ بن جائیں؟

خلیج

انور گھر اور گھر سے باہر کی ہر چھوٹی بڑی باتوں کو بڑی شدت سے محسوس کرتا۔ والد کی محدود آمدنی کی وجہ کر تعلیم حاصل کرنے کی خواہش رکھتے ہوئے بھی وہ اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکا اور گھر کا ذمہ دار فرد ہونے کی وجہ سے گھر کی معاشی مجبوریوں کو سمجھتے ہوئے ایک موٹر گیراج میں کام پکڑلیا!

بچپن میں اس نے بھی خواب دیکھے تھے، رنگ برنگ خوشنما خواب۔ لیکن وہ خواب خواب ہی رہے، شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے۔ اس نے سوچا تھا میں بڑا ہو کر بڑا آفیسر بنوں گا۔ پہلی تنخواہ، جو ڈھیر سارے روپئے کی شکل میں ہوگی، ماں کے آنچل میں ڈال دوں گا۔ ماں اس دن کتنا خوش ہوگی۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو ہوں گے۔ محکمہ کی جانب سے ملنے والی گاڑی پر ماں کو اپنی بغل میں بٹھاؤں گا اور دور بہت دور سیر کراؤں گا۔ ماں کہے گی، بیٹا ذرا آہستہ گاڑی چلاؤ۔ لیکن میں تیز...... خوب تیز...... آندھی طوفان کی طرح گاڑی چلاؤنگا اور ایک شاندار ہوٹل کے سامنے گاڑی روکوں گا، ماں کو ہوٹل کی گدّے دار کرسی پر بٹھاؤں گا اور اس کے انکار کے باوجود ہر وہ چیز کھانے کو منگاؤں گا جس کی خواہش ایک زمانے سے ماں کے دل میں بسی ہے۔ ماں کو اتنے سکھ...... اتنے آرام دوں گا' کہ وہ ماضی کی ساری تکلیفوں کو بھول جائے گی۔ لیکن یہ سب کچھ نہیں ہوا۔ موٹر گیراج سے ملنے والی پہلی تنخواہ کی رقم اتنی کم تھی کہ ماں کو دیتے ہوئے اسے بڑی شرم محسوس ہوئی، وہ سوچ رہا تھا کہیں ماں یہ نہ کہہ دے۔ بیٹا تو نے یہی خواب دیکھے تھے؟"

اسی دوران والد، بڑا بابو ہو کر ریٹائر ہو گئے۔ محدود آمدنی مزید محدود ہو گئی، پپو اور بے بی کی فکر میں ماں باپ دونوں پریشان رہنے لگے، اور ان کی پریشانی کو دیکھ کر وہ والدین کو سمجھاتا، ''آپ لوگ کیوں پریشان ہوتے ہیں۔ میں ہوں نہ۔''

انور کی بات سن کر ماں اس کے گال تھپتھپا دیتی جیسے وہ کہہ رہی ہو، اب تم ہی ہمارا آسرا ہو۔

اور انور نے جو خواب اپنے لئے دیکھے تھے وہ اب اپنے چھوٹے بھائی پپو کے لئے دیکھنے لگا- پپو اس کی کوششوں سے پڑھے لکھے گا، بڑا آفیسر بنے گا، سارے شہر میں اس کی خوب عزت اور رعب سے لوگ میری بھی عزت کریں گے۔ اسے سرکاری گاڑی ملے گی۔ وہ اصرار کر کے مجھے اپنے ساتھ گھومنے لے جائے گا۔ اگر کبھی میں انکار کروں گا تو کہے گا۔ بھیا آپ نہیں جائیں گے تو میں بھی نہیں جاؤں گا۔ اتنے میں ماں آجائے گی اور کہے گی۔ پپو اتنا ضد کر رہا ہے تو جاؤ نہ، ساتھ میں گھوم آؤ اور میں اسکی بغل والی سیٹ پر بیٹھ جاؤں گا، پپو گاڑی اسٹارٹ کرے گا اور زوں سے گاڑی آگے بڑھے گی اور پھر راستے بھر خوشیاں ہی خوشیاں

......

انور پپو کی پڑھائی لکھائی کے لئے ہر ممکن تگ و دو کرنے لگا۔ بے بی کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر بھی اسے ستائے رہتی۔ ادھر گیراج کا مالک اس کی تنخواہ میں اضافہ کرنے پر رضامند نہیں تھا اور خرچ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ آخر ایک دن اس نے گیراج کا کام چھوڑ دیا اور اپنے ایک دوست سے موٹر ڈرائیوری سیکھنے لگا اور بہت جلد وہ ایک ماہر ڈرائیور ہو گیا اور ایک سرکاری محکمہ میں اسے ڈرائیور کی نوکری بھی مل گئی۔ پہلے دن جب وہ مجسٹریٹ صاحب کی کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تو اسے کچھ عجیب سا لگا۔ وہ سوچنے لگا اس نے جو خواب دیکھے تھے وہ کتنے برعکس روپ میں آج اس کے سامنے ہے۔ اس نے ایک سرد آہ بھری اور اگنیشن میں چابھی گھما کر گاڑی اسٹارٹ کر دی، اکسیلیٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھاتے اور کلچ چھوڑتے ہی کار زوں سے آگے بڑھی اور پھر ہوا سے باتیں کرنے لگی- پچھلی سیٹ پر سوٹ ٹائی میں ملبوس مجسٹریٹ صاحب تشریف فرما تھے۔ ان کے سگریٹ کے دھوئیں ونڈ اسکرین سے ٹکرا رہے

تھے ۔انور کے تصور میں مجسٹریٹ صاحب کی شکل میں اس کے چھوٹے بھائی پپو کی شبیہ ابھرنے لگی ۔کتنا ہینڈسم اور اسمارٹ لگے لگا میرا پپو، جب سوٹ ٹائی میں ملبوس شان سے وہ کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے گا اور اپنے ڈرائیور کو حکم دے گا۔'' آفس چلو۔''اور راستے میں پپو نے اگر کہیں اُسے دیکھ لیا تو وہ فوراً گاڑی رکوائے گا اور کہے گا -''بھیا کہاں جارہے ہیں، آیئے میرے ساتھ۔''اور میں بھی ایک شان سے پپو کے ساتھ بیٹھ جاؤں گا......

اچانک پٹرول پمپ آ گیا۔اس نے نیچے اتر کر کار کی ٹنکی فل کرائی اور گاڑی پھر ہوا سے باتیں کرنے لگی ۔ٹاپ گیر دیتے ہی اس کی سوچ کا زاویہ بدل جاتا ہے۔

اس کی آنکھیں کھلیں اور ہوش سنبھالا تو اپنے دادا اور ان کے چھوٹے بھائی کے درمیان ایک لمبی خلیج دیکھی ۔دونوں بھائی ایک ہی محلے میں چند قدم کے فاصلے پر رہتے ،لیکن دل کے اعتبار سے دونوں بہت دور تھے ۔دونوں کے درمیان کی خلیج بڑھتی گئی اور ایک وقت وہ بھی آیا، جب دونوں آمنے سامنے کسی اجنبی کی طرح گزر جاتے ۔ بڑھتی ہوئی خلیج کو کسی نے پاٹنے کی کوشش نہیں کی ۔جس کا نتیجہ ہوا کہ ان دونوں بھائیوں کے بیٹوں کے درمیان بھی خلیج کی بنیاد پڑی اور دن بدن بڑھتی چلی گئی اور انور نے یہ بھی دیکھا کہ اس کے والد اور ان کے چھوٹے بھائی کے درمیان خونی رشتہ بس نام کا رہا۔کسی تقریب یا تعزیت کے موقعہ پر خونی رشتے کا احساس جاگتا اور اس کے بعد پھر وہی خلیج !یہ سب دیکھ کر اس نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ اس روایت کو توڑ دے گا اور ایک نہ ایک دن وہ اس خلیج کو پاٹ کر رہے گا۔

پپو سے انور کی بے انتہا محبت اور خیال کے پیچھے ایک وجہ یہ بھی تھی ۔وہ پھر کسی خلیج کو جنم دینا نہیں چاہتا تھا-

خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔گاڑی آفس میں داخل ہو رہی تھی'انور نے بریک لگائے اور بڑھ کر مجسٹریٹ صاحب کے لئے کار کا دروازہ کھولنے لگا۔

انور ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو تنخواہ ملنے کے بعد اپنے گھر کے تمام لوگوں کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور خریدتا،ان میں پپو اور بے بی کی فرمائشوں کے سامان بھی ہوتے اور ایسا کر کے وہ دل

ہی دل میں ایک انجانی سی خوشی محسوس کرتا۔اس کے دوست کہتے ۔ارے یار تو اتنا کماتا ہے پھر بھی ہمیشہ پھٹے حال ہی رہتا ہے'اور جواب میں وہ خاموش رہتا۔اس لئے کہ اسے احساس تھا کہ اگر اس نے اپنے لئے کپڑے بنوائے تو پپو کو خیال ہوگا کہ میں ابھی کماتا نہیں'اس لئے میرے پاس اچھے کپڑے نہیں ہیں۔انور جب بھی کپڑے بنواتا سبھوں کے لئے ایک ساتھ۔تاکہ کوئی احساس کمتری کا شکار نہ ہو۔اس کے احساسات و جذبات کو اس کے ماں باپ بڑی اچھی طرح سمجھتے تھے اور دل ہی دل میں خوش ہوتے! یہی وجہ تھی کہ اس کے گھر میں داخل ہوتے ہی پورے گھر میں رونق سی آجاتی۔ماں،بے بی ہر طرح اس کے آرام کا خیال رکھتیں۔پپو بھی ان کا بے حد خیال رکھتا۔

دن گذرتے گئے اور انور کی کوششوں سے پپو نے بی۔اے کرلیا اور ایک دن انور کی خوشی کی انتہا نہ رہی جب پپو نے مقابلے کا امتحان بھی اچھی پوزیشن سے پاس کرلیا اور انکم ٹیکس آفیسر ہوگیا۔

پپو کی اس ملازمت کے ساتھ گھر کے ہر کونے سے سکھ چین اور آرائشیں جھانکنے لگیں۔ کمروں اور برامدوں کی خالی جگہ بھرنے لگیں۔ٹی ۔وی،فریج،ڈریسنگ ٹیبل،الماری، گدے دار مسہری،ڈائننگ ٹیبل،صوفہ سیٹ،گیس چولھا پورے اداس گھر کا نظام بدل گیا۔

لیکن ایک بات یہ ہوئی کہ انور کے گھر میں داخل ہوتے ہی جو خوشیاں مسکراتی تھیں،اب ان خوشیوں کا مرکز پپو ہوگیا تھا۔ماں اور بے بی،جس انور کے گھر میں داخل ہوتے ہی اس کے اوپر محبت اور پیار نچھاور کرتی تھیں۔اس محبت اور پیار کو سرد ہوا جیسے اڑا لے گئی-انور کبھی دو چار گھنٹے تاخیر سے آتا تو گھر کا ہر فرد پریشان ہوجاتا تھا اور اس کے آتے ہی۔

''انور اتنی دیر کہاں رہ گئے تھے۔بھیا کیوں اتنی دیر باہر رہتے ہو،کب سے کھانے پر تمہارا انتظار ہو رہا ہے''

جواب میں وہ اپنی مجبوریاں بتاتا ہوا سبھوں کے ساتھ کھانے پر بیٹھ جاتا-لیکن اب انور کا کوئی انتظار نہیں کرتا،ہاں پپو کبھی آدھا گھنٹہ بھی دیر سے آتا تو فون پر فون کئے جاتے،انور

یہ سب دیکھتا، محسوس کرتا اور خاموش رہتا، دل کو سمجھانے کی کوشش کرتا ،لیکن اس میں وہ کامیاب نہیں ہوتا۔

ایک دن وہ بھی آیا، جب پپو، نئی چمچماتی سفید رنگ کی کار لے کر گھر آیا۔ سارے لوگ دوڑ پڑے۔ انور بھی ساتھ تھا۔ دوڑ کر پپو کو گلے لگالیا، اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو لرز رہے تھے۔ مبارک ہو پپو۔ ماں باپ' بے بی سبھی بے حد خوش تھے۔ انور خوشی سے بے قابو ہو کر کار میں بیٹھ گیا۔ اگنیشن میں چابھی لگی ہوئی تھی۔ اس نے اسٹارٹ کیا اور زوں سے گاڑی آگے بڑھی۔ انور آج بے حد خوش تھا۔ اس کے دیکھے ہوئے خواب سچ ہو رہے تھے۔

انور نے اپنے تمام دوستوں کو فخریہ کار دکھائی، اس انداز سے جیسے یہ کار پپو نے نہیں خود اس نے خریدی ہے۔ فخر اور خوشی سے اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ دوستوں نے انور سے کہا......

''ارے یار کبھی ہم لوگوں کو بھی گھماؤ، تب نہ سمجھوں۔''

انور نے جھٹ کہا۔

''یہ کون سی بڑی بات ہے۔ کل سنڈے ہے ۹؍ بجے تم لوگ تیار رہنا ہم سب رام گڑھ گھومنے چلیں گے۔''

دوسرے دن انور نے سویرے ہی ناشتہ کیا اور اپنے سب سے اچھے کپڑے پہن کر باہر جانے کو تیار ہوا۔ پپو کے کمرے کے اندر ٹیبل پر رکھی کار کی چابی اٹھائی اور باہر نکل کر کار اسٹارٹ کر کے گیراج سے نکالی ہی تھی کہ اس نے دیکھا، اندر سے پپو بڑی تیزی سے اس کی طرف آرہا ہے اور آتے ہی اس نے سوال کیا......

''کہاں چلے بھیا؟''

''ارے دوستوں کا بہت اصرار ہے، اس کار میں گھومنے کا۔ اس لئے آج ہم لوگ رام گڑھ جارہے ہیں، شام تک لوٹ آئیں گے۔''

یہ کہہ کر انور ا کسیلیٹر پر پاؤں ڈال کر گاڑی آگے بڑھانے لگا، گاڑی ابھی چند قدم آگے ہی بڑھی تھی کہ پپو نے ہاتھ کے اشارے سے گاڑی کو روکنے کا اشارہ کیا۔ انور نے گاڑی روک کر استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا، اس نے سوچا شاید پپو کہے گا، میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ گھومنے چلوں گا۔ لیکن نہیں، پپو کے چہرے اور آنکھوں میں برف کی سی سختی تھی، وہ کہہ رہا تھا۔

"سنئے یہ آپ کے صاحب کی کوئی سرکاری گاڑی نہیں ہے جو......!"

اس جملے کے بعد پپو نے کیا کہا، انور سن کر بھی نہ سن سکا، اس کے کان جھنجھنا اٹھے تھے۔ چہرے پر پسینے کی بوندیں نمودار ہو گئیں۔ اس کے دل میں درد کی شدید لہر اٹھی۔

بے جان ہاتھوں سے اس نے گاڑی کا انجن بند کیا، آہستگی سے کار کا دروازہ کھولا، چابی پپو کے ہاتھ میں دی اور اپنے کمرے میں آ کر بستر پر ڈھیر ہو گیا۔

دوسرے کمرے سے ماں کی آواز آ رہی تھی "ارے اس ڈریسنگ ٹیبل کے آئینہ پر بال کیسے آ گیا؟"

❁

آئینے کی گرد

میں اپنے بابا کے پرانے اور شکستہ مکان کو چھوڑ کر اپنے نئے مکان میں شفٹ کر گیا، جس کے ہر کمرے برآمدے، کونے اور در و دیوار سے میری اعلیٰ رہائش اور دولت مندی کے ثبوت جھانک رہے ہیں۔ کیا نہیں ہے میرے اس نئے اور شاندار مکان میں؟ ہر وہ چیز جو غربت اور مفلسی کو شرمندہ اور میری شان و شوکت میں اضافہ کرے۔

اس مکان میں آ کر میں بے حد خوش ہوں۔ مجھ سے زیادہ میری بیوی اور میرے بچے خوش ہیں۔ اس پرانے اور بوسیدہ مکان میں کیسا دم گھٹتا تھا۔ ہر وقت ایک ہنگامہ ایک شور، ضرورت مطالبہ...... اُس مکان میں تو خود میں اپنی پہچان نہیں بنا سکا تھا۔

بابا پانچ سال ہوئے، ہیڈ کلرک کے عہدہ سے ریٹائر ہو کر گھر پر بیٹھ گئے۔ انہیں ملنے والی پنشن محدود۔ اور ضرورت کا پھیلتا ہوا منھ۔ روز روز کی بیماری۔ ڈاکٹر، دوا کبھی یہ، کبھی وہ۔ میں آجز آ چکا تھا۔ میری بیوی کا ان کے مطالبوں پر جھنجھلا جانا بھی فطری تھا۔ بھیا ٹھہرے کالج کے پروفیسر۔ دن رات بس کتابوں کے ڈھیر میں ڈوبے رہنا۔ اور دانشوروں کے ساتھ بیٹھ کر دانشوارانہ باتیں، ملکی اور غیر ملکی، سیاسی، سماجی اور معاشرتی انقلاب پر تبادلۂ خیال۔ ہر دن اخباروں اور رسالوں میں دانشوارانہ خیالات سے مزین ان کے مضامین کی اشاعت، جس کی گونج بہت دور تک سنائی دیتی، لیکن ان باتوں سے کہیں گھر کی مفلسی اور تنگدستی دور

ہوئی ہے۔ بھیا بین الاقوامی سیاسی، سماجی تبدیلیوں پر نظر رکھتے' لیکن گھر کے اندر رونما ہونے والی تبدیلیوں سے وہ بے خبر تھے شاید اور مجھے جیسے ہی نوکری ملی وہ ساری چتاؤں سے الگ ہوگئے، مجھے نوکری ملی تو کیا، میں اپنی خوشیوں کو اس طرح ختم کردوں؟ ایک کمرے تک محدود اور قید کردوں، جہاں بھیا کالج سے آنے کے بعد مقید رہتے ہیں۔ ان کے تین بچے، بھابھی ،بابا، ماں پھر میرا اپنا خاندان۔ آخر میں بھی تو انسان ہوں، میرے بھی تو سپنے ہیں۔ مانا کہ بچپن سے جوانی تک میری پڑھائی لکھائی، رہنے سہنے، کھانے پینے پر بھیا کی پوری توجہ رہی۔ مجھے نوکری دلانے میں بھی اگر چالیس ہزار روپئے اپنے پی۔ ایف سے نکال کر نہ دیتے تو شاید پولیس سب انسپکٹر کی یہ نوکری بھی مجھے نہیں ملتی لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں اپنی ساری آمدنی ان لوگوں پر خرچ کردوں؟ میں خوابوں میں رنگ بھرنا چاہتا تھا۔ اپنا گھر ہو، خوبصورت، سجا سجایا گھر، جہاں آرام وآسائش کا سارا سامان موجود ہو۔ ملنے والے آئیں تو میرا Living Standard دیکھ کر عش عش کر اٹھیں، میری بیوی اور بچے احساس کمتری کے شکار نہ ہوں۔ اچھا اسکول، اچھا کپڑا اچھا کھانا اور اچھی رہائش ہی تو انسان کو بڑا اور باعزت بناتی ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ جس کسمپرسی کے عالم میں، میں نے زندگی گزاری ہے اور سو پچاس روپئے کے لئے بھی مجھے بابا اور بھیا کے سامنے ہاتھ پھیلانا پڑتا تھا، ان کا محتاج رہنا پڑتا تھا، وہ حالات میرے بچوں کو پیش آئیں۔

میرے پاس روپئے پیسے کی کمی نہیں ہے۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد بھیا کے لاکھ سمجھانے کے باوجود بھی میں نے کالج کی ملازمت کے بجائے پولیس کی نوکری کو ترجیح دی۔ اس لئے کہ میری نظروں کے سامنے ہی پروفیسر بھیا اور سب انسپکٹر رائے جی تھے۔ دونوں کی رہائش میں آسمان زمین کا فرق ہے۔ عقلمند انسان وہی ہے جو اپنے اردگرد کے حالات سے سبق سیکھے اور بھیا کے حالات یقینی طور پر میرے لئے سبق آموز تھے۔ اس لئے سب انسپکٹر پولیس کی نوکری پا کر میں بے حد مطمئن ہوں اور اسی نوکری نے آج مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ میرے سارے آدھے ادھورے خواب سچ ہوگئے۔ اس نوکری میں یہاں ہزار پندرہ سو

روپے کی روزانہ آمدنی، کوئی خاص بات نہیں ہے اور ان ہی روپے سے آج میرے گھر آنگن میں خوشیاں رقص کررہی ہیں۔ میرے بچے مسرتوں کے جھولے میں جھول رہے ہیں، بیوی میری سکون آرام اور اطمینان کے سائے میں نرم نرم صوفے پر بیٹھ کر اپنی دوستوں کے ساتھ رنگین ٹی۔وی پر اپنی پسند کا کیسٹ لگا کر فلم دیکھتی رہتی ہے۔گھر کا کام نوکر دائیوں نے سنبھال لیا ہے۔میری بیوی بس حکم چلاتی ہے۔اور میں، میں تو صبح سے شام شام سے رات گئے تک چوروں، ڈاکوؤں قاتلوں اور مجرموں کے آگے پیچھے بھاگتا رہتا ہوں، اور میری جیب لال، ہرے نوٹوں سے بھرتی رہتی ہے۔ ایسے لمحوں میں مجھے لگتا، میں اپنی جیب روپیوں سے نہیں، بلکہ آرام، سکون اطمینان اور آسائشوں سے بھر رہا ہوں اور گھر جا کر اپنی پاکٹ سے نکال کر اپنے گھر کی پوری فضا میں بکھیر دوں گا، جس سے میرا گھر جگ مگ جگ مگ کر اٹھے گا۔

یوں تو مجھے فرصت ہی کم ملتی ہے، لیکن جب تھوڑی بہت ملتی تو بیوی اور بچوں کے ساتھ آؤٹنگ کیلئے نکل جاتا۔سیر سپاٹا اور پھر مہنگے ہوٹلوں میں کھانا بڑا اچھا لگتا۔ کبھی کبھی میں اپنے بابا، ماں، بھیا، بھابی وغیرہ سے بھی ملنے جاتا، اور جب بھی جاتا مجھے بہت وحشت سی محسوس ہوتی۔ پرانہ بوسیدہ سا مکان ۔ ہر طرف ادھڑی ہوئی در و دیوار ۔غربت اور مفلسی کی کہانی سناتی رہتی۔ باہر کے کمرے میں بیٹھے بھیا سے بھی ملنے جاتا، ہمیشہ کی طرح دو چار پروفیسر اور ادیب و شاعر بیٹھے ہوئے ملتے اور بدلتے ہوئے سیاسی اور سماجی حالات پر تبصرہ چلتا رہا۔ بڑھتی ہوئی لاقانونیت، رشوت خوری اور ٹوٹتے ہوئے سماجی رشتوں۔ نفرت اور بیزاری کا اظہار– نہ جانے کیوں ان لوگوں کی یہ باتیں سن کر میں شاندار کپڑوں میں بھی خود کو ننگا محسوس کرنے لگتا –لیکن جلد ہی ذہن کو جھٹک دیتا اور جی چاہتا کہ ان لوگوں کے سامنے چیخ چیخ کر کہوں–آج کے زمانے میں ایمانداری کوئی فخر کرنے کی چیز نہیں رہ گئی ہے، دیکھئے اپنی حالت، دیکھئے اپنے گھروں کی حالت ۔ایمانداری کی پوجا کرنے والو۔کیا ملا ہے آپ لوگوں کو، سوائے غربت اور مفلسی کے۔لیکن میں چاہ کر بھی یہ باتیں نہیں کہہ پاتا۔اس لئے کہ۔یہ

کے پاس جو لوگ بھی بیٹھے تھے وہ زمانے کے لحاظ سے امیر نہیں تھے، لیکن ان کی باتیں، ان کی سوچ اور فکر اتنی بلندیوں پر تھیں، جہاں میری نگاہیں نہیں پہنچ پاتیں۔ ان تمام لوگوں کا ذکر آئے دن کسی نہ کسی شکل میں ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات میں ضرور آتا...... گھر سے باہر لوگ انہیں بڑی عزت واحترام کی نظروں سے دیکھتے...... کبھی کبھی خواہش ہوتی کہ میرا بھی نام ریڈیو، ٹی وی اور اخباروں میں آئے اور میں اپنے دوستوں کو اپنی بیوی بچوں کو فخریہ دکھاؤں سناؤں۔ ایک بار میرا نام اخبار میں شائع بھی ہوا تھا لیکن وہ اخبار لوگوں کو فخریہ دکھانے کے بجائے دوستوں کے ساتھ ساتھ اپنی بیوی اور بچوں تک سے چھپائے پھرا۔ وہ خبر ہی ایسی تھی۔ وہ تو کہئے میرے پاس اتنے روپے ہیں کہ میں نے ایک ہفتہ کے اندر ہی سارا معاملہ جھوٹا ثابت کر دیا۔ پیسے کی یہی تو سب سے بڑی خوبی ہے کہ اس سے جو چاہو خرید لو۔

وقت پَر لگائے اڑتا رہا، تیز بہت تیز۔ میں ترقی کرتا رہا۔ میرا مکان ایک منزلہ سے دو منزلہ اور پھر تین منزلہ ہو گیا۔ بابا، ماں بھیا، بھابھی وغیرہ سے میری دوری بڑھتی گئی۔ فرصت کہاں رہتی کہ ان سے جا کر ملوں۔ ایک دن اخبار میں دیکھا کہ بھیا کو کوئی بڑا ایوارڈ ملا ہے، لوگ لوگ پکڑ پکڑ کر مجھے مبارکباد دینے لگے۔ میرے ایس پی صاحب کو بھی معلوم ہوا، تو مجھے بلا بھیجا اور بڑی عزت سے اپنے سامنے کی کرسی پر بٹھایا، بڑی دیر تک بھیا کے بارے میں باتیں کرتے رہے اور ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس دن میرا سر فخر سے اونچا ہو گیا اور بھیا اور مجھ میں کیا فرق ہے، سمجھ میں آیا۔ میں دوڑا دوڑا بھیا کو مبارکباد دینے گیا۔ اس دن بھی اسی خلوص، محبت اور مسکراہٹ کے ساتھ ملے، کوئی تبدیلی نہیں، کوئی حرف شکایت نہیں۔ ہمیشہ کی طرح ان کے کمرے میں دانشوروں کی بھیڑ اکٹھا تھی اور چائے کا دور چل رہا تھا۔ میں سوچنے لگا۔ میرے پاس ایسے لوگوں کی بھیڑ کیوں نہیں ہوتی۔ یہاں نہ شاندار ڈرائنگ روم ہے، نہ اے سی ہے، نہ قالین ہے، نہ نرم نرم صوفہ ہے۔ پھر بھی بھیا خوش ہیں۔ ان کے بچے خوش ہیں، بھابھی خوش ہیں۔ گھر کے اندر گیا تو دیکھا بابا اور ماں اپنے کمرے میں ہیں اور بھیا کے بچوں میں کوئی اپنے دادا کا پاؤں دبا رہا ہے، کوئی دادا کے سر میں مالش کر رہا ہے

اور کہانی چل رہی ہے، راجہ رانی کی، دیو پریوں کی...... یہ لمحہ یہ پل - لگا میں یہ لمحہ یہ پل چرالوں...... آج نہ جانے کیوں، مجھے یہ شکستہ اور پرانا، لیکن خوشیوں سے بھرا گھر بڑا اچھا لگا - میری نظروں کے سامنے سوالوں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا۔ ان ہی سوالوں کے ادھیڑ بن میں میں گھر پہنچا۔ کار کا ہارن سن کر چوکی دار نے مین گیٹ کھولا کار کو پورٹیکو میں ہی چھوڑ کر گھر کے اندر داخل ہوا' دیکھا ڈرائنگ روم میں میری بیوی سونے کے زیورات سے بجی سنوری اپنی سہیلیوں کے ساتھ بیٹھی ہے۔ دوسرے کمرے میں میرے بچے اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر کوئی نئی فلم دیکھ رہے ہیں۔ میں دونوں کمرے سے گزرا۔ لیکن کسی نے بھی میرے آنے کی نوٹس نہیں لیا - میں اپنے بیڈروم میں آ گیا۔ کپڑے تبدیل کر کے اپنے بستر پر نڈھال گر پڑا۔ تپائی پر رکھا آج کا اخبار اٹھایا - لیکن یہ کیا؟ میری نظریں اخبار پر تھیں' لیکن ذہن سوالات کے اُدھیڑ بُن میں کھویا ہوا تھا۔ اخبار کے پورے صفحہ پر سوال ہی سوال بکھرے پڑے ہیں - میں نے صفحہ پلٹ دیا لیکن دوسرے صفحہ پر بھی وہی سوالیہ نشانات - میں اسی طرح صفحات پر صفحات پلٹتا رہا اور ہر صفحہ پر مجھے سوالیہ نشان ہی نشان نظر آئے - گھبرا کر میں نے اخبار کو دور پھینک دیا اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر لیٹ گیا۔ کافی دیر بعد میری بیوی کمرے میں داخل ہوئی......

"ارے آج کیا بات ہے اس طرح خاموشی سے لیٹے ہوئے ہیں۔" بیوی نے سوال کیا۔ تمہیں میری پرواہ ہی کہاں رہتی ہے؟" یہ شاندار مکان، یہ آرام و آسائش، تمہیں فرصت کہاں دیتی ہے؟" - میری بات سن کر بیوی خاموش ہوگئی۔

کچھ دیر بعد میں نارمل ہوا، تو مجھے یاد آیا۔ آج میرے بیٹے ارشد کے میٹرک کے ریزلٹ کا دن ہے۔ میں نے بیوی سے پوچھا - "کیا رہا ارشد کا ریزلٹ؟"

بیوی میرا سوال سن کر خاموش رہی - لیکن میرے استفسار پر جو جواب اس نے دیا، اسے سن کر مجھے ایک جھٹکا لگا......

ارشد کا ریزلٹ خراب ہو گیا، اگلے سال ضرور پاس کر جائے گا۔"

بیوی نے یہ بات بڑے اطمینان سے کہی جیسے کوئی خاص بات ہی نہ ہو، میں مگر چیخ پڑا۔

''بلاؤ اسے کہاں ہے وہ؟''

تھوڑی دیر بعد ارشد کمرے میں داخل ہوا۔ چہرے پر ناکامی کا کوئی تاثر نہ تھا۔

''کیا میاں، سنا، تمہارا ریزلٹ خراب ہو گیا ہے۔''

میرے سوال پر وہ خاموش رہا۔ مجھے اس کی خاموشی گراں گزری اور میں نے آگے بڑھ کر اس کے گالوں پر دو چار تھپڑ لگا دئے۔ وہ رو پڑا اور اپنی ممی سے لپٹ گیا۔ وہ کافی دیر اپنی ممی سے لپٹا سسکتا رہا۔ مجھے بھی افسوس ہونے لگا۔ آج پہلی بار میں نے اپنے پھول جیسے بیٹے کی پٹائی کر دی تھی۔ لیکن کیا کرتا اس کی ناکامی نے میرا منھ چڑھا دیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد میں نے ارشد کو اپنے قریب بلایا، اپنے سینے سے لگایا اور اسے سمجھانے لگا...... ''بیٹے دیکھو، پڑھائی، لکھائی بہت ضروری ہے، دل لگا کر پڑھو گے تبھی بڑا آدمی بنو گے اور بیٹا اگر بڑا آدمی بننا ہے تو مجھ جیسا مت بننا، اپنے خول میں سمایا ہوا، بلکہ بڑا آدمی، اپنے بڑے پاپا جیسا بننا۔ میں ہرگز بڑا آدمی نہیں ہوں۔ میں نے اپنے ارد گرد ریت کی بنی دھوکے کی دیواریں کھڑی کر رکھی ہیں اور خود بھی فریب میں مبتلا ہوں اور تم لوگوں کو بھی مبتلا کئے ہوئے ہوں۔''

یہ کہہ کر میں ارشد کے گال پر بہتے ہوئے آنسو پوچھنے لگا اور میری بیوی سامنے دیوار پر لگے آئینے کی گرد صاف کرنے لگی۔

تشویش

بہت دنوں کے بعد اچانک ان سے بازار میں ملاقات ہوگئی۔ سلام کلام کے بعد ہم دونوں نے ایک دوسرے کی خیریت پوچھی۔ وہ بتانے لگے کہ" یہاں ایک جگہ زمین مل گئی ہے آج اس کی رجسٹری ہے، اسی سلسلے میں مصروف ہوں۔"

"تو شام میں آپ فری ہیں نا؟"

"ہاں بالکل۔"

"پھر شام میں غریب خانے پر آجایئے، شام کی چائے اور رات کا کھانا ساتھ کھائیں گے۔"

"مکان میرا گاندھی نگر میں کسی سے پوچھ لیجئے گا پتا چل جائے گا۔"

"ٹھیک ہے ضرور آؤں گا۔"

یہ کہہ کر انہوں نے مصافحہ کیا اور آگے بڑھ گئے۔ میں کئی منٹ تک کھڑا ان کے بارے میں سوچتا رہا، کتنی تبدیلی آگئی، کتنے بدلے بدلے نظر آرہے ہیں، چہرے پر شادابی ہے صحت بھی شاندار ہوگئی ہے، لباس بھی قیمتی ہیں۔

ایک وہ دن تھا جب قاسم بھائی دانے دانے کو محتاج تھے، کتنی غربت اور افلاس بھری زندگی تھی، ان کی لیکن اب تو زندگی ہی بدل گئی ہے۔

میں یہی سب سوچتا بازار سے گھر آ گیا، بیوی کو تاکید کی کہ "شام کی چائے اور رات کے کھانے پر ہمارے قاسم بھائی آرہے ہیں، کھانا ذرا پر تکلف ہونا چاہئے۔"

بیوی انتظام میں مصروف ہو گئیں اور میں شام اور رات کے کام نپٹانے لگا کہ قاسم بھائی کے آجانے کے بعد گپ شپ کا سلسلہ شروع ہوگا تو نا معلوم کتنی رات گئے وہ سلسلہ ختم ہوگا۔"

شام ہو گئی اور میں انتظار ہی کرتا رہا۔ مایوس ہو کر بیوی، بچوں کے ساتھ ہی چائے پی لی۔ بیوی تشویش کا اظہار کرنے لگیں کہ اگر کھانے پر بھی نہیں آئے تو......"

میں خاموش رہا، اس لئے کہ میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ اچانک ساڑھے نو بجے شب میں دروازے پر دستک ہوئی، دروازہ کھولا تو دیکھا سامنے قاسم بھائی کھڑے ہیں۔ کہنے لگے۔ "ارے کیا بتاؤں رجسٹری میں کافی تاخیر ہو گئی۔ پھر حساب کتاب میں وقت لگ گیا۔ مجھے بے حد افسوس ہے کہ تمہیں انتظار کرنا پڑا۔"

میں نے کہا۔ "کوئی بات نہیں آیئے، ویسے اب ہم لوگ مایوس ہو رہے تھے۔"

ڈرائنگ روم میں وہ آکر بیٹھ گئے، کہنے لگے یار تم نے مکان بڑا شاندار بنوایا ہے، یہ ٹی وی کس کمپنی کی ہے، یہ فریج تم نے لے لیا ہے، بڑا اچھا کیا۔ اس گیا کی گرمی میں آدمی تڑپ تڑپ کر مر جائے، اگر پینے کو ٹھنڈا پانی بھی نہ ملے ایر کنڈیشن کیوں نہیں لگا لیتے؟"

"ایر کنڈیشن تو نہیں، دو کمروں میں کولر لگا لیا ہے۔ اب کچھ راحت ہے، ورنہ دن میں چین تھا نہ رات میں۔ اب خدا کا شکر ہے۔ ایک جنریٹر بھی لے لیا ہے، جس سے بجلی کی کمی کی بھی فکر نہیں۔"

میری بات سن کر قاسم بھائی بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے۔

"میں بھی اپنا مکان تمہارے اس مکان کی طرز پر بنواؤں گا۔ خدا خدا کر کے رجسٹری تو ہو گئی ہے۔ اب صرف سرکاری لون لینا باقی ہے۔"

اچانک وہ کھڑے ہو گئے۔

''یاروقت نکل جائے گا،ذراعشاء کی نماز پڑھ لوں پھر گپ شپ ہوگی اور کھانا کھایا جائے گا۔''

وہ وضو کر کے آئے تو مذاق میں کہنے لگے۔

''بھئی وہ جاءنماز تمہارے گھر پر ہے یا پڑوسی کے یہاں سے منگوانی ہوگی۔''

''نہیں قاسم بھائی ایسی بات نہیں، جاءنماز ہے،ابھی ابھی تو دادی ماں نماز سے فارغ ہوئی ہیں، یہ لیجئے۔''

میں نے اپنی بیوی کے ہاتھ سے لے کر جائے نماز انہیں دی اور جب وہ نماز میں مصروف ہو گئے تو میں نوکر کو میز پر کھانا لگانے کی ہدایت دینے لگا۔

تھوڑی دیر بعد قاسم بھائی نماز پڑھ کر آئے تو کھانا ڈائننگ ٹیبل پر لگ چکا تھا۔ دیکھتے ہی کہنے لگے۔''ارے یہ ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگانے کی کیا ضرورت تھی ،فرش پر لگوایا ہوتا ،،اپنے حضور کی جہاں تک ممکن ہو، پیروی کرنا چاہئے ،ورنہ اب رہ کیا گیا ہے...... ''

''ہاں یہ تو صحیح ہے، پراب کھانا لگ چکا ہے،تو آیئے یہیں کھالیا جائے۔''

وہ جواب میں مسکراتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئے ،اور ہم دونوں کھانا کھانے کے ساتھ ساتھ آج کی سماجی ،سیاسی اور معاشی حالات پر تبصرہ کرنے لگے۔

قاسم بھائی کہہ رہے تھے''اب دیکھو نہ کرپشن کس قدر بڑھ گیا ہے، جدھر جاؤ ادھر رشوت خوری ہے،چور بازاری ہے ۔ ہر چیز کی قیمت بڑھتی جارہی ہے ،آج کل بھلے انسان کا گذر محال ہے۔''

''ہاں بالکل بجا فرما رہے ہیں،آج کا پورا سماجی نظام درہم برہم ہو گیا ہے، شاید ہی کوئی ایسا محکمہ ہوگا جہاں کرپشن نہیں ہے۔ درس گاہوں میں تعلیم نہیں ہو رہی ہے، لیکن ہر ماہ چھ ماہ پر مشاہرہ بڑھانے کے لئے ہڑتال اور تالہ بندی۔ دفاتر میں لوگ وقت پر نہیں آتے ،آتے بھی ہیں تو کینٹین اور ادھر ادھر کی لغویات میں مصروف رہتے ہیں۔ کام اسی کا کرتے ہیں،

جس سے کچھ ''اوپری'' ملتی ہو یا ملنے کا وعدہ ہو۔ہسپتالوں میں دوائیں نہیں ملتی ہیں، سرکار لاکھوں کی دوائیں دیتی ہے، اور وہ دوائیں مریضوں کو ملنے کے بجائے بازار میں بکتی ہیں۔ ڈاکٹروں کا یہ عالم ہے کہ نوکری کرتے ہیں سرکاری ہسپتالوں میں، لیکن زیادہ سے زیادہ وقت اپنی پرائیویٹ کلنک میں دیتے ہیں۔ٹرینوں میں بغیر ٹکٹ یا ٹی ای۔کنٹریکٹ کر کے سفر کرنے کا چلن عام ہے۔اب دیکھئے میرے پڑوسی مسٹر شرما ہیں جو آب پاشی کے محکمہ میں انجینئر ہیں، بیس لاکھ روپے صرف مکان بنوانے میں خرچ کیا ہے اور......''

ارے تم ایک کی بات کر رہے ہو' آج کل ایسے ہی لوگ اکثریت میں ہیں جو سماج اور معاشرے کو گھن گا رہے ہیں، ملک کو کھوکھلا بنا رہے ہیں، میں تو ایسی ہزاروں مثالیں پیش کر سکتا ہوں لیکن دیکھتا رہتا ہوں، تنہا کر بھی کیا سکتا ہوں۔'' قاسم بھائی نے مرغ کی ران دانتوں میں دباتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ''میرا بس چلے تو ایسے تمام لوگوں کو جو ملک، سماج اور سوسائٹی کے دشمن بنے ہوئے ہیں، گولی مار دوں لیکن......''

کھانا ختم ہو چکا تھا اور ہم دونوں کرسی چھوڑ کر کھڑے ہو چکے تھے۔ہاتھ دھوئے اور صوفے پر بیٹھ کر چائے کی چسکیاں اور سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے قومی، ملکی، بین الاقوامی اور بین اللسانی مسائل پر گفتگو کرتے رہے۔

''باتوں باتوں میں رات کے گیارہ بج گئے، پتہ ہی نہیں چلا۔'' قاسم بھائی نے گھڑی دیکھتے ہوئے اجازت طلب کی۔

دروازے تک انہیں رخصت کرنے گیا۔جاتے جاتے وہ کہہ گئے۔''دیکھو اورنگ آباد ضرور آنا، بس اس سال ہوں، اگلے سال میرا تبادلہ ہو جائے گا۔''

میں نے وعدہ کیا کہ موقع ملا تو ضرور آؤں گا۔

وقت گذرتا رہا قاسم بھائی کو گئے دو ماہ ہو گئے۔ایک دن اچانک اورنگ آباد سے میرا ایک دوست رمیش ٹھاکر جس کا وہاں لاکھوں بزنس چلتا ہے، پریشان حال میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔یار امجد بڑی مصیبت میں پھنس گیا ہوں تم تنہا ہی میری مدد کر سکتے ہو۔''

میں نے حیرانی ظاہر کی اور پوچھا، پہلے بتاؤ تو صحیح بات کیا ہے؟ کہنے لگا- ''ارے یار وہ تمہارے انکم ٹیکس آفیسر قاسم صاحب ہیں نہ، ان کے یہاں میرا ایک معاملہ پھنس گیا ہے، میں بے حد پریشان ہوں، اگر معاملہ ٹھیک نہیں ہوا تو میں تباہ و برباد ہو جاؤں گا۔ پلیز یار تم اس معاملہ کو ٹھیک کرا دو، میں تمہارا احسان مند رہوں گا، چلو ابھی اور اسی وقت میری گاڑی باہر کھڑی ہے۔''

میں رمیش کے ساتھ چل پڑا اور پھر ٹھیک دو گھنٹہ بعد میں رمیش کو اس کی گاڑی میں چھوڑ کر قاسم بھائی کے مکان میں داخل ہو رہا تھا وہ لان میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے، مجھے دیکھا تو بڑے تپاک سے ملے، ''کہو کیسے ہو سب خیریت ہے نا؟''

''میں تو خیریت سے ہوں، لیکن میرا ایک دوست رمیش تھاپڑ مصیبت میں پڑ گیا ہے اور اس کی مصیبت آپ ہی دور کر سکتے ہیں۔''

''رمیش تھاپڑ؟ وہی روائل ٹریڈنگ والے تو نہیں؟''

''جی ہاں، جی ہاں وہی۔''

''تو گویا آپ ملنے نہیں، بلکہ پیروی میں آئے ہیں۔''

''اب آپ جو سمجھئے، لیکن اسے کسی طرح مصیبت سے نجات دلا دیں-''

''لیکن اس نے لاکھوں کی گھپلا بازی کی ہے۔ اسے کیسے چھوڑ دوں، خیر اب تم آئے ہو تو سن لو کہ معاملہ رفع دفع کرنے میں دس ہزار روپے لگ جائیں گے۔''

''اچھا رمیش سے بات کرتا ہوں۔''

یہ کہتا ہوا میں، رمیش کی گاڑی کی جانب بڑھ گیا اور باہر نکل کر، گاڑی کے اندر بیٹھے رمیش سے کہا-

''یار رمیش، معاملہ ٹھیک ہو جائے گا مگر اس کے لئے پندرہ ہزار روپے دینے ہوں گے۔''

''ٹھیک ہے یار میں تیار ہوں۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے بریف کیس سے پانچ سو روپے کی تین گڈیاں نکال کر میری جانب بڑھادیں۔

میں ان پانچ سو روپے کے تین بنڈل لے کر قاسم بھائی کے بنگلہ کی طرف مڑ گیا اور راستے میں خاموشی سے روپیوں کا ایک بنڈل اپنے کوٹ کی جیب میں ڈال لیا اور آگے بڑھ گیا اور قاسم بھائی کے پاس پہنچ کر روپیوں کے دو بنڈل ان کی جانب بڑھادیے۔

انہوں نے ایک نظر دونوں بنڈلوں پر ڈالی اور پھر مسکراتے ہوئے کہنے لگے......

''ٹھیک ہے، کام ہو جائے گا،تمہاری پیروی ہو اور کام نہ ہو، یہ کیسے ممکن ہے۔آؤ بیٹھو، چائے پیو۔''

پندرہ منٹ بعد میں قاسم بھائی کی چائے پی کر خوشی خوشی رمیش کے ساتھ لوٹ رہا تھا اور راستے میں آج کل کی بڑھتی ہوئی لاقانونیت اور کرپشن پر ہم دونوں تشویش کا اظہار کر رہے تھے!!!

احساس

میر جعفر علی آج تقریباً برسوں بعد اس شہر میں داخل ہوئے تو شہر کی ہر جگہ، ہر عمارت، ہر شاہراہ یہاں تک ہر شخص ان کے لئے اجنبی لگ رہا تھا۔ جس جانب ان کی نظریں اٹھتیں، اس طرف نیا پن نظر آتا۔

سب کچھ بدل گیا، وہ کار میں بیٹھے سوچ رہے تھے۔ کار فراٹے بھرتی ہوئی راستہ طے کر رہی تھی اور میر جعفر علی خاں کے ذہن میں اس رفتار سے کہیں زیادہ تیز ان دھندلی دھندلی یادوں کی تصویریں واضح ہوتی جا رہی تھیں، جن کا تعلق اس شہر سے گہرا بہت ہی گہرا تھا۔

میر جعفر علی خاں گاڑی کے اچانک ایک موڑ پر مڑتے ہی تقریباً چیخ پڑے "روکو"

ان کی چیخ سن کر ڈرائیور کی نگاہیں میر جعفر علی خاں کے چہرے پر گئیں جہاں جھریوں کے درمیان ایک عجیب سا تناؤ تھا۔ میر جعفر علی خاں، گاڑی کے رکتے ہی دروازہ کھول کر باہر آ گئے اور بے لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے اپنی چھڑی کے سہارے ایک جانب بڑھتے گئے۔ ڈرائیور بھی ان کے پیچھے ہو لیا۔

کئی فرلانگ چلنے کے بعد میر جعفر علی خاں اس پرانی اور کھنڈر نما عمارت کے قریب کھڑے ہو گئے، جسے دور سے دیکھتے ہی وہ چیخ پڑے تھے۔ میر جعفر اس عمارت کو حسرت بھری نظروں سے مسلسل تک رہے تھے، تکتے تکتے ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اشارے سے ڈرائیور کو اپنے قریب بلایا اور اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے۔

''اس عمارت کی کہانی جانتے ہو؟ یہ کھنڈر نما عمارت جو کبھی ایک عالیشان اور شاندار عمارت تھی اور اس میں کبھی طوطی بولتی تھی، آج کس حال میں ہے؟ دیکھو، وقت اور حالات کی ستم ظریفی۔''

''ہاں جانتا ہوں، صرف اتنا کہ اس میں آپ کا بچپن اور جوانی کے بڑے قیمتی لمحے گذرے ہیں، لیکن-آج یہ عمارت بڑے بڑے مجرموں کی آماجگاہ ہے اور یہاں سے آئے دن معصوم دوشیزاؤں کی چیخیں ابھرتی رہتی ہیں۔''

''ہاں، یہ عمارت، یہ کھنڈر، شاید......شاید......اسی......'' اور میر جعفر جملہ پورا کئے بغیر سسک پڑے ڈرائیور، حیرت اور استعجاب بھری نظروں سے مسلسل انہیں دیکھ رہا تھا۔

چند لمحوں بعد انہوں نے رومال نکال کر اپنی آنکھوں اور چہرے پر پھیلے آنسوؤں کو خشک کیا اور ڈرائیور کا ہاتھ تھامے ہوئے مزید آگے بڑھ گئے۔

''دیکھو، اس کھنڈر کو، جو کبھی عالیشان اور عظیم الشان عمارت تھی، نواب تصدق حسین خاں نے بڑی فراخ دلی اور شوق سے بنوایا تھا۔ اس عمارت کی عظمت اور خوبصورتی دور دور تک مشہور تھی۔ خود نواب تصدق حسین کی شخصیت اور ان کی دل نوازیوں سے اس شہر اور قرب و جوار کے لوگ بہت زیادہ متاثر تھے اور ان کی سخاوت اور رحم دلی کے قصے کو آج بھی لوگ یاد کرتے ہیں۔

نواب صدق حسین کی پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی تو لوگوں کے مشورے پر انہوں نے دوسری شادی کر لی، جس سے ایک لڑکا پیدا ہوا اور اسی لڑکے نے ......اس عمارت کے سارے رنگ و روغن، ساری خوبصورتی، سارا حسن نوچ لیا اور آج یہ اس حال میں کھڑی ہے۔ اداس بے رنگ اور خاموش......!

نواب تصدق حسین کا یہ بیٹا نواب مرزا اطہر بیگ بچپن ہی میں باپ کی شفقت سے محروم ہو گیا، ماں اپنے اس اکلوتے بیٹے کی زندگی سنوارنے کی ہر ممکن کوشش میں منہمک رہیں۔

لندن سے ایک انگریز استاد اور کئی انگریز خادماؤں کو اس کی تعلیم و تربیت کے لئے بلایا گیا۔ اطہر بیگ بڑا ہوا تو اس کی اعلیٰ تعلیم کے لئے اسے اس کالج میں داخلہ کرایا گیا، جہاں صرف بڑے بڑے نوابوں اور رئیسوں کے لڑکے پڑھتے تھے، لیکن اطہر بیگ کو کچھ ایسے دوستوں سے واسطہ پڑا جو پڑھائی لکھائی سے زیادہ رنگ رلیوں میں دلچسپی لیا کرتے تھے۔ نتیجہ کے طور پر نواب اطہر بیگ بھی ان کی صحبت میں رنگ گیا۔ اور ایسا رنگا کہ اپنے خاندان کی عزت اور وقار تک کا خیال نہ رکھا، یہاں تک کہ اپنی ریاست کی باگ دوڑ سنبھالی، تو بھی وہ نہیں سنبھلا، بلکہ لاکھوں، کروڑوں کی جائداد کو بھی تباہ و برباد کرنا شروع کر دیا میں یہ سب دیکھتا اور خاموش رہتا۔ اس لئے کہ میری حیثیت صرف ایک منشی کی تھی۔ لیکن چونکہ اس گھر کا نمک کھایا تھا، اس لئے اس کی بربادی کو دیکھتا تو دل روتا۔ میں نے ہمت کر کے اس کی والدہ کو دبے لفظوں میں اس جانب اشارہ کیا وہ اپنے بیٹے کی ان حرکتوں سے خود ہی پریشان تھیں اور اپنے آپ کو بڑی بے بس تصور کر رہی تھیں۔ میں نے انہیں مشورہ دیا کہ نواب صاحبزادے کی شادی کسی مناسب لڑکی سے کر دی جائے، ممکن ہے ذمہ داریوں کا احساس انہیں سدھار دے۔ انہیں میرا مشورہ پسند آیا اور انہوں نے ایک دوسری ریاست کے ایک بڑے نواب خاں بہادر شہرت علی کی اکلوتی بیٹی اختری خانم سے بڑی دھوم دھوم سے شادی کر دی۔ لیکن۔ شادی کے بعد بھی نواب اطہر کے اندر کسی قسم کی تبدیلی واقع نہیں ہوئی، بلکہ شراب اور شباب کا نشہ بڑھتا گیا۔ اختری خانم یہ سب کچھ دیکھتی اور اندر ہی اندر کڑھتی اور گھلتی رہتیں، لب پر سکوت کی مہر لگائے۔ ان نظروں کے سامنے رقص اور سرور کا بازار گرم ہوتا اور وہ مجسم بت بنی یہ سب کچھ دیکھتی رہتی، نت نئے دن نئے نئے چہروں والی حسین و جمیل طوائفیں گھر میں آتیں، شراب کے جام لنڈھاتیں، رقص اور موسیقی کے ساتھ جام و مینا کی محفل سجتی اور جب کبھی نواب اطہر کا دل ان طوائفوں کے اس ماحول سے گھبرا جاتا تو وہ دوسرے شہر کا رخ کرتا۔ جہاں اس کے پہنچتے ہی بازارِ حسن میں تہلکہ مچ جاتا اور شہر کی تمام خوبصورت طوائفیں نواب اطہر کی دولت حاصل کرنے کے لئے اس سے قریب تر ہونے کی

ہر ممکن کوشش کرتیں اور نواب اطہر جس حسین طوائف کی قاتل اداؤں سے خوش ہوتا، اسے شب بسری کے لئے روک لیتا اور صبح کو رخصت کرتے وقت پچاس ہزار تک کی بڑی رقم کے ساتھ ساتھ ہیرے جواہرات اور ریشمی کپڑے اس قاتل ادا اور نوخیز طوائف کی نذر کیے جاتے، اس طرح ایک بار پھر کوئی طوائف نواب اطہر کی نظروں کو پسند آ جاتی تو وہ پوری زندگی نواب کی دولت سے ہی گذارنے کے قابل ہو جاتی۔

نواب اطہر کی رنگ رلیوں کے قصے عام ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ اس کے سسر نواب خان بہادر شہرت علی تک بھی نواب کی عیاشیوں کی خبر پہنچ گئی۔ شروع میں ہر ممکن کوشش کی کہ ان کا داماد تباہی اور بربادی کے راستے کو چھوڑ دے اور راہ راست پر آ جائے، لیکن جب ان کی ساری کوشش رائگاں گئیں، تو انہوں نے اپنی بیٹی کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے ہمیشہ کے لئے رشتہ منقطع کرا دیا۔ چند دنوں بعد ماں نے بھی اپنے عیاش بیٹے کی رنگ رلیوں اور عیاشیوں سے تنگ آ کر دنیا کو ہی خیر آباد کر دیا۔

وقت گذرتا رہا اور شباب اور شراب کے جام نواب اطہر ہونٹوں سے لگائے اندھی مستی میں ڈوبے رہے ہر طرف سے بے نیاز، بے پرواہ، لاتعلق۔

ایک دن بازار حسن میں جدّن بائی کی سولہ برس کی نوخیز اور حسین بیٹی رشیدن، نواب اطہر کی نظروں میں سما گئی اور ایسی سمائی کہ...... وہ جب شب بسری کے لئے تیار نہیں ہوئی تو اس نے اسے بیوی بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ چونکہ جدّن بائی اور رشیدن کی نظریں اس ادھیڑ عمر نواب کی دولت پر دور تک تھیں، اس لئے جدّن بائی کے کہنے پر رشیدن رضامند ہو گئی۔

رشیدن کی حامی نے نواب اطہر کی خواہشوں اور مسرتوں کی گھڑیوں میں چند لمحے کا مزید اضافہ کر دیا۔

شام کے وقت رقص اور سرور کی محفل جمی، بازار حسن کی دوسری کئی حسیناؤں نے نواب کی خوشیوں کو دیکھتے ہوئے دل کھول کر رقص کیے اور جام پیے اور پلائے۔ نواب اطہر نے اس

موقع پر رشیدن کو بھی اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کو کہا، لیکن رشیدن نے کر بھری محفل میں رقص کرنے سے انکار کر دیا کہ اب میں آپ کی ہونے والی بیگم ہوں، مجھے یہ زیب نہیں دے گا۔ رشیدن کے انکار نے نواب کو اندر ہی اندر چراغ پا کر دیا۔ لیکن وہ یہ سوچ کر خاموش رہے کہ خیر کوئی بات نہیں، آج شب میں تو اس کی ہر انا اور ہر ادا کو زیر کرنا ہی ہے۔

اور جب شب آئی تو بڑی قیامت بن کر آئی۔ نواب اطہر اپنی شاندار سجے سجائے خواب گاہ میں شراب کی بوتل پر بوتل خالی کر رہے تھے کہ آج ایک مجسم شعلے کو پگھلانا ہے۔

لیکن...... نواب اطہر کے قریب رشیدن جب مجسم شعلہ بن کر آئی ...... اور نواب کے خزانے میں کوئی جھنک بھی پیدا نہیں ہوئی تو اسے اپنی مردانگی پر زبردست جھٹکا لگا اور رشیدن کے ایک جملہ...

......''بس اسی پر غرور تھا......؟''

نے تو نواب کو آپے سے باہر کر دیا، خاندانی جلال اور خفت نے بندوق اٹھانے پر مجبور کر دیا...... اور پھر کمرے سے دوبارہ ٹھائیں ٹھائیں کی آواز رات کے سناٹے کو چیرتی ہوئی نواب اطہر کی خواب گاہ سے گونجی۔

اور چند لمحوں بعد ہی رشیدن فطری لباس میں خون میں لت پت زندگی کی آخری سانسیں لے رہی تھی۔

اسی دن اس عمارت میں پولیس نے تالے لگا دیئے اور نواب اطہر کو گرفتار کر کے لے گئی۔ جہاں اس نے بھی چند ہی دنوں بعد دنیا سے رشتہ توڑ لیا۔

میر جعفر علی خاں یہ کہہ کر سسک پڑے اور پھر آہستہ آہستہ گاڑی کی جانب واپس بڑھنے لگے، اداس اور نڈھال!!!

اداسیاں

وہ اکثر اس راستے سے گذرتا۔

دبلے پتلے جسم پر پرانی وضع کا سوٹ، گلے میں پرانی اور بوسیدہ سی ٹائی اور سر پر ہیٹ ہوتی ،چہرہ ،داڑھی اور مونچھوں سے بے نیاز لیکن جھریوں کے باوجود بارعب تھا۔قد لانبا تھا، ضعیفی نے کمر میں تھوڑا خم پیدا کر دیا تھا۔جس کی وجہ سے وہ چلتے وقت ذرا سا آگے جھک جاتا۔

صبح سویرے وہ آزاد روڈ ہوتا ہوا بازار کی جانب جاتا ضرور دکھتا اس وقت اس کے ہاتھوں میں ایک چھوٹا سا جھولا ہوتا' جو اکثر واپسی میں بھرا ہوا نظر آتا۔آزاد روڈ پر واقع کئی مکانوں کے مکیں اس بوڑھے شخص کے معمول سے واقف تھے۔ایسے ہی ایک مکان کے برآمدے میں اکثر صبح سویرے کھڑے تین بچے پنکو ،رنکو اور شنکو جو عمر میں دس ،آٹھ اور چھ سال کے ہیں ،بوڑھے شخص کو آتا دیکھ کر بہ آواز بلند کہتے ہیں۔''بوڑھا انکل آ گیا۔ بوڑھا انکل آ گیا......''او جب بوڑھا ان کے مکان کے قریب سے گذرنے لگتا' تو تینوں ایک ساتھ گڈ مارننگ بوڑھا انکل ...... چلانا شروع کر دیتے' جواب میں بوڑھا ۔''گڈ مارننگ ڈیر چائلڈ......گڈ مارننگ ڈیر چائلڈ......''دھیمی دھیمی آواز میں کہتا ہے اور مسکراتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔کبھی کبھی اس کے ہاتھ میں کئی عدد ٹافیاں بھی ہوتیں، جو پنکو ،رنکو،اور شنکو کو وہ بڑے پیار سے دیتا اور سر اور گال پر دست شفقت پھیرتا ہوا گزر جاتا۔بچے اور اس بوڑھے انکل کی دوستی کی وجہ بھی غالبًا یہی تھی۔ٹافیوں نے اجنبیت کے احساس کو ختم کر دیا تھا۔اس لئے کبھی کبھی وہ تینوں بچے بوڑھے انکل کے مطالبے پر پپی بھی دے دیتے۔

ایک دن ان بچوں نے پروگرام بنایا کہ آج جب بوڑھا انکل بازار سے لوٹنے لگے گا تو اس کے ساتھ اس کے گھر چلا جائے اور اس کے بچوں سے دوستی کی جائے۔

کچھ ہی دیر بعد جب بوڑھا گذرنے لگا تو تینوں نے ایک ساتھ معمول کے مطابق ''گڈ مارننگ'' کہنے کے بعد اس کے ساتھ اس کے گھر چلنے کی بات کہی بوڑھا مسکرایا اور کہنے

لگا۔''ہاں ہاں بیٹے میں ضرور لے چلوں گا۔ ذرا بازار سے ہو آؤں۔''

یہ سنتے ہی تینوں بچے گھر میں داخل ہوئے اور اپنی ممی سے اجازت لے کر برآمدے میں آئے اور پھر لوٹتے ہوئے بوڑھے انکل کے ساتھ ہو لئے۔

کچھ دیر بعد تینوں بچے بوڑھے انکل کے ساتھ اس کے پرانے مکان میں داخل ہوئے۔

لیکن یہ کیا...... یہ مکان تو سناٹے کا مسکن ہے دور دور تک کسی کا وجود نہیں۔ کسی کی آواز نہیں ہر طرف مکمل خاموشی ہے۔ بچوں نے گھبرا کر بوڑھے انکل سے سوال کیا......''یہاں تو کوئی نہیں ہے، ہم لوگ بیکار ہی آئے۔'' اور یہ کہتے ہوئے تینوں واپسی کے لئے مڑے، لیکن ان کے باہر نکلنے سے قبل ہی بوڑھے انکل نے انہیں قریب بلالیا۔

''کیوں بیٹے، اتنی جلدی تم لوگ گھبرا گئے۔ مجھے دیکھو میں دس سال سے اس ویران اور خاموش مکان کو آباد کئے ہوئے ہوں۔ شاید اسے میں بھی چھوڑ دیتا، لیکن چھوڑ کر جاؤں گا کہاں، اتنا کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ بچوں کو بوڑھے انکل کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔''انکل تم کیوں رو رہے ہو۔''

''تم ان آنسوؤں کو نہیں سمجھو گے میرے بچوں، اس وقت تک جب تک کہ یہ آنسو تمہاری آنکھوں سے نہ گریں گے۔''

تینوں بچے اس بوڑھے انکل کے اس جملے کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ اس لئے پنکو نے فوراً ہی دوسرا سوال کیا۔''انکل تمہارے بچے نہیں ہیں۔'' ''ہاں، ہاں ہیں بالکل ہیں۔''

''پھر ان سے ملاؤ نا ہم لوگوں کو ہم لوگ ان سے دوستی کرنا چاہتے ہیں۔

''نہیں بیٹے، تم لوگ ان سے دوستی نہیں کرسکو گے۔''

''کیوں انکل؟''

''اس لئے کہ وہ لوگ تم سے بڑے ہیں، بالکل تمہارے پاپا کی عمر کے۔''

''لیکن وہ ہیں کہاں؟''

بہت دور ہیں بیٹے ،میرا بڑا لڑکا جوزف ہے، جو انگلینڈ میں ایک بہت بڑا ڈاکٹر ہے اور دوسرا ولیم ہے جو امریکہ میں ہے۔ وہ وہاں کا بڑا بزنس مین ہے۔''

تمہارے اتنے بڑے بڑے بیٹے ہیں انکل ،پھر تم اتنی خراب حالت میں اور اداس اور بجھے بجھے سے کیوں رہتے ہو-؟''

بوڑھا کچھ دیر خلاء میں اپنی ویران آنکھوں سے گھورتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔

'' بیٹے میں تمہیں کیسے یہ سب باتیں سمجھاؤں ،ابھی تم لوگ بہت چھوٹے ہو،ان باتوں کو نہیں سمجھو گے۔ جو سمجھ سکتے ہیں وہ سمجھنا نہیں چاہتے۔''

''اچھا انکل یہ بتاؤ۔ تمہارے لڑکوں کی ممی کہاں ہیں۔''

بیٹے وہ بھی چند سال قبل مجھے تنہا چھوڑ کر چلی گئی' دور بہت دور' کبھی واپس نہیں آنے کے لئے' شاید وہ بھی تنہائیوں اور خاموشیوں سے گھبرا گئی تھی۔''

''تو پھر کیا تم اس گھر میں بالکل اکیلے رہتے ہو۔ تمہیں ڈر نہیں لگتا-؟''

''نہیں میرے بچے، میں اس گھر میں تنہا کہاں ہوں ،میرے ساتھ دو دوست رہتے ہیں ،ایک جو میرے دکھ سکھ کا ساتھی ہے اور جو میری حفاظت بھی کرتا ہے اور دوسرا وہ ہے ،جس سے ،جب میں بہت گھبرا جاتا ہوں اور تنہائی مجھے کاٹنے دوڑتی ہے تو باتیں کرتا ہوں کیوں ،تم لوگ ملو گے ان سے؟

''ہاں،ہاں انکل،بالکل''

جواب میں بوڑھے نے پکارا-''ٹامی'' اور آواز سنتے ہی کہیں قریب سے نکل کر ایک سیاہ اور چمکتا ہوا کتا سامنے آ گیا اور انکل کے پیروں کے قریب بیٹھ گیا اس کے بیٹھتے ہی انکل کا ہاتھ بے اختیار کتے کے سر کو تھپتھپانے اور پیار کرنے لگا۔

''میرے دوسرے ساتھی سے بھی ملو گے ،بچو، آؤ میرے ساتھ۔'' یہ کہتے ہوئے بوڑھا کرسی سے کھڑا ہو گیا اور بہت ہی خستہ حال پردہ اٹھاتے ہوئے آنگن میں آ گیا۔ بچے بھی

اس کے پیچھے پیچھے پہنچ گئے ۔اور آنگن میں پہنچ کر دیکھا ایک کنارے پر ایک موٹے سے تار کے سہارے ایک آہنی پنجرہ لٹک رہا ہے ۔جس میں ایک بڑا سا پہاڑی طوطا اچھل کود رہا تھا ۔بوڑھے کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں چمک نظر آنے لگی اور وہ بالکل انسانوں کی طرح کہنے لگا۔"کیوں جی ،تم خاموش کیوں ہو، میری طرح تمہیں بھی سبھی چھوڑ گئے؟"

بچوں کو طوطے کی پیای پیاری باتیں اور آواز سن کر بڑی حیرت ہوئی ۔اس لئے کہ ان لوگوں نے کبھی کسی طوطے کو اتنی صاف بولی بولتے نہیں سنا تھا -بوڑھا اسے چمکارتا رہا اور طوطا اس سے وہی باتیں دہراتا رہا۔

چند لمحے بعد بوڑھا بچوں کی جانب مڑا اور کہنے لگا ۔"دیکھا بچو، تم لوگوں نے میرے دوستوں کو میری تنہائیوں کے ساتھی ، میرے دکھ، تکلیف کے دوست یہی ہیں ۔کبھی میں بھی جوان تھا، میرے دم سے یہ گھر آباد تھا۔اس گھر میں بھی کبھی طوطی بولتی تھی بیٹے لیکن...... قصور میرا اتنا ہے کہ اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں ۔اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلائی ،ان کے مستقبل کو سنوانے کی ہر ممکن کوشش کی ،انہیں اس قابل بنایا کہ وہ زمانہ وقت اور حالات کا مقابلہ کر سکیں اور...... اور لیکن مجھے ان سب کا کیا صلہ ملا' یہ تمہارے سامنے ہے،امیدوں کے سارے چراغ گل ہو چکے ہیں ، ہر سمت تاریکی ہی تاریکی ہے ۔کسی طرف سے بھی روشنی کی کوئی کرن نظر آتی...... سرکار کی پنشن ہے جو زندگی کی سست رفتار گاڑی کو آگے بڑھائے لئے جارہی ہے ۔ورنہ......"اور یہ سب کہتے کہتے اچانک بوڑھا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

پنکو ،رنکو اور شنکو حیرت و استعجاب بھری نظروں سے بوڑھے انکل کو دیکھتے رہے اور جب بوڑھے انکل کی ہچکیوں میں کوئی کمی نہیں آئی تو وہ تینوں گھبرا کر گھر سے باہر نکل آئے ۔باہر نکلتے نکلتے ان کے کانوں میں بوڑھے انکل کی آواز گونجی-

"جاؤ، جاؤ، میرے بچوں، گاڈ بلیس یو"

یہ عشق نہیں آساں..........!

مارننگ واک روز کا معمول تھا ریٹائرمنٹ کے بعد سونی سونی زندگی میں مارننگ واک کی اہمیت بڑھ جاتی ہے، صبح سویرے گھر سے نکل کر نیشنل پارک تک پہنچتے پہنچتے ہم ریٹائرڈ دوستوں کی تعداد پانچ سات تک ہو جاتی اور یہاں پہنچ کر دو مخصوص بنچوں پر ہم لوگ آمنے سامنے بیٹھ جاتے' خوش گپیاں ہوتیں ، اور ان خوش گپیوں کے دوران کبھی سیاسی کبھی سماجی اور کبھی معاشرتی حالات پر طرح طرح کے تبصرے ہوتے اور ہر کوئی اپنے تجربے اور مشاہدے کا بھرپور اظہار کرتا ـــــــ اس طرح اچھا خاصہ وقت گزر جاتا اور پھر وہی گھر' جہاں کا سونا سونا ماحول' خاموش درو دیوار' گم صم بیوی کا چہرہ اور انتظار..... صرف انتظار کسی کے فون کا..... کسی کے کال بیل کا..... کسی کے آنے کا.....''

آج جب میں مارننگ واک کیلئے نکلا تو راستے ہی میں فرہاد صاحب مل گئے، ذرا آگے بڑھا تو دیکھا پروفیسر غلام قادر اور جناب شاہد اختر سبک روی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ ہم دونوں بھی لپک کر ان کے ساتھ ہو لئے' سلام کلام کے بعد خوش گپیوں کے ساتھ ہم لوگ نیشنل پارک پہنچے، وہاں قبل سے ہی بھائی رضوان کوثر ڈاکٹر حسین احمد اور جناب عبدالقادر موجود تھے۔

جناب عبدالقادر کے ہاتھ میں آج کا تازہ اخبار تھا اور موضوع بحث عشق و محبت تھا۔

میں چونک پڑا اس عمر میں یہ عشق و محبت کی باتیں.....؟

مجھے دیکھتے ہی عبدالقادر صاحب کہنے لگے۔

''آیئے آیئے آپ ہی کا انتظار تھا''

میں نے چونکتے ہوئے پوچھا ''یہ عشق و محبت میں مجھے کہاں گھسیٹ رہے ہیں۔ میرا ان باتوں سے کیا تعلق''۔

''تعلق''؟ عبدالقادر نے میرے ادا کئے لفظ کو سوالیہ انداز میں دہرایا اور ایک زبردست قہقہہ لگایا اور ان کے اس قہقہہ میں میرے سوا سبھوں نے ساتھ دیا۔

ویسے تو صبح کے وقت ہم لوگ اسی طرح عام طور پر ہر چھوٹی بڑی بات پر ٹھہاکے لگانے کے عادی تھے۔ لافٹر تھیراپی کا بھرپور مظاہرہ ہوتا۔ لیکن اس وقت ان لوگوں کا قہقہہ مجھے اچھا نہیں لگا۔ ویسے میں سمجھ گیا، ان کے اس قہقہہ کے پس پشت کیا تھا۔ دراصل میں نے ایک دن نہ جانے کن جذباتی لمحوں سے معمور ہو کر اپنے عشق کی وہ داستان سُنادی تھی، جس کی حسین وادیوں کو میں اب تک بھول نہیں پایا تھا۔ اس وادی کا ایک ایک رومان پرور منظر میری آنکھوں میں سمایا ہوا ہے۔ لیکن، اُس دن تو ان لوگوں نے میرے عشق کی داستان کو بڑی سنجیدگی اور گہری دلچسپی سے سنی تھی۔ لیکن آج یہ میرے عشق کو اس انداز سے کیوں لے رہے ہیں۔

میرے چہرے پر ناراضگی کے نقوش پڑھ کر عبدالقادر صاحب بول پڑے۔

''ارے بھائی آپ خفا نہ ہوں دراصل آج کے اخبار کے پہلے ہی صفحہ پر ویلینٹائن ڈے کہاں اور کس طرح منایا گیا، اس کی تفصیل شائع ہوئی ہے۔ کروڑوں روپے کے تحفے تحائف، پھولوں کے گلدستے فروخت ہوئے مختلف شہروں کے ریستوراں میں لاکھوں روپے کی شراب کا رومانی جوڑوں نے لطف اٹھایا اور تو اور بڑے بڑے ہوٹلوں میں بڑے پیمانے پر لوسلیبریشن (Love Celebration) منایا گیا۔ اور......''

''ارے چھوڑئے جناب، آج کی کنزیومر سوسائٹی۔ (Consumer Society) میں پیار محبت کے پاک رشتوں کو بھی Cash کرایا جارہا ہے۔ یہ مہنگے تحفے تحائف 'شراب کے نشے میں دھینگا مشتی۔ کیا یہی اظہار عشق ہے، ارے یہ عشق نہیں' آوارگی ہے'' پرفیسر رضوان کوثر نے عبدالقادر کی بات کاٹتے ہوئے اپنی دانشورانہ رائے دی۔

''آپ صحیح فرما رہے ہیں رضوان کوثر صاحب 'عشق کیا ہے یہ عشق کرنے والا ہی بتا سکتا

ہے۔دل میں اُٹھتے ہوئے سوز کا نام ہے عشق۔" ڈاکٹر حسین احمد نے بھی اپنے رومانی ہونے کا ثبوت دیا اور سوالیہ انداز میں مجھے دیکھنے لگے۔

میں یادوں کے گہرے سمندر میں ڈوب ابھر رہا تھا، سبھوں نے میری جانب اس انداز سے دیکھا کہ وہ جاننا چاہتے تھے کہ عشق کے متعلق میری کیا رائے ہے۔

میں نے انہیں مایوس نہیں کیا، اور بتایا کہ "عشق ایک احساس، ایک جزبے کا نام ہے اس کی کوئی شکل وصورت نہیں اسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے، معشوق کے چہرے کی تازگی اور شادابی کو دیکھنا ہے، تو کھلے ہوئے خوبصورت پھولوں کو دیکھو، اس کی آواز کو سننا ہو تو گرتے جھرنے کی مترنم آواز کو سنو، اس کی انگڑائیوں میں جو مدہوشی ہوتی ہے، اس کی اداؤں میں جو دلفریبی ہوتی ہے، اس کی مخمور نگاہوں میں جو سحر ہوتا ہے، اس کی آمد کے انتظار میں جو اضطراب ہوتا ہے اور اس کے آتے ہی باغوں میں بادصبا کا احساس ہوتا ہے۔ پوری فضا ایک خاص خوشبو سے مہک اٹھتی ہے، اس کے صندلی جسم کی خوشبو ہواؤں میں بکھر جاتی ہے، دودھیا چاندنی میں نہایا اس کا پیکر۔ جس لمحہ شرماتے ہوئے، گھبراتے ہوئے سامنے آکر کھڑا ہو جاتا ہے، ان لمحوں کو اپنی آنکھوں میں اپنے دل و دماغ میں قید کرنے کو جی چاہتا ہے اور ۔۔"

"ارے جناب آپ تو نثر میں شاعری کرنے لگے، عشق کی کیفیات اور معشوقہ کی پر کیف تفصیلات نے تو ہم لوگوں کو جوانی کی یاد دلا دی"

شاہد اختر صاحب نے میرے اظہار بیاں سے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔

یہ جوانی اور بڑھاپا کہاں سے آ گیا، عشق کی محسوسات کے لئے اور عشق کے لئے عمر کی کوئی قید نہیں، ہاں سماج نے اسے ضرور عمر کی قید و بند میں جکڑ دیا ہے، عشق کی انجانی لذتوں کو کبھی بھی کسی بھی لمحہ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت میں آپ لوگوں سے مخاطب ہوں اور وہ خیالوں کی دہلیز سے اتر کر میرے دل و دماغ میں اپنی دلفریب اداؤں کے ساتھ سما گئی ہے۔ میرے شانوں پر رکھے اس کے پیار بھرے ہاتھ کا لمس، روح پر دست صبا ہو جیسے اور یہ باتیں صرف محسوس کرنے کی ہیں اور احساس کے لئے حساس ہونا ضروری ہے۔ جوانی یا بڑھاپے

سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ صرف ایک شعر آپ لوگ مظہر امام کا سن لیں، بس میری بات آپ لوگوں کی سمجھ میں آجائیگی' مظہر امام نے کہا ہے۔

میرے سب خواب تاروں کی طرح ٹوٹے، مگر اس کا
گلوں کی اوس میں بھیگا ہوا پیکر نہیں بدلا

شعر سن کر سبھی خاموش ہو گئے' نہ جانے وہ شعر کی معنویت میں ڈوب گئے یا اپنے اپنے عشق کی قندیلیں روشن کرنے لگے۔

دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ پھر اچانک خاموشی کو توڑتے ہوئے شاہد اختر گویا ہوئے۔

''ٹھیک ہے جناب،، مگر یہ ویلینٹائن ڈے کیا ہے' اور کیوں ہے؟

ویلینٹائن ڈے جو لوگ منا رہے ہیں وہ اس کی حقیقت سے واقف ہیں اور نہ ہی اس کی اہمیت کو سمجھتے ہیں۔ رومن راجہ کلاڈیس کی یہ سمجھ تھی کہ چونکہ شادی کرنے سے مردوں کی طاقت، جسم' عقل اور قوت فیصلہ میں کمی آجاتی ہے، اس لئے اس کا حکم تھا کہ شادی کسی کو نہیں کرنا ہے۔ لیکن سینٹ ویلنٹائن نے اس حکم کے برخلاف ہزاروں فوجیوں کی شادی کرادی' اس حکم عدولی کی پاداش میں 14 رفروری کو راجہ نے اسے پھانسی کی سزا دے دی۔ اس لئے اس کو یادگار کے طور پر منایا جانے لگا۔ بعد میں اُسے (Love Celebration) لو سیلیبریشن کا نام دے دیا گیا اور مغربی تہذیب کی بھونڈی نقالی ہمارے نوجوان کر رہے ہیں۔ پیار و محبت ایک احساس ہے، دو جسم کا ملن پیار نہیں، Love Celebration کے لئے ہمارے یہاں تو مثالیں بھری پڑی ہیں، مجنوں فرہاد' قیس اور سب سے بڑھکر پوری دنیا کیلئے ہمارے یہاں محبت کی عظیم نشانی 'تاج محل' ہے۔''

میری ان باتوں کو سننے کے بعد ایک بار پھر خاموشی طاری ہوگئی' بات کو آگے بڑھانے کا سرا ڈھونڈنے لگے لوگ۔ لیکن اچانک غلام قادر کھڑے ہو گئے۔ اب چلا جائے، کافی دیر ہو گئی ہے۔

ان کے اٹھتے ہی سبھی لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے' ہم لوگ دھیرے دھیرے آگے بڑھنے

لگے، سبھوں کے دل ودماغ میں طرح طرح کے خیالات ڈوب ابھر رہے تھے، پھر ہم لوگ سڑک کے اس موڑ پر آ گئے جہاں سے ہم لوگوں کے راستے بدل جاتے ہیں اچانک غلام قادر کی نظر آویزاں ایک بڑے سائن بورڈ پر پڑتی ہے۔ وہ اسے پڑھنے لگے انھیں رک کر سائن بورڈ پڑھتے دیکھ کر، ہم لوگوں کی نگاہیں بھی بے اختیار اسی طرف اٹھ گئیں۔ بورڈ پر لکھا تھا۔

مور یہ کلنک۔ اَن چاہے گربھ (حمل) سے

چھٹکارا راز کو راز رکھنے کا وعدہ، آج ہی ملیں

اس عبارت کو سبھوں نے پڑھا اور پڑھنے کے بعد عبدالقادر نے برجستہ کہا۔ ''یہی ہے عشق کا ماحصل'' اور یہ کہتے ہوئے سبھوں نے زوردار قہقہہ لگایا۔

ان لوگوں کا یہ قہقہہ سن کر مجھے ایسا لگا جیسے ان لوگوں نے میرے عشق کو سر بازار ننگا کر دیا۔ میں گھبرا گیا، تیز ہوتی دھوپ میرے بدن میں نوکیلے کانٹے کی طرح چبھنے لگی اور ایسا لگا جیسے میں کسی صحرا کے بیچ و بیچ کھڑا ہوں اور چاروں سمت سے ہواؤں کے مرغولے اٹھ رہے ہوں۔

میں تیز قدموں سے گھر واپسی کے لئے مڑ گیا!!

سلسلہ بھوک کا

جیسے ہی اُسے تھکی کی قیمت ملی اس کی باچھیں کِھل گئیں۔

روپے سے بھری ہتھیلی کو اس نے اپنی انگلیوں سے بھینچ لیا...... اس کے دل میں اس وقت طرح طرح کے احساسات و جذبات کی لہریں اُٹھ رہی تھیں...... آج کئی دنوں کے بعد اس کی جھونپڑی میں رکھا مٹی کا چولہا جلے گا، بھات دال اور آلو کا چوکھا بنے گا۔ بھوک سے نڈھال اس کے پانچوں بچے...... پیٹ بھر کر کھانا کھائیں گے...... لیکن...... لیکن...... آج بچوں کے درمیان تھکی نہیں ہوگی۔

تھکی چھوٹی ہونے کی وجہ سے سب کی پیاری تھی۔ سبھی اسے بے حد پیار کرتے تھے۔ اسے چھیڑ کر مزہ لیتے، اسے گود اُٹھائے رہتے...... تھی بھی وہ بہت معصوم اور چنچل سی، گوری چٹی، خوبصورت اور ہر وقت طرح طرح کی اپنی توتلی زبان میں پیاری پیاری باتیں کرنے والی...... اگر...... کمی تھی تو بس یہ کہ چار سال کی عمر کی ہو کر بھی وہ جھونپڑی کا مطلب نہیں سمجھ سکی تھی۔ مفلسی اور غربت کیا ہوتی ہے، اسے وہ نہیں جان سکی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اکثر چولہا جب ٹھنڈا ہوتا اور جھونپڑی میں کچھ بھی کھانے کو نہیں ہوتا تو اس کے دوسرے بھائی اور بہنیں ماں کی پٹائی کے خوف سے سہمی سہمی بھوک کی آگ کو دبائے رہتیں۔ لیکن تھکی ''بھوک'' ''بھوک'' کی رٹ لگائے رہتی۔

''مائی کچھ کھائے کو دے بھوک لگل ہئی''

ایسے جملے بول بول کر وہ روتی رہتی، بلکتی رہتی۔ ماں جھنجھلا کر اس کی بھی پٹائی کر دیتی۔ پھر بھی اس کی ''بھوک'' ''بھوک'' کی رٹ ختم نہیں ہوتی اور اسی بھوک بھوک کی اسے سزا ملی کہ نہ صرف اس کی بلکہ پورے گھر کی بھوک مٹانے کے لئے اسے صرف دو ہزار روپے میں

ماں نے فروخت کر دیا!

دو ہزار روپے فاقہ زدہ چھ افراد کے لئے بہت ہوتے ہیں...... دس بارہ دن تو وہ لوگ اطمینان سے پیٹ کی آگ کو سرد کر ہی سکتے ہیں۔

تھکی کی ماں رمیا کے قدم جہاں ایک طرف اس خیال سے بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے کہ آج کئی دنوں بعد فاقہ کشی کا خاتمہ ہوگا وہیں دوسری جانب اس کی نظروں کے سامنے تھکی کا پیارا سا معصوم چہرہ بھی گھومنے لگتا، تو اس کے قدم بوجھل ہونے لگتے، سونی سونی، خالی گود بھی اُسے بڑی بھاری بھر کم لگ رہی تھی...... دو ہزار روپے لے کر اس نے جب تھکی کو ایک اجنبی شخص کے حوالے کیا تھا۔ اس لمحہ اسے محسوس ہوا تھا، جیسے وہ اپنے جسم کا کوئی انگ اُس آدمی کے حوالے کر رہی ہے...... تھکی اس بات سے بے خبر کہ اسے روٹی اور مٹھائی دلانے کی لالچ دے کر اسے اپنے ساتھ لے جانے والا شخص اس کی قیمت دے کر اسے کہیں لے جا رہا ہے۔ وہ حیران بھری نگاہوں سے اپنی ماں کو دیکھ رہی تھی۔ لیکن روٹی اور مٹھائی ملنے کی خوشی میں، وہ اُس اجنبی شخص کے ساتھ خوشی خوشی چلی جا رہی تھی...... مگر بار بار مڑ کر اپنی ماں کو ضرور دیکھ رہی تھی، جو پتھر کا مجسمہ بنی کھڑی اسے اپنی نگاہوں سے اوجھل ہوتے تک رہی تھی اور جب وہ پوری طرح نگاہوں سے اوجھل ہوگئی تب وہ واپسی کے لئے اپنی جھونپڑی کی طرف بڑھنے لگی تھی۔

راستے میں رک کر بنیا کی دوکان سے اُس نے چاول، دال، آلو، نون، تیل وغیرہ خریدا اور بوجھل اور بھاری قدموں سے وہ اپنی جھونپڑی میں داخل ہوئی۔ اسے دیکھتے ہی بھوک سے نڈھال اسکے پانچوں بچے اس کے قریب آ گئے اور اس کے ہاتھوں میں چاول، دال اور آلو وغیرہ دیکھ کر خوشی سے اُچھل پڑے۔ دو دنوں سے پانی پی پی کر پیٹ کی آگ کو سرد کرنے کی کوششوں میں لگے پانچوں بچوں کے چہروں پر خوشیاں رقص کرنے لگیں اور ایک ساتھ تمام بچوں نے آواز لگائی......

''مائی جلدی کھانا پکا، بڑی جور کی بھوک لگل ہئی''

نڈھال اور اندر ہی اندر ٹوٹی ہوئی ماں چولھے کے قریب پہنچ گئی...... اچانک بچوں کو خیال آیا کہ ماں کی گود خالی ہے، تھکی ساتھ میں نہیں ہے۔ پھر ایک ساتھ تمام بچوں نے ماں سے سوال کیا......

''ارے مائی، تھکی؟''

ماں چپ رہی۔ بولتی بھی تو کیا؟ بچوں نے غور سے ماں کی طرف جواب طلب نگاہوں سے دیکھا۔

ماں خاموش تھی اور اس کی آنکھوں سے جھر جھر آنسو بہہ رہے تھے۔ بچوں نے پھر اپنے سوال کو دہرایا......

''مائی تھکی کہنے ہئی......؟''

بچوں نے سمجھا تھکی کو شاید ماں نے جھونپڑی کے باہر ہی چھوڑ دیا ہے۔ سارے بچے ایک ساتھ جھونپڑی سے باہر نکلے اور تھکی کو تلاش کرنے لگے۔ لیکن انہیں تھکی کہیں نہیں نظر آئی۔ حیران ہو کر وہ پھر جھونپڑی کے اندر واپس آئے اور پھر وہی سوال دہرایا۔

''مائی تھکی کہنے ہئی......؟''

ماں اس وقت تک چولھے میں جلاون ڈال چکی تھی۔ دھواں اٹھنے لگا تھا اور اُٹھتے دھوئیں کے مرغولے میں ماں کا وجود کھو سا گیا تھا۔

بچوں نے اپنے آپ کو کچھ سمجھانے کی کوشش کی اور پریشان حال ماں کو مزید پریشان نہ کرنے کے خیال سے خاموش رہے۔

تھوڑی ہی دیر بعد پانچوں بچوں کو ٹوٹی پھوٹی پلیٹوں میں کھانا مل گیا اور وہ کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ ماں خاشوش مجسمہ بنی رہی، اسے رہ رہ کر تھکی کی یاد ستائے جا رہی تھی...... اس کی آنکھوں سے نکلنے والے آنسو کا ہر بوند تھکی کی یاد دلا رہا تھا۔

رمیا روئے جا رہی تھی اور دل کو سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی...... کہ اس کے سوا اس کے

سامنے اور چارہ ہی کیا تھا...... چھ سال اس کی شادی کو ہوئے تھے اور ان چھ برسوں میں اس کا شوہر اسے چھ بچوں کا بھاری بوجھ دے کر چل بسا۔ اس نے لوگوں کے گھروں میں دائی کا کام کر کے بچوں کو زندہ رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن بچے جیسے جیسے بڑے ہوتے گئے' ویسے ویسے ان کے پیٹ کا دوزخ بھی بڑھتا گیا۔ بُری نظر ڈالنے والوں نے اس پر بُری نظر بھی ڈالی۔ طرح طرح کے لالچ بھی دیئے۔ لیکن وہ کسی دوسری ہی مٹی کی بنی ہوئی تھی۔ عصمت گنوا کر پیٹ بھرنے پر وہ کبھی رضا مند نہیں ہوئی...... وہ خود اندر ہی اندر ٹوٹتی رہی، بکھرتی رہی۔ لیکن اپنے بچوں کو سمیٹنے کی کوشش میں کبھی کمی نہیں کی...... فاقہ پر فاقہ تنگ دستی اور بدحالی سے نڈھال وہ بیمار بھی رہنے لگی اور ان ہی سب حالات سے مجبور ہو کر تھکی کی بھوک بھوک کی رٹ کو مٹانے اور دوسرے بچوں کی بھوک کو ختم کرنے کے لئے اس نے دل پر بھاری بوجھ رکھ کر تھکی کو دو ہزار روپے میں بیچ دیا۔

لیکن دو ہزار روپے بھی زیادہ دن نہیں چلے اور پھر جھونپڑی کے اندر بھوک کی تڑپ اور کراہیں گونجنے لگیں۔ تب تھکی کے بعد چھونکی بکی مگر چھونکی کے بعد بھی بھوک کی جوالا سرد نہیں ہوئی تب گورکی کا نمبر آیا اور اس کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا تب تک وہ ہمت ہار چکی تھی......اور ایک دن اس نے اپنے دونوں بیٹوں اور ایک بیٹی کے ساتھ کوئیں میں چھلانگ لگا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بھوک کا خاتمہ کر دیا۔

وقت گزرتا رہا۔ تھکی، چھونکی اور گورکی کا اپنے جن بھائی بہنوں اور ماں کی بھوک مٹانے کے لئے ایک بار سودا ہوا تو ہمیشہ ان کا سودا ہی ہوتا رہا۔ اپنی ماں اور بھائیوں کی بھوک تو وہ نہیں مٹا سکیں۔ ہاں زندگی کی چندھیا دینے والی روشنی سے نہائے امیر لوگوں کی دوسری بھوک مٹانے کا ایک ذریعہ ضرور بن گئیں۔!!!

بوجھ زندگی کا

مفلسی کی زندگی اپنے آپ میں ایک بوجھ ہوتی ہے اور اس بوجھ میں بیوی سمیت تین بٹیاں، ایک بٹیا اور ایک بیوہ بہن کے اضافہ نے غربت اور مفلسی سے نڈھال سلیمان کی زندگی کی ساری رعنائیوں کو ختم کر دیا تھا۔ زندگی کی گاڑی کو سنگلاخ اور خاردار راستے پر کیسے چلایا جائے، یہ سوچ اور فکر اسے ہر پل، ہر لمحہ پریشان کیئے رہتی۔ اس کے گرد مکڑی کا ایک ایسا جالا بُن دیا گیا تھا کہ جب کبھی وہ اس سے نکلنے کی کوشش کرتا وہ مزید الجھتا چلا جاتا۔

گاؤں کے ساہوکار کے کھیت کھلیانوں میں دن رات، مزدوری کرتا، اناج اگاتا چاول، گیہوں، دال کے ڈھیر لگا دیتا۔ لیکن وہ خود دانے دانے کو محتاج رہتا۔ اس کی کڑی محنت ومشقت سے جب کھیت لہلہانے لگتے، اناج کے انکور پھوٹتے۔ کھیتوں سے خوشبو پھیلتی تو اس کا دل باغ باغ ہو جاتا۔ اسے اپنی محنت پر بڑا گمان ہوتا۔ لیکن شاندار فصل تیار ہونے کے بعد بھی اسے ہر روز کی طرح وہی دو سیر اناج ملتا۔ جس میں سے ایک سیر بیچ کر وہ نون تیل وغیرہ لیتا اور بقیہ ایک سیر اناج لے کر شام گئے گھر پہنچتا، جہاں گھر کے سارے لوگ دروازے پر ٹکٹکی لگائے اس کا انتظار کرتے رہتے کہ سامان آئے تو مدھم پڑتی زندگی کی لو کو کچھ تیز کرنے کے لئے، ان لوگوں کی زندگی کی طرح ٹھنڈے ہو رہے چولھے کو گرم کیا جائے۔

ماں باپ مرتے مرتے ایک بہن کا مزید بوجھ اس کے ناتواں کاندھے پر ڈال گئے تھے۔ ساہوکار سے قرض لے کر ایک فرض پورا کیا اور بہن جس دن ڈولی میں رخصت ہوئی، اُس دن اس نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس لی تھی، اس دن وہ بڑے سکون کی نیند سویا تھا...... لیکن اس کی نیند کا خمار ٹوٹا بھی نہیں تھا کہ ایک ماہ بعد ہی اس کی جو بہن سہاگن رخصت ہوئی تھی، وہ بیوہ بن کر ایک بار پھر گھر واپس آ گئی...... اس نے قدرت کے اس فیصلے کو بھی ایک آہ

کے ساتھ قبول کرلیا اور وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔

وقت دبے پاؤں نکلتا چلا گیا۔ زندگی میں جب شادابی اور رعنائیاں ہوتی ہیں تو وقت کو روک لینے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن ایسا وقت جو صرف تاریکی ہی تاریکی لے کر آئے، اور گھپ اندھیرا کر جائے، ایسے وقت کا جتنا جلد ہو، گزر جانا ہی اچھا ہے اور یہ وقت اتنی تیزی سے گزرا کہ سلیمان کی تینوں بیٹیاں ایک ساتھ جوان ہو کر اس کے اعصاب پر ہتھوڑے برسانے لگیں۔

ایک بیٹا عثمان ہے جو اس کے جینے کا سہارا ہے۔ ایک نہ ایک دن وہ اس کی زندگی کے بوجھ کو ضرور کم کرے گا۔ اس کی تاریکیوں سے بھری زندگی میں ضرور روشنی لائے گا۔ یہی سوچ کر اس نے اسے سرکاری اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے ڈال دیا تھا۔ لوگوں نے اسے سمجھایا بھی کہ اپنے بیٹا کو بھی محنت مزدوری میں لگادو۔ وہ بھی دو پیسہ کمائے گا۔ لیکن اس نے لوگوں کی یہ بات نہیں مانی...... اور ایک دن جب عثمان سرکاری اسکول سے ایک کاغذ ہاتھ میں لئے خوشی خوشی دوڑتا بھاگتا آیا اور کہا......

''بابا، بابا میں میٹرک پاس کر گیا''

تو یہ سن کر سلیمان خوشی سے اچھل پڑا، دوڑ کر اس نے عثمان کو گلے سے لگا لیا۔ عثمان کی ماں اور بہنیں بھی اس کے قریب آ گئیں اور اس کے گلے لگ گئیں......

اس دن سلیمان نے خود کو بڑا ہلکا محسوس کیا۔ اسے ایسا لگا جیسے زندگی کے جس بوجھ کو وہ ڈھوتے ڈھوتے لڑکھڑانے لگا ہے، اسے سہارا دینے کے لئے عثمان کے مضبوط ہاتھ مل جائیں گے اور دونوں باپ بیٹے مل کر زندگی کے اس بوجھ کو کم کریں گے۔

وقت شاید اب اس پر مہربان ہونے لگا تھا...... ایک دن عثمان کے دوستوں نے اُسے بتایا کہ شہر میں میٹرک پاس نوجوانوں کو فوج میں بھرتی کیا جا رہا ہے۔ یہ سن کر عثمان کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ اس کے سپنے انگڑائیاں لینے لگے اور وہ خود کو شہر جانے سے روک نہ سکا اور سخت امتحان سے گزرنے کے بعد جب عثمان کو اس کا نام منتخب ہونے والے نوجوانوں میں

نظر آیا تو اسے یقین ہی نہیں آیا۔ پاس کھڑے نوجوانوں سے وہ بار بار یہ پوچھتا، یہ میرا ہی نام اور رول نمبر ہے نا؟ اور لوگ اسے یقین دلاتے کہ ہاں یہ تمہارا ہی رول نمبر ہے۔

عثمان کی اس کامیابی نے سلیمان کی بے جان زندگی میں جان ڈال دی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے بھری دوپہر کو صحرا میں چلتے چلتے اچانک وہ ایسے مقام پر آ کھڑا ہوا ہے جہاں ہر طرف ہریالی ہی ہریالی ہے جھرنے کی مترنم آواز ہے اور ٹھنڈی ہوائیں ہیں جو اس کی رگ و پے میں سرایت کرتی چلی جارہی ہیں۔

فوجی ٹریننگ کے بعد عثمان کو ایک چھاونی میں بھیج دیا گیا۔ ملنے والی تنخواہ کی آدھی رقم کو وہ اپنے بابا کو بھیجنے لگا اور خط میں خاص تاکید بھی کرتا کہ ساہوکار کا قرض اُتار دے اور بہنوں کی شادی مناسب جگہ طئے کر دے۔

سلیمان، بیٹے کے بھیجے ہوئے روپے لے کر بہت خوش ہوتا اور کوشش کرتا کہ ساہوکار کے قرض کا بوجھ اُتار دے اور بیٹیوں کی بھی شادی کر دے۔..... لیکن اس کا بوڑھا نحیف اور لاغر جسم اب محنت مزدوری کے لائق نہیں رہا تھا، عثمان کے بھیجے ہوئے روپے سے اب گھر میں دو وقت کی روٹی ہو جاتی، بوڑھا بوڑھی کی دوائیں آجاتیں اور بہنوں کے جوان جسم کو ڈھکنے کے لئے کپڑے مل جاتے۔ قرض کی ادائیگی اور بیٹیوں کی شادی کا مسئلہ جوں کا توں بنا رہا اور فکر کی چادر لمبی ہوتی گئی۔

اچانک ایک دن عثمان کا خط ملا...... سرحد پر جنگ کے بادل منڈرا رہے ہیں، اس لئے مجھے بھی جنگ کے مورچہ پر بھیجا جارہا ہے۔ ہمارے لئے دُعا کرتے رہنا، پیسے آپ کو ملتے رہیں گے......

اور کچھ دنوں بعد جنگ شروع ہوگئی۔ گاؤں میں لوگوں کے ریڈیو اور ٹرانزسٹر سے دشمنوں کے دانت کھٹے کر دینے کی خبریں آنے لگیں۔ گاؤں کے لوگ اُسے مبارکباد دیتے، تمہارا بیٹا بہادری سے لڑ رہا ہے۔ اب تو اس کی ترقی بھی ہو جائے گی۔ سلیمان کا سینا فخر سے پھولنے لگتا اور اس کی سوچ کا دائرہ پھیلتا چلا جاتا۔

جنگ دھیرے دھیرے ختم ہونے لگی۔ دشمنوں پر فتح حاصل کرنے کے بعد فوج اپنے اپنے ٹھکانوں پر لوٹنے لگی...... کہ اچانک ایک دن گاؤں میں فوج کی ایک گاڑی داخل ہوئی، گاؤں والوں نے سمجھا، عثمان جنگ سے واپس آ گیا ہے۔ پورا گاؤں اس کے استقبال کے لئے فوج کی گاڑی کے پیچھے پیچھے دوڑ پڑا...... گاڑی ٹھیک سلیمان کے گھر کے قریب رکی۔ ایک فوجی افسر نے گاڑی سے اتر کر، سلیمان کے بارے میں پوچھا۔ سلیمان تذبذب کے عالم میں آگے بڑھا۔ ''ہاں میں عثمان کا بابا سلیمان ہوں، کیا بات ہے''؟

فوجی افسر اس کے قریب آیا اور اس کے کاندھے پر بڑی ملائمیت اور محبت سے ہاتھ رکھ کر بڑے ہی غمناک انداز میں خبر سنائی۔ اس خبر کو سن کر سلیمان کے پیروں تلے کی زمین کھسک گئی۔ یہ کیا ہوا؟ اور وہ روتا چلاتا، خشک پتوں کی طرح کانپتا ہوا گھر کے اندر داخل ہوا۔ اسے روتا دیکھ کر گھر کے اندر کے لوگوں کو بھی سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ کسی مصیبت کا پہاڑ ان پر ٹوٹ پڑا ہے...... گھر کے اندر سے دھاڑیں مار مار کر رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ پورا گاؤں سکتے کے عالم میں آ گیا اور غم کے گھنے بادل گاؤں پر چھا گئے۔ ایسا لگا جیسے گاؤں میں نکلی چمکیلی دھوپ اچانک ختم ہو گئی ہو اور ہر طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا ہو۔

فوجی افسر اداس اداس سا کھڑا یہ سب دیکھتا رہا۔ چند گھنٹوں بعد اس نے سلیمان کو پھر اپنے قریب بلایا...... اور کہا...... ''عثمان کی لاش دشمنوں کے قبضے میں ہے، حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، ویسے ملنے کی امید کم ہے۔ فی الحال یہ پانچ لاکھ کی رقم کا چیک آپ کو دی جا رہی ہے۔ ہم پھر آئیں گے...... ''

یہ کہتا ہوا فوجی افسر گاڑی میں بیٹھ کر واپسی کے لئے روانہ ہو گیا۔

فوجی افسر سلیمان کو ایک بڑا زخم اور اس زخم کو مندمل کرنے کے لئے پانچ لاکھ روپے کا مرہم بھی دے گیا...... پانچ لاکھ روپے کبھی اس کے ہاتھ میں ہونگے، اس نے کبھی خواب و خیال میں بھی نہ سوچا تھا، اس کے تصور سے بھی دور بہت دور تھا۔ اس پانچ لاکھ سے وہ بہ آسانی ساہوکار کا قرض اُتار سکتا ہے۔ تینوں بیٹیوں کی شادی کر سکتا ہے اور باقی بچی زندگی

کے دن کو آسانی سے کاٹ سکتا ہے...... اس کا بیٹا مرتے مرتے بالآخر اس کی ساری پریشانیوں کو دور کر گیا۔ وہ اچھی طرح یہ بات جانتا تھا کہ عثمان کی تنخواہ سے ساہوکار کا وہ قرض اتار سکتا تھا اور نہ ہی بیٹیوں کی شادی۔ لیکن اسے اب اطمینان تھا۔

وقت گزرتا گیا، غم کے کالے گھنے بادل دھیرے دھیرے چھٹ گئے تھے اور پہلے کی طرح پورے گاؤں میں سنہری دھوپ پھیلنے لگی تھی۔ اس دوران سلیمان نے دوڑ دھوپ کر تینوں بیٹیوں کی شادی دوسرے گاؤں میں طئے کر دی اور ایک دن وہ وقت بھی آیا جب گھر کے ماتمی سناٹے کے درمیان شادی کی دھوم دھام تھی۔ ایک ساتھ تین تین برات آ رہی تھی۔

اسی روز اچانک ایک فوجی گاڑی گاؤں میں پھر نمودار ہوئی...... اس گاڑی کو دیکھ کر گاؤں والوں کا غم تازہ ہو گیا...... اس بار بھی وہ گاڑی سلیمان کے گھر کے قریب رکی، دروازہ کھلا، ایک فوجی اندر سے برآمد ہوا، زخموں سے چور، نڈھال، اس کی آنکھوں سے سمندر جھانک تھا چہرے پر اُگی بے ترتیب داڑھی اس کی پریشانیوں اور ہولناکیوں کی داستان سنا رہی تھی لیکن ہونٹوں پر زندگی سے بھری مسکراہٹ تھی۔

اس نوجوان کو لوگ غور سے دیکھتے رہے اور اچانک سارے لوگ خوشی سے اچھل پڑے۔

"ارے۔ عثمان؟ یہ تو عثمان ہے۔"

عثمان اپنے ایک فوجی دوست کا سہارا لئے آگے بڑھا اور گھر کے اندر داخل ہو گیا، گھر کے اندر سے ایک بار پھر رونے کی صدائیں گونجنے لگیں......

اس وقت یہ سمجھنا مشکل ہو رہا تھا کہ رونے کی یہ صدائیں' خوشی کے ہیں یا غم کے!!!

بوند بوند زندگی

خبر یقیناً حیرت انگیز اور چونکانے والی تھی۔ جس نے بھی یہ خبر سنی، ششدر رہ گیا اور دانتوں تلے انگلی دبالی ..... سراج احمد کو یہ بیماری؟ ..... کیسے ..... ؟ کہاں؟ وہ تو ایسے آدمی نہیں، پھر یہ.....................

ایسی خبریں پر لگا کر اُڑتی ہیں اور جنگل کی آگ کی طرح پھیل جاتی ہیں ..... اور یہی ہوا..... ہر کی زبان پر بس سراج احمد کی بیماری کا ذکر اور تعجب کا اظہار .....

یہ خبر مجھ تک بھی پہنچی، تو میں بھی سن کر حیرت زدہ رہ گیا، یقین ہی نہیں آیا، لیکن جب کئی معتبر لوگوں نے اس کی تصدیق کر دی، تو مجھے بھی یقین کرنا پڑا۔

سراج احمد کو میں کالج کے زمانے سے جانتا ہوں، وہ میرے سینئر دوستوں میں ہیں۔ خاندانی اور رئیس آدمی ہیں، ان کی شرافت اور نیکی کا ہر شخص معترف تھا۔ وہ ہر ایک سے بڑے اخلاق اور محبت سے ملتے، خوبصورت شکل و شباہت، گلابی رنگت لئے ان کا باوقار چہرہ اور اس پر ہر لمحہ پھیلی مسکراہٹ......

کالج کے دنوں میں ان سے آئے دن ملاقات رہتی اور ہر ملاقات میں وہ اپنی شخصیت کا جادو جگاتے ملتے...... ایسی بھرپور اور زندگی سے معمور شخصیت سے بار بار ملنے کو جی چاہتا، لیکن جی کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے...... وقت اور حالات کئی چاہتوں پر پہرے بٹھا دیتے ہیں...... کالج کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد وہ صوبہ کے بڑے افسر بن گئے اور میں اپنی تجارت میں مشغول ہو گیا...... آہستہ آہستہ دوریاں بڑھتی گئیں، بس کبھی کبھار کسی تقریب یا تیوہار پر ملاقات ہوتی، تو ہم دونوں ایک دوسرے سے شکوے گلے کرتے اور دیر تک پرانی یادوں کے چراغ روشن کئے رہتے۔

ان کی بیماری کی خبر سن کر میں دوسرے ہی دن انکی رہائش گاہ پر گیا تو معلوم ہوا کہ آج ہی وہ ڈاکٹروں کے مشورہ پر ممبئی چیک اپ کے لئے گئے ہیں۔ میں مایوس ہو کر واپس آ گیا۔

سراج احمد ممبئی چیک اپ کے لئے گئے اور اپنے پیچھے طرح طرح کی افواہوں کا طوفان چھوڑ گئے۔ کوئی کہتا ان کی اپنی بیگم سے نہیں بنتی، جس کی وجہ سے وہ کسی دوسری عورت کی آغوش ڈھونڈتے رہے ہیں۔ کوئی بتاتا کہ آدمی کو بگڑتے دیر نہیں لگتی، جو شخص صبح سے شام تک دفتر میں حسین دوشیزاؤں کی جھرمٹ میں رہتا ہو، اس کی نیت خراب ہونے میں...... آخر وہ بھی تو انسان ہی ہیں، ضرور وہ اپنی کسی سکریٹری، ٹائپسٹ، اسٹینو یا اسسٹنٹ میں سے......

......کوئی انکشاف کرتا، ارے بھائی! وہ اکثر ٹور پروگرام پر ممبئی جاتے رہے ہیں، ضرور وہیں کہیں، وہ اس مرض کا شکار ہوئے ہیں، اور کوئی سمجھاتا کہ............ غرض، جتنے منھ اُتنی باتیں...... میں ان باتوں کو سنتا اور دل ہی دل میں افسوس کرتا کہ اتنے باعزت اور باوقار انسان کے بارے میں اتنی گندی باتیں...... کیا وہ اس عمر میں، جبکہ ان کے بچے جوان ہو رہے ہیں، ایسی حرکت کے مرتکب ہو سکتے ہیں؟...... میرے ذہن میں طرح طرح کے سوالات ڈوب اُبھر رہے تھے۔

وقت دبے پاؤں گزرتا رہا، افواہیں پھیلتی رہیں، نفرتوں کا اظہار سراج احمد کیلئے ہوتا رہا کہ ایک دن اطلاع ملی کہ وہ ممبئی سے واپس آ گئے ہیں اور ڈاکٹروں نے حتمی طور پر اس بات کی تصدیق کر دی ہے کہ وہ ایڈز کے شکار ہو چکے ہیں، اور ان کی موت بہت قریب ہے۔

یہ سن کر میں کسی ہارے ہوئے پرندہ کی طرح بیٹھ گیا۔ میری نظروں کے سامنے ان کا بارعب چہرہ، باوقار اندازِ گفتگو، ان کی بات بات پر کھنکتی ہنسی کی تصویریں ابھرنے لگیں...... ایسی باغ و بہار شخصیت اور ایسا زندہ دل انسان کس طرح اپنی موت کا پل پل انتظار کر رہا ہوگا...... سوچتے سوچتے ان سے ملنے اور انہیں دیکھنے کو میں بے چین ہو اٹھا اور ان کے گھر کی جانب چل پڑا۔

آدھے گھنٹے بعد میں سراج احمد کی کوٹھی کے سامنے کھڑا تھا، گیٹ کھول کر اندر احاطے میں

داخل ہوا تو سامنے ہی اداس اور بے جان سا مکان نظر آیا، ایسا لگا، جیسے اچانک کسی نے اس مکان کی رونق اور زندگی کو کھرچ دیا ہو...... سامنے برآمدے پر ایک نوکر نظر آیا، اُسے اپنے آنے کا مقصد بتایا تو اس نے بڑی مایوسی کے عالم میں کہا کہ...... ''صاحب اب کسی سے نہیں ملتے ہیں'' یہ کہہ کر وہ واپسی کے لئے مڑ گیا...... میں ایک لمحہ کے لئے سوچ میں پڑ گیا، کیا کروں؟ ہمت کر کے ایک بار پھر میں اس نوکر سے مخاطب ہوا اور کہا...... ''سنو ان سے کہنا، شفیق احمد ملنے آئے ہیں، شاید وہ مل لیں''؟ میری بات سن کر نوکر اندر چلا گیا اور میں بے چینی کے عالم میں ٹہلنے لگا تھوڑی ہی دیر بعد وہی نوکر اندر سے نمودار ہوا اور اس نے مجھے اندر چلنے کا شارہ کیا...... مجھے قدرے اطمینان ہوا اور خوشی بھی ہوئی کہ سراج احمد مجھ سے ملنے پر رضا مند ہو گئے...... یہ سوچتا ہوا میں نوکر کی رہنمائی میں ڈرائنگ روم اور پھر دو کمروں سے گزرتا ہوا ایک کمرہ میں پہنچا...... جہاں ایک شاندار بیڈ پر ایک نحیف اور بے جان سا شخص لیٹا ہوا تھا...... میری نظریں اس شخص سے ملیں تو ایسا لگا جیسے بجلی کا کرنٹ چھو گیا ہو یہ...... یہ...... لاغر جسم، مرجھایا چہرہ اور چہرے پر موت کا گھنا ہوتا ہوا سایہ...... یہ کون...... ؟ کیا یہ سراج احمد ہیں، وہ سراج احمد، جو کبھی............ میں تذبذب کے عالم میں تھا کہ اچانک ایک نقاہت بھری آواز ابھری...... ''اسلام وعلیکم''۔

میں وعلیکم سلام کہنا چاہتا تھا، لیکن مجھ پر تو جیسے سکتہ طاری تھا، میری آواز اندر ہی اندر گھٹ کر رہ گئی، مجھے اس طرح پریشان دیکھ کر، ایک نوکر نے بیڈ کے قریب ہی پڑی کرسی پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا اور میں دھپ سے بیٹھ گیا، اس لئے کہ میں چند لمحے مزید کھڑا رہتا تو ضرور چکرا کر گر پڑتا۔

کچھ دیر تک ہم دونوں ایک دوسرے کو خاموشی کے ساتھ دیکھتے رہے، ایسا لگا، جیسے ہم دونوں کی قوت گویائی جواب دے چکی ہے...... سوچ، فکر اور خیالات کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا...... مجھ سے پہلے سراج احمد ہی اپنے جزبات پر قابو پاتے ہوئے مخاطب ہوئے......

''کیسے ہو شفیق''؟

''جی'' میں...... میں تو ٹھیک ہوں، آپ کیسے ہیں؟ بے اختیار میری زبان سے نکلا۔ جس کے جواب میں انہوں نے ایک مردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا......

''میں'' کیسا ہوں' یہ دیکھ ہی رہے ہو...... میرے خواب وخیال میں بھی کبھی اس بیماری کا تصور نہیں تھا...... لیکن آج میں خود اس جان لیوا بیماری کا شکار ہوں،...... اور تمہیں بتاؤں، کہ میری موجودہ حالت کی ذمہ دار اس بیماری سے زیادہ لوگوں کی نفرت اور شک وشبہ والی نظریں ہیں...... میں ان کی چبھتی نگاہوں کا سامنا کرتے کرتے ٹوٹ گیا ہوں...... میں کس کس کو بتاؤں کہ...... اچھا، تم یہ بتاؤ کہ تم کیا سمجھتے ہو؟ کیا تم بھی یہی سمجھ رہے ہو جو سارے لوگ، یہاں تک کہ میری بیوی اور بچے سمجھ رہے ہیں''؟

''میں.......... نہیں، نہیں، میں ایسا کیسے سمجھ سکتا ہوں، میں آپ کو ایک طویل عرصہ سے جانتا ہوں اور اس بات سے بھی بخوبی واقف ہوں کہ، آپ ایک بلند کردار کے مالک رہے ہیں''...... میں نے انہیں تسلی دینے کی کوشش کی۔

''شکر ہے کہ تم دوسروں سے الگ سوچتے ہو، ورنہ لوگ..........''

انہوں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور ان کی نگاہیں خلاء میں کچھ تلاش کرنے لگیں۔ چند لمحوں بعد وہ پھر مجھ سے مخاطب ہوئے، جیسے انہیں خلاء میں امید کا کوئی جگنو ہاتھ آ گیا ہو اور وہ اس جگنو کو مٹھی میں لے کر اپنے اردگرد کی پھیلی تاریکیوں کو روشنی میں بدل دینا چاہتے ہوں۔

''تم جانتے ہو شفیق! میں شروع سے ایک کیریکٹر والا انسان رہا ہوں، کالج کے زمانے میں کیسی کیسی حسین لڑکیاں میرے قریب آنے کی خواہش مند رہتی تھیں، لیکن میں کبھی بھی ان کی جانب متوجہ نہیں ہوا۔ شادی ہونے کے بعد اور ملازمت کی مصروفیت نے اس جانب سوچنے کا بھی موقع نہیں دیا، میں اپنی چھوٹی سی دنیا میں بے حد خوش تھا...... پچاس سال کی عمر ہونے کو آئی، یہ عمر تو اپنے بال بچوں کی فکر کرنے کی ہوتی ہے نہ کہ بے راہ رویوں کی...... کاش یہ باتیں کوئی میری بیوی اور میرے بچوں کو سمجھا دیتا...... کہ انسان کبھی کبھی وقت اور حالات کے ہاتھوں کتنا مجبور ہوتا ہے...... میں نے ہر طرح سے سمجھانے کی کوشش کی، لیکن ان کی

نگاہیں کہتی ہیں کہ وہ میری باتوں پر یقین نہیں کر رہے ہیں۔ اس لئے میں اب کسی سے کچھ نہیں کہتا...... مرنے کو تو میں مر جاؤں گا، لیکن غم رہ جائے گا کہ کسی نے مجھے سمجھا نہیں

میں چونک پڑا...... آخر کیا بات ہے؟ آپ مجھے بتائیے...... میں نے اپنائیت جتاتے ہوئے اُن کے دل میں داخل ہونے کی کوشش کی اور ایک لمحہ توقف کے بعد وہ دھیرے دھیرے بولے......

''تم تو اس بات سے واقف ہو کہ میں دفتر کے کام سے اکثر ٹور پروگرام پر ممبئی جاتا رہتا تھا......''

''ہاں ہاں، اچھی طرح جانتا ہوں'' میں نے کہا اور سوچنے لگا' اب یہ ضرور ممبئی میں ہونے والے کسی خوشگوار حادثہ کا ذکر کریں گے۔

میرے جواب پر توجہ دیئے بغیر، انہوں نے اپنی بات جاری رکھی...... ''وہاں کی بھاگ دوڑ کی زندگی سے بھی تم واقف ہو' گذشتہ سال فروری میں بھی گیا تھا' ایک روز میں دفتر سے نکل کر ایک سڑک پار کر رہا تھا' کہ اچانک ایک تیز رفتار کار نے مجھے ٹکر مار دی' میں زخمی ہو کر گر پڑا اور بے ہوش ہو گیا۔

ہوش آیا' تو دیکھا' میں ایک نرسنگ ہوم میں ہوں...... بعد میں ڈاکٹروں نے بتایا کہ میرے جسم سے کافی خون نکل چکا تھا' اس لئے کئی بوتل خون چڑھانا پڑا...... اور یہیں سے میری بربادی کی ابتدا ہوتی ہے...... دراصل بلڈ بینک کا جو خون میرے جسم میں داخل کرایا گیا' ان میں سے کوئی ایک بوتل کسی ایڈس کے مریض کا خون تھا' جو میرے جسم میں دوڑنے لگا' جس نے مجھے اس جان لیوا مرض کا شکار بنا دیا...... بعد میں ڈاکٹروں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا' لیکن اس وقت تک کافی دیر ہو چکی تھی...... اس خون نے نہ صرف میری زندگی مختصر کر دی' بلکہ لوگوں کی نفرت اور شک وشبہات سے بھری نگاہوں نے مجھے اتنے زخم دیئے کہ میں ان زخموں سے چور چور ہو گیا ہوں...... اور اب...... اب تو بس مجھے موت کا انتظار ہے' کسی بھی لمحہ...... کسی بھی پل...... میں تم لوگوں سے دور...... بہت دور چلا جاؤں گا...... اچانک ان کی

آواز غموں کے اتھاہ سمندر میں کہیں ڈوب گئی......"

میں ان کے رُندھے گلے اور ڈبڈبائی آنکھوں کو دیکھ کر بے چین ہو کر کھڑا ہو گیا' اور بے اختیار میرا ہاتھ ان کے سر کو سہلانے لگا۔

"آپ کا یہ بیان یقیناً دردناک ہے' ایسا لگتا ہے' آپ نہیں' ہم سب بیمار ہیں' جو آپ کے بارے میں ایسا ویسا سوچ رہے ہیں"

میں یہ کہتا ہوا' ان کی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کو خشک کرنے کی کوشش کرنے لگا!

سید احمد قادری

دستک رشتوں کی

شہر کی فضا اچانک کشیدہ ہوگئی۔

سبب معلوم کرنے پر پتا چلا کہ کالج سے رکشہ پر لوٹتی ہوئی ایک لڑکی کو چند غنڈوں نے زبردستی اتارا اور کار میں بیٹھا لیا، وہاں پر موجود لوگ لڑکی کی چیخ و پکار سن کر دوڑے اور اس نازیبا حرکت کو روکنے کی کوشش کی، لیکن غنڈوں نے ان کی جم کر پٹائی کی اور بہت تیزی سے کار کو بھگاتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

لڑکی کو اغواء کرنے والے شہر کے ایک دبنگ سیاست داں کے گُر گے تھے۔

لڑکی کو اغواء کرنے کی خبر شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور دیکھتے دیکھتے کئی گروپ آمنے سامنے ہو گئے پتھراؤ، بموں کے دھماکے اور بندوق کی گولیوں کی آواز سے شہر کی اچھی خاصی فضا مکدر ہو گئی۔ ضلع انتظامیہ فوراً حرکت میں آ گیا اور حتی الامکان معاملہ کو رفع دفع کرنے کی کوشش کی۔ دونوں طرف کی بھیڑ کو منتشر کرنے کے لئے آنسو گیس چھوڑے گئے، لاٹھی چارج کیا گیا اور ضلع انتظامیہ نے یہ وعدہ کیا کہ بہت جلد لڑکی کو برآمد کر لیا جائے گا۔

میں دفتر سے عموماً شام کے وقت گھر ہی لوٹتا تھا، لیکن ان دنوں میری بیوی مہ ناز اپنے تینوں بچوں کے اسکول میں گرمی کی تعطیل ہو جانے کے سبب حسب پروگرام اپنی مائکے چلی گئی تھیں اس لئے دفتر سے نکل کر میں اپنے دیرینہ دوست رمیش یا جیسوال کے گھر چلا جاتا، شام کی چائے پیتا ٹی وی پر خبریں اور کوئی سیریئل دیکھتا اور ان کی پتنیوں کے اصرار پر کھانا کھا کر ہی لوٹتا۔

لیکن آج یہ سوچ کر کہ ممکن ہے شہر کے حالات مزید بگڑ جائیں اور گھر واپسی میں دشواری ہو، میں دفتر سے سیدھا اپنے گھر لوٹ آیا، گھر لوٹتے لوٹتے شام کا دھندلکا گہرا ہو گیا تھا اور تاریکی پھیلنے لگی تھی، اپنی کالونی میں داخل ہوتے ہی اندازہ ہوا کہ لوگ سراسیمہ ہیں جگہ جگہ کئی کئی ٹولیوں میں لوگ کھڑے تھے اور آج کے ناخوشگوار واقعہ پر اپنے اپنے طور پر تبصرہ کر

رہے تھے۔ ایک جگہ ایسے نوجوانوں کی ٹولی کھڑی تھی جو بے حد مشتعل نظر آرہی تھی، معاملہ ایک لڑکی کا تھا اس لئے فطری طور پر سبھوں کی ہمدردی اس کے ساتھ تھی۔ میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ ضلع انتظامیہ نے وعدہ کیا ہے، وہ بہت جلد لڑکی کو برآمد کر لینگے۔

میری یہ بات سن کر، کئی لڑکے، جو عام طور پر میرا احترام کرتے تھے، مجھ سے الجھ پڑے۔

''برآمد کر لینگے؟ کس حالت میں برآمد کر لینگے؟ کیا ہماری کوئی عزت نہیں ہے، وہ اکثریت میں ہیں تو اس کا کیا مطلب ہے، کہ وہ لوگ ہماری بہو، بیٹی کو اٹھا کر لے جائینگے، ان کی عزت اور عصمت سے کھیلینگے اور ہم لوگ بس تماشائی بنے رہیں، ہے نا...... آپ جیسے لوگوں کی اسی خاموشی اور بزدلی ہی کا تو یہ نتیجہ ہے کہ..........''

نوجوانوں کی بات ابھی کچھ اور آگے بڑھتی کہ اچانک سامنے سے ایک پیٹرولنگ پولیس جیپ آتی دیکھ کر، وہ نوجوان بڑی تیزی سے ایک گلی میں داخل ہو گئے اور میں بھی تیز تیز قدموں سے اپنی گلی میں چلا آیا اور اپنے مکان کا صدر دروازہ کھول کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

فریش ہو کر میں نے ٹی۔ وی آن کر دیا...... خبروں اور تبصروں کا دور چل رہا تھا۔ رات کے آٹھ بجنے والے تھے، لوکل چینل پر خبریں آنے لگیں، آج کے حادثہ کی تفصیل بتاتے بتاتے اناؤنسر نے شہر کے ضلع انتظامیہ کے حوالے سے بتایا کہ افواہوں کا بازار گرم ہے، حالات کشیدہ ہوتے جا رہے ہیں، جگہ جگہ آپسی جھڑپوں کی بھی خبریں ہیں، کوئی بڑا حادثہ رونما نہ ہو، اس لئے احتیاط کے طور پر آج رات آٹھ بجے سے کل صبح آٹھ بجے تک کے لئے کرفیو نافذ کر دیا گیا ہے۔

لوکل نیوز جیسے ہی ختم ہوتی، میں نے ٹی۔ وی۔ آف کر دیا۔ دل کو ایک اطمینان ہوا کہ اب حالات مزید نہیں بگڑینگے کل صبح تک حالات معمول پر آ جائیں گے۔

یہ سوچتے ہوئے میں نے فریز سے کچھ کھانے پینے کا سامان نکالا اور ریڈیو کا ایف ایم بینڈ آن کر دیا اس وقت پرانے گانوں کا وقت ہوتا ہے، جو مجھے بہت پسند ہے، میں نے کھا پی کر چائے بنائی اور چائے کی پیالی لئے ہوئے اپنے بیڈروم میں داخل ہوا اور چائے کی پہلی چسکی

لی ہی تھی کہ ریڈیو سے مبارک بیگم کا ایک دل کو تڑپا دینے والا گانا ...... ''کبھی تنہائیوں میں ...... ہماری یاد آئے گی ...... شروع ہو گیا۔

یہ گانا میں جب بھی سنتا ہوں' ایسا لگتا ہے جیسے یہ گانا مبارک بیگم نہیں، بلکہ میری پُرانے دنوں کی محبوبہ اوشا گا رہی ہے، بلکہ ایسا محسوس ہوتا جیسے اس گانے کی صدا وہ مجھ تک پہنچانا چاہتی ہے، اس سے قبل بھی کئی بار یہ گانا میری سماعت سے ٹکرایا تھا اور میں ہمیشہ ذہن کو جھٹک کر ریڈیو بند کر دیتا اور اپنی بے حد محبت کرنے والی بیوی کے پاس آ جاتا اور اس کی قربت پاتے ہی میں وہ سب کچھ بھول جاتا جو اس گانے کو سننے کے بعد پرانی یادیں طوفان بن کر میرے احساسات و جذبات کو متزلزل کر دیتے تھے۔

لیکن آج میرے پورے گھر میں تنہائیوں کی حکمرانی تھی' بیوی بچوں کی عدم موجودگی سے پورا گھر خاموش خاموش اداس اداس سا لگ رہا تھا اور ایسے لمحے میں اوشا کی یہ صدا میں نے چائے کی پیالی تپائی پر رکھ دی اور اس گانے میں ڈوبتا چلا گیا، اوشا کے ساتھ بتائے ہوئے خوشگوار لمحوں کی یادوں کے ایک ایک چراغ روشن ہونے لگے، آج نہ جانے کیوں، میں نے ریڈیو بند کیا اور نہ ہی یادوں کے روشن ہوتے چراغوں کو بجھانے کی کوشش کی ...... یادیں برسات کی پہلی ہلکی بارش کی پھوار کی طرح میرے روم روم میں ایک عجیب سی لذت جگانے لگیں۔ میں بے خود ہوتا چلا گیا اور اسی بے خودی کے عالم میں گانا ختم ہوتے ہی میں نے اپنا کمپیوٹر آن کر دیا اور ایک خاص پاس ورڈ دے کر اپنا ایک مخصوص اور راز دار ای میل بوکس کھولا ...... نہ جانے وہ کون سا لمحہ تھا' جب میں نے اپنے چند پرانے دوستوں کے کئی اہم خطوط اور تصویروں کے ساتھ ساتھ اوشا کے بھی لکھے ہوئے خطوط اور اس کی کئی تصویروں کو فائل کر دیا تھا۔

ای میل کے فوٹو باکس کے کھلتے ہی اوشا کی ایک بے حد دل آویز مسکراہٹ بھری تصویر سامنے آ گئی' میں اسے دیکھتا رہا' بہت دیر تک دیکھتا رہا، اس کی شوخیاں، چلبلا پن، اس کی دوشیزگی، اس کا الہڑ پن، اس کی ایک ایک باتیں، اس کا روٹھنا، اس کا منانا ...... تصویر دیکھتے دیکھتے میری آنکھوں سے سیلاب اُمڈ آیا، آنکھوں سے نکلنے والے آنسوؤں نے میرا

چشمہ بھگو دیا، میں نے چشمہ اُتارا اسے رومال سے صاف کیا اور پھر آنکھوں پر چڑھایا......
ماؤس کو حرکت دی تو اوشا کی ایک دوسری تصویر سامنے آ گئی، اس تصویر میں وہ کس قدر خوبصورت دلا آویز اور چنچل لگ رہی تھی......تصویر ایسی تھی، جیسے وہ اب بس بول پڑے گی......
......یہ تمام تصویریں اوشا نے خاص طور پر میرے لئے کھینچوائی تھی، اس لئے ہر تصویر میں وہ اپنے جسم اور آنکھوں سے بس مجھ سے مخاطب تھی اور پھر......وہ تصویر سامنے آ گئی، جسے دیکھ کر میں لرز اُٹھا' اس تصویر میں اوشا تھی اور اس کی گود میں دس بارہ ماہ کا ایک بے حد پیارا معصوم سا بھولا بھالا اور پھولوں کی طرح شاداب کھلا ہوا بچہ ہے، یہ بچہ...... یہ بچہ دراصل اوشا اور میری محبت کی نشانی ہے اور اس راز سے صرف ہم دونوں ہی واقف ہیں ورنہ ساری دنیا یہ جانتی ہے کہ یہ بچہ اوشا اور اس کے شوہر منوہر کا ہے۔ اس بچے کا نام اوشا میرے نام جیسا رکھنا چاہتی تھی۔ اس لئے میں نے اس کا نام سنجو رکھا تھا، بعد میں اوشا نے اپنے شوہر سے بھی خوبصورت بہانا بنا کر اس نام کی رضامندی لے لی تھی......اس وقت تک میری شادی نہیں ہوئی تھی اور میں اپنے سنجو کو دیکھنے، اس سے ملنے اور اسے سینے سے لگانے کے لئے تڑپتا رہتا تھا، کبھی کبھی میں اس قدر جزباتی ہو جاتا تھا کہ میری خواہش ہوتی کہ راز کی ساری حدوں کو پھلانگ دوں، ساری دیواروں کو توڑ دوں اور دنیا کو چیخ چیخ کر یہ بتا دوں کہ سنجو میرا بیٹا ہے، میں ہی اس کا باپ ہوں.............

لیکن ایسا کرنے کے بعد' اوشا کی زندگی............؟ جسے اس نے میرے بہت سمجھانے بجھانے پر بسائی تھی، اور ٹھیک اس وقت وہ شادی کے لئے رضامند ہوئی تھی جب اس نے میرے جذباتی محبت کے گوہر کو پا کر گلو سوز ہوئی تھی اس کی پُر بہار زندگی پت جھڑ میں بدل جاتی اور میں ایسا کسی بھی حال میں نہیں چاہتا تھا، یہی وجہ تھی کہ ہم دونوں نے وقت اور حالات کے آگے سپر ڈال دی اور میں بھی مہہ ناز کا ہو کر، اوشا کی زندگی سے دور، بہت دور نکل آیا اور کوشش کی کہ اپنی ان یادوں کو دل سے کھرچ کر نکال دوں اور میں اس میں کامیاب بھی ہو گیا، بس کبھی کبھی سنجو کی کسک ایک ٹیس بن کر ابھرتی، لیکن دھیرے دھیرے میں نے اسے بھی فراموش کر دیا تھا۔
اچانک غیر ارادی طور پر ماؤس پر میری انگلی کی حرکت سے کمپیوٹر اسکرین پر سنجو کی دوسری

تصویر سامنے آ گئی، اس تصویر میں وہ تقریباً پانچ سال کا تھا، بے حد چلبلا، شریر سا اور بہت غور سے دیکھنے کے بعد اس کے چہرے کے نقوش پر میرے چہرے کی پر چھائیاں رقص کرتی نظر آئیں، میں جزبات سے بھر گیا اور بے اختیار میرا ہاتھ اس کے چہرے کو چھونے کو بڑھا، لیکن میرا ہاتھ کمپیوٹر کے اسکرین سے ٹکرا کر رہ گیا اور میں مایوس ہو گیا...... میں اپنے بچے کو چھو نہیں سکتا، دیکھ نہیں سکتا، پیار نہیں کر سکتا...... اس سے بڑھ کر میرا المیہ کیا ہو سکتا ہے...... اس تصویر کے بعد اوشا نے اس کی کوئی تصویر نہیں بھیجی اور شائد وہ اپنی گھر گرہستی میں گم ہو گئی تھی، اور یہ اچھا ہی ہوا میں بھی اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ ان دونوں کے وجود کو فراموش کر چکا تھا......

ہاں ایک دن جب میں دفتر کے کام سے دفتر کی کار سے فلائی اور سے گزر رہا تھا کہ اچانک ٹریفک جام ہو گیا اور میری کار کے ٹھیک پاس میں ایک کار لمحے بھر کے لئے رکی تو دیکھا کار کی پچھلی سیٹ پر اوشا بیٹھی تھی اور اس کے بغل میں ایک سترہ اٹھارہ سال کا ایک نوجوان تھا مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اوشا کے ساتھ یہ لڑکا نجو ہے، میں نے چونک کر دیکھا، اوشا بھی چونکی، لیکن ٹھیک اسی وقت ٹریفک رواں دواں ہو گیا اور اس کی کار فراٹے بھرتی ہوئی آگے نکل گئی۔

نجو کو دیکھے ہوئے کئی سال ہو گئے، اب تو وہ تقریباً بیس سال کا نوجوان ہو گیا ہوگا......

یادیں جھما جھم برسات میں بدل گئیں...... رات کے بارہ بج گئے، کرفیو نے آس پاس کے ماحول کو سناٹے میں بدل دیا تھا، ورنہ اس بڑے شہر میں گاڑیوں کی تیز روشنی اور ہارن کی آواز سے پورا شہر جاگتا رہتا ہے، لیکن آج کا پر ہول سناٹا، ایک عجیب سی ڈراؤنی کیفیت پیدا کر رہا تھا............ لیکن میں ان تمام حالات سے بے خبر یادوں کی تیز برسات میں نہا رہا تھا کہ اچانک کچھ شور سنائی دیا، میں نے جلدی سے کمپیوٹر آف کیا اور کھڑکی کے قریب گیا اور باہر نظر دوڑائی اور جو ماحول دیکھا، اس نے میرے ہوش وحواس اُڑا دئے، باہر فلک شگاف نعرے لگ رہے تھے، لوگوں کی بھاگ دوڑ چیخ و پکار، مارو، بچاؤ، بھاگو کی خوفناک اور دلدوز آوازیں ...... میں ابھی پوری بات سمجھ نہیں پایا تھا کہ اچانک میرے فلیٹ کا صدر دروازہ کو زور زور سے پیٹا جانے لگا میں نے سوچا فلیٹ والے سارے لوگ یکجا ہو گئے ہیں اور حفاظتی اقدام کے لئے بھاگ دوڑ کر رہے ہیں، میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا اور دروازہ کھلتے ہی پندرہ

بیس نوجوان دھڑ دھڑاتے ہوئے کمرے میں داخل ہو گئے، ان کے ہاتھوں میں برچھی، بھالا، ترشول جیسے اسلحے تھے، ان کی آنکھوں سے درندگی ٹپک رہی تھی اور کپڑوں پر خون کے چھینٹے تھے، یہ دیکھ کر میرے پاؤں تلے کی زمین کھسک گئی اور مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ کون لوگ ہیں اور کس مقصد سے یہاں آئے ہیں، ان درندوں میں سے چند نوجوان مجھے دھکا دیتے ہوئے، دوسرے کمرے کے اندر داخل ہو گئے، شائد وہ لوگ میرے خاندان کے دیگر افراد کو تلاش کر رہے تھے، چار پانچ لڑکے میرے سامنے اسلحہ اٹھائے کھڑے رہے، اندر کمرے سے لوٹے نوجوانوں نے سامنے کھڑے نوجوانوں کو نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کچھ اشارے کئے اور پھر ایک آواز ابھری...... ''سنجو' مار سالے کو...... '' سنجو......؟ میں چونک پڑا...... اس نام سے بڑی اپنائیت کا احساس ہوا...... میں نے نظریں اٹھائیں، سامنے کھڑے نوجوان کو دیکھا اور اُسے دیکھ کر میری نظریں ٹھٹھک پڑیں...... ارے...... یہ تو وہی لڑکا ہے جسے میں نے اوشا کے ساتھ اس دن کار میں بیٹھے ہوئے دیکھا تھا...... تو کیا یہ سنجو......؟ میری نظروں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا اور پھر اچانک، ان لوگوں نے مجھے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور پہلا وار سنجو ہی نے کیا...... میں کسی کٹے ہوئے تناور درخت کی طرح زمین پر گر پڑا زخم پر زخم لگنے لگے اور میرا ذہن ڈوبتا چلا گیا...... کوئی روشنی نہیں، کوئی آواز نہیں۔

اور جب کئی دنوں بعد روشنی لوٹی، کانوں میں صدائیں گونجی اور میں ہوش میں آیا، تو دیکھا، میں کسی اسپتال میں ہوں، میرا جسم زخموں سے چور ہے، نہ جانے میں کیسے بچ گیا...... نظریں گھمائیں تو دیکھا میری بیوی مہ ناز اور میرے بچے میرے گرد جمع ہیں اور ان کے چہرے غمگین ہیں، مجھے ہوش میں آتے دیکھ میری بیوی میرے قریب آ گئی اور مجھ سے لپٹ کر سسکیاں بھرنے لگی اور بڑبڑانے لگی...... ''خدا غارت کرے اسے جس نے اپنے جانتے ہوئے آپکو ختم ہی کر دیا تھا''۔

میں نے اس کے مُنھ پر ہاتھ رکھ دیا...... نہیں مہ ناز ایسا نہ کہو......

اور میری بیوی چونک کر عقیدت بھری نظروں سے مجھے دیکھنے لگی!

شکاری فاختاؤں کے

حکم ملتے ہی میں ایک خاص علاقہ کی بغات کی سرکوبی کے لئے سپاہیوں کی ایک ٹکڑی لے کر نکل پڑا۔ علاقہ کے اندر داخل ہوا تو دیکھا ہر سمت سے کالے دھوئیں کے مرغولے اٹھ رہے تھے، اور انسانی چیخ و پکار سے پورا علاقہ کراہ رہا تھا' باغیوں نے ایک سرکاری دفتر پر حملہ کر اُسے نذر آتش کر دیا تھا، جس کے جواب میں فوجیوں نے گولیوں کی بوچھار کر دی تھی، جس سے کافی لوگ زخمی ہوئے تھے اور کچھ لوگوں کی موت بھی واقع ہوگئی تھی۔

سپاہیوں کے ساتھ الرٹ پوزیشن' میں علاقہ میں میرے داخل ہوتے ہی ہر طرف سناٹا چھا گیا، گولیوں کی بوچھار کا خوف اور موت کے تصور نے باغیوں کو اپنے اپنے گھروں میں دبک جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ ہاں جس گھر کا کوئی فرد زخمی ہوا تھا یا مارا گیا تھا، ان گھروں سے آہ و بکا کی آوازیں سناٹے کو چیر رہی تھیں۔ ادھر دھیان دیئے بغیر میں آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک ہم پر پتھروں سے حملہ کر دیا گیا، میرے فوجیوں نے ان پر بندوقیں تان لیں اور میری جانب فائرنگ کے آرڈر کے لئے منتظر نظر آئے' لیکن میں نے فائرنگ کا آرڈر نہیں دیا، اس لئے کہ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کہ ہم پر پتھروں سے حملہ کرنے والے نہتے بچے اور چند جوان لڑکیاں تھیں جو فوج کی گولیوں سے اپنے کسی فرد کے شدید زخمی ہونے یا مرنے پر اپنی برہمی کا برملا اظہار کر رہی تھیں ان کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا، لیکن ان کے اندر جو جرأت ہمت اور غم و غصہ تھا وہ حیرت ناک تھا۔

میں چاہتا تو میرے ایک اشارے پر وہ دس بارہ برس کے بچے اور جوان لڑکیاں، میرے سپاہیوں کی گولیوں کا نشانہ بن سکتے تھے۔ لیکن میں نے انہیں صرف کھدیڑنے کا حکم دیا اور خود ہی ان کے پیچھے دوڑ پڑا۔ ہم لوگوں کو دوڑتا دیکھ کر وہ بچے اور لڑکیاں بھاگتے ہوئے اپنے اپنے گھروں میں گھس گئیں۔

اس درمیان میرے جوانوں نے پتھروں سے حملہ کرنے والی چند نو جوان لڑکیوں کو گرفتار کرلیا' جس کی وہ سخت مزاحمت کر رہی تھیں اور خاص بات یہ تھی کہ یہ لڑکیاں سپاہیوں سے رحم کی بھیک مانگنے کی بجائے انہیں گالیوں سے نواز رہی تھیں۔

اس پورے علاقے کو خوف و دہشت کے ماحول میں ڈوبا دیکھ کر ہم لوگ شام گئے اپنی چھاؤنی میں واپس آ گئے اور پھر دن بھر کی تھکان اور باغیوں کے حوصلے پست کر دینے کا جشن شراب سے بھرے جام سے جام ٹکرا کر منانے لگے اور رات گئے جب شراب کا نشہ بدمست کرنے لگا' تو اس شراب کی بدمستی میں شباب کو بھی گھول دیا گیا۔

گرفتار کی گئی لڑکیوں میں سب سے خوبصورت اور نوخیز لڑکی ڈولی کو میں نے اپنے لئے منتخب کیا۔

لڑکی کو جب میرے کمرے میں لایا گیا، تو میں نے بغور اس پر ایک نظر ڈالی' وہ بلا کی حسین اور نوخیز تھی گلابی رنگت لئے ، اس کا شاداب چہرہ، ستواں ناک، نرگسی اور مخمور آنکھیں، رسیلے، پتلے سرخ ہونٹ، جیسے ان میں شہد بھرا ہو، کالی گھنیری زلفیں' لمبی خوبصورت صراحی دار گردن اور اس کے اس متناسب جسم پر دو ابھار' دعوت شباب دے رہے تھے، وہ مجھے ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھی، جیسے کوئی فاختا کسی شکاری کے ہاتھ میں قید ہو کر اپنی معصوم لیکن بے بس نگاہوں سے دیکھ رہی ہو' اور اپنی آزادی کے لئے کسمسا رہی ہو۔

شراب سے بدمست میری نگاہوں نے بغور اس کے حسن و جمال کا معائنہ کیا اور اس کی تمام تر رحم کی اپیل اور مذاحمت کو مسترد کرتے ہوئے اس کے خوبصورت جسم پر کے بوسیدہ اور افلاس زدہ کپڑے میں نے اتار پھینکے۔ اس کے نوخیز اور حسین بدن پر سے کپڑوں کے ہٹتے

ہی اس کا دودھیا چاندنی میں نہایا جسم میری آنکھوں کو خیرہ کرنے لگا اور میں بے تاب ہو کر اس کے جسم سے کھیلنے لگا، اس کے بدن کے پور پور سے ایسی خوشبو اور لذت مجھے مل رہی تھی کہ سینکڑوں بوتل پرانی شراب کا نشہ بھی اس کے سامنے بے معنیٰ اور بے کیف تھا اور میں اس کے نشے میں ڈوبتا چلا گیا' اور پھر چند گھنٹوں بعد ہی مجھے ایسا محسوس ہوا، جیسے میں نے سینکڑوں میل کی مسافت دوڑتے ہوئے طئے کی ہے اور منزل پر پہنچ کر میں ہانپتا ہوا گر پڑا۔

تھوڑی دیر بعد وہ فاختا نما حسینہ درد و کرب کی مجسم تصویر بنی، دوسرے کمرے میں لے جائی گئی، جہاں سے چیخ' کراہ اور قہقہے کی آوازیں گونجتی رہیں، لیکن میں ان سب سے بے نیاز بہت جلد نیند کی وادیوں میں کھو گیا۔

دوسری صبح میں تیار ہو کر ناشتہ کی میز پر تھا کہ ایک سپاہی نے سیلوٹ کیا اور کہا۔

''ایک آدمی آپ سے ملنا چاہتا ہے''

میں نے حیرت سے پوچھا۔''کون ہے''

جواب میں سپاہی نے بتایا کہ''وہ کوئی انجان آدمی ہے اور آپ سے ملنے کو بضد ہے۔''

میں نے ناشتہ ختم کر کافی کی چسکیوں کے درمیان اس آدمی کو اندر بلانے کو کہا۔ جب وہ آدمی اندر میرے سامنے آکر کھڑا ہوا تو، میں نے دیکھا پچاس، پچپن سال کے درمیان کا ایک غریب آدمی ہے جو میرے لئے بالکل انجان ہے اور لباس اور انداز سے مقامی لگ رہا تھا۔

اسے بغور دیکھتے ہوئے میں نے اس سے سوال کیا۔

''کہو، کیا بات ہے، تم کیوں مجھ سے ملنا چاہتے ہو۔'؟

جواب میں وہ میرے قدموں پر گر پڑا اور زار و قطار روتے ہوئے کہنے لگا۔''حضور، میں اس علاقہ کا ایک بے حد غریب مزدور ہوں، میں دوسرے علاقے میں مزدوری کرنے گیا تھا، شام گئے واپس لوٹا، تو معلوم ہوا، علاقے میں ہنگامہ ہو گیا تھا اور اس ہنگامہ میں میرا بیٹا مارا گیا اور میری بیٹی ڈولی غائب ہے۔ ہر جگہ اسے ڈھونڈا لیکن اس کا کہیں کچھ پتہ نہیں چلا، بعد

میں معلوم ہوا کہ اسے گرفتار کر یہاں لایا گیا ہے اور.....اور حضور ہملوگوں کا قصور کیا ہے؟ جو اتنی بڑی سزا دی جا رہی ہے، میری بیٹی کو آزاد کر دیجئے کم از کم وہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا آخری دیدار تو کر سکے، میں زندگی بھر اس کے لئے آپکا احسان مند رہونگا.........‘‘

فرط جذبات میں وہ بولتا چلا گیا، اور میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

تھوڑی دیر تک، میں کچھ سوچتا رہا اور پھر اس سے مخاطب ہو کر کہا۔ ’’تم جاؤ تمہاری بیٹی آزاد کر دی جائیگی۔‘‘

وہ مجھے دعائیں دیتا ہوا باہر نکل گیا، اور میں نے اپنے ایک سپاہی کو بلا کر حکم دیا کہ رات والی اس لڑکی ڈولی کو آزاد کر دو، اور آزاد کرنے سے پہلے اسے سمجھا دو کہ اس کے ساتھ جو کچھ بھی یہاں ہوا ہے اسے بھول جائے، کسی کو کچھ بتا ئیگی نہیں، ورنہ اسے پھر گرفتار کر لیا جائیگا اور اس کی ذمہ دار وہ خود ہوگی۔

میں یہ حکم دے کر سپاہیوں کی ایک ٹکڑی لے کر دوسرے علاقوں کے دورہ پر نکل گیا اور جہاں کہیں بھی کوئی باغیانہ مظاہرہ دیکھنے کو ملتا ان کی سرکوبی کے لئے کہیں گولیاں چلواتا، کہیں لاٹھی چارج کراتا، کہیں کہیں کھدیرنے سے بھی کام چل جاتا، شام گئے تک حالات کو قابو کرنے کے دوران کئی لاشیں گرتیں، کچھ لوگ زخمی ہوتے اور کچھ گرفتاریاں بھی ہوتیں اور گرفتار ہونے والوں میں درجنوں مقامی لوگوں کے ساتھ ساتھ چند لڑکیاں ضرور ہوتیں۔

یہی چند لڑکیاں رات گئے چھاؤنی میں میرے اور دوسرے سپاہیوں کی تھکان مٹانے کا ذریعہ بنتیں۔

ان علاقوں میں باغیانہ مظاہرے ہوتے ہوئے کئی ماہ ہو چکے تھے، اس درمیاں جہاں سینکڑوں مقامی افراد مارے گئے تھے، وہیں ہمارے درجنوں سپاہی بھی شہید ہوئے تھے، لیکن باغیانہ جدوجہد میں کوئی کمی نہیں آ رہی تھی، اور اب تو مقامی مظاہرین کے غم وغصہ کا نشانہ ہم لوگ بھی بن رہے تھے، اس لئے ہم لوگوں نے اپنے گرد حفاظتی انتظامات سخت کر دئے تھے، لیکن خوف کے سائے میں بھی ڈیوٹی کے بعد شراب اور شباب کے سرور و مستی میں

ڈوب جانے کا سلسلہ جاری رہا اور اس شراب و شباب کا طویل سلسلہ میری صحت پر مضر اثرات ڈالنے لگا، کبھی کبھی میں خود کو بے حد مضمحل اور اندر سے بہت کمزور محسوس کرنے لگا۔

ایک دن جب ڈیوٹی پر نکل رہا تھا کہ اچانک میں لڑکھڑا کر گر پڑا اور بے ہوش ہو گیا۔ سپاہیوں نے ملٹری اسپتال میں داخل کر دیا جہاں معائنہ کے بعد ڈاکٹروں نے فوری طور پر میری شراب نوشی پر پابندی لگا دی اور بتایا کہ میرے جسم کے دونوں گردے خراب ہو چکے ہیں اور اگر جلد ہی انہیں تبدیل نہیں کیا گیا تو جان جانے کا خطرہ لاحق ہے۔

ڈاکٹروں کی ان باتوں سے میں پریشان ہو گیا اور میری نظروں کے سامنے موت کا سایۂ منڈرانے لگا، میرے دل و دماغ پر اس کے منفی اثرات مرتب ہونے لگے اور بہت تیزی سے میری صحت گرنے لگی۔

اسپتال کے ڈاکٹروں کو بھی میری گرتی صحت دیکھ کر تشویش ہونے لگی اور وہ لوگ گردے کا عطیہ دینے والے کی تلاش میں رہنے لگے۔ اس کے لئے ان لوگوں نے اخبارات میں اشتہار بھی شائع کرائے۔

ایک دن اچانک ایک ڈاکٹر خوشی سے اچھلتا ہوا میرے پاس آیا اور بتایا کہ "ایک مقامی شخص جو اپنی زندگی سے بیزار ہے، جوان بیٹے کی موت اور جوان بیٹی کی خودکشی کے بعد اسے زندگی بے معنی لگ رہی ہے، وہ اپنا گردہ عطیہ کرنے کو تیار ہے——" اس کی باتیں سنتے ہی، میری باچھیں کھِل گئیں، ڈاکٹر کی باتوں نے میری بجھتی زندگی میں روشنی کا جھماکہ کر دیا اور میں بے اختیار بستر سے اُٹھ کر ڈاکٹر سے لپٹ گیا اور بولا "ڈاکٹر اب تم مجھے بچا سکتے ہو، اب مجھے نئی زندگی دے سکتے ہو۔"

ڈاکٹر نے مجھے تسلی دی اور کہا۔ "ہاں، آج ہی میں اس شخص سے ملونگا اور دو تین دنوں کے اندر آپریشن کر گردہ تبدیل کر دیا جائیگا۔

چند دنوں بعد ہی میں انتہائی نگہداشت یونٹ میں رکھا گیا اور ایک ہفتہ کے اندر ہی آپریشن کے بعد روم میں واپس لایا گیا، میرا آپریشن کامیاب ہوا تھا۔

ڈاکٹر بہت خوش تھے اور ان سے کہیں زیادہ نئی زندگی ملنے پر میں خوش تھا اور اس خوشی سے سرشار ہو کر میں نے ڈاکٹر سے خواہش کا اظہار کیا کہ میں اپنے اس محسن سے ملنا چاہتا ہوں جس نے میری ڈوبتی زندگی کے ناؤ کو منجدھار سے نکالنے کے لئے اپنی زندگی کی کشتی کو بھنور میں ڈال دیا۔

ڈاکٹر نے میری خواہش کا احترام کرتے ہوئے دوسرے عام کمرہ میں گردہ نکلنے کے بعد علاج کرار ہے ایک شخص کو بلالایا۔

میں نے اسے غور سے دیکھا' مجھے اس کا چہرہ آشنا لگا، میں اپنی یادداشت پر زور دینے لگا، کہاں دیکھا ہے، اس شخص کو؟ کہاں ملا ہوں میں اس سے؟

اچانک ایک جھما کہ ہوا۔ بجلی سی کوندی اور میرا پورا وجود سوکھے پتے کی طرح لرزنے لگا' وہ شخص اور کوئی نہیں' فاختہ جیسی معصوم حسینہ ڈولی کا وہ باپ تھا جس کے ساتھ میں نے اور......اور...!

میرا دل ڈوبنے لگا، آنکھوں تلے اندھیرا چھانے لگا اور میں اندھیرے گھپ اندھیرے میں ڈوبتا چلا گیا!!!

پہرے خوابوں پر

''ارے مدنا' ادھر ٹیبل صاف کر' کیا کر رہا ہے رے' ادھر پانی دے، ارے دیکھ سالے برتن اٹھا...... یہ سالا مدنا تو ایکدم کوڑھیا ہے، سالے سے کوئی کام ہی نہیں ہوتا..... اُدھر کا تاک رہا ہے...... اور اوحرامی رجوا کدھر گیا؟ سالا' اپنی بہن کا بھتار کھوج رہا ہے کا......''

مدن اور راجو دس بارہ برس کے یہ لڑکے کرین میموریل اسکول کے پاس کے ایک ہوٹل میں صبح سے رات گئے تک ایسے ہی الفاظ سنتے رہتے۔ کبھی ہوٹل کا مالک ڈانٹتا' کبھی کوئی گاہک آکر گالیوں سے نوازتا اور کبھی......

یہ دونوں بھی ان گالیوں کے عادی ہو گئے تھے۔ روز روز کی گالیوں سے بھی بے مزہ نہیں ہوتے' ہاں گالیاں اور ڈانٹ سننے کے بعد ان کے ہاتھ گندے ٹیبل صاف کرنے اور جوٹھے برتن اٹھانے میں تیزی سے چلنے لگتے۔

مدن اور راجو دونوں دو گاؤں سے لائے گئے تھے، ماں کی موت کے بعد، ان کے باپ نے دوسری شادی کر لی' تب دور کے رشتہ داروں نے انھیں اس ہوٹل میں لا کر رکھ دیا تھا کہ ہوٹل میں کام کر کے بھوک سے تو نجات مل جائیگی، ورنہ حالات ایسے تھے کہ کئی کئی روز انہیں لوگوں کی دی ہوئی ایک آدھ روٹیوں پر ہی گزارا کرنا پڑتا تھا۔

ان دونوں کے گندمی رنگ کو زندگی کی تیز دھوپ نے سیاہ مائل کر دیا تھا، نیکر اور گنجی نے

بھی اپنی رنگت کھو دیا تھا اور لگا تار ہفتوں پہنے رہنے پر ان کپڑوں کا رنگ ہی کالا ہو گیا تھا۔ ہاں دو ٹائم سیر ہو کر یہ دونوں ہوٹل والے کا دیا ہوا کھانا کھاتے' پھر دن بھر گالیاں کھاتے اور رات گئے' ہوٹل کا سارا برتن دھو کر سوتے' تو انہیں کچھ ہوش نہیں رہتا' کبھی کسی روز رات گئے انہیں محسوس ہوتا کہ کوئی ان کا نیکرا اتار رہا ہے اور گندی گندی حرکتیں کر رہا ہے۔ وہ احتجاج کرتے' لیکن پچیس تیس سال کے بڑے نوکر، انہیں دھمکی دیتے'' چپ چاپ رہ نہیں تو مالک سے کہہ کر نکلوا دونگا پھر سالے بھوکوں مرو گے'' اور انہیں اپنی بھوک کی شدت یاد آتی اور وہ دونوں کراہ کر احتجاج کرتے رہ جاتے اور اب تو وہ بڑے نوکروں کی ان حرکتوں کے بھی عادی ہو گئے تھے۔

رات سے صبح کیسے ہو جاتی انہیں کچھ پتا ہی نہیں چلتا' رات کے اندھیرے میں سوتے اور اجالے کی کرن پھیلنے سے قبل ہی ہوٹل کے مالک کی ٹھوکروں سے وہ جاگ جاتے اور پھر کولھو کے بیل کی طرح جُت جاتے....کام......گالیاں....گندی حرکت..... یہ سب تو روز کا معمول بن گیا تھا.....

جس روڈ پر ہوٹل واقع تھا۔ اس روڈ پر کئی اسکول تھے طرح طرح کے چھوٹے بڑے اسکول......صبح سویرے اس روڈ پر بچے ہی بچے نظر آتے' پیدل، سائیکل پر، اسکوٹر، موٹر سائیکل پر۔ بسوں میں، ٹمپو میں بیٹھے ہوئے' طرح طرح کے ڈریسوں اور ٹائیوں میں موٹے موٹے بستوں کے ساتھ کوئی بچہ ماں کی انگلی پکڑے ہوئے کوئی بچہ اپنے باپ کے ساتھ اسکول جاتا ہوا.....

صبح کا یہ نظارہ دیکھ کر مدن اور راجو کو کچھ عجیب سا لگتا...کاش انہیں بھی کوئی ان کی انگلیاں پکڑ کر اسکول لے جاتا انکے کپڑے بھی ایسے ہی صاف و شفاف ہوتے' ڈریس پر خوبصورت ٹائی ہوتی، بھاری بھر کم کتابوں کاپیوں اور لنچ بوکس سے بھرا بستہ ہوتا...اور وہ....بھی......

تصوراتی دنیا میں وہ لمحے بھر کے لئے اترتے ہی کہ اچانک....ہوٹل کے مالک کی کڑک دار آواز گونجتی۔'' ارے سالا کھڑا کاہے ہے' رے ٹیبل کا تورا باپ صاف کرے گا'' اور یہ سنتے

ہی ان کے ہاتھ بڑی تیزی سے ٹیبل صاف کرنے لگتے دوڑ کر دوسرے ٹیبل پر کے جوٹھے بر تن اٹھانے لگتے کہ تاخیر ہونے پر کہیں ہوٹل کے مالک کی ایک آدھ لات ان پر نہ پڑ جائے۔ اس لئے کہ وہ دونوں اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ انکی حیثیت یہاں سڑکوں پر گھومنے والے آوارہ کتوں سے بھی بدتر ہے کہ جو جب چاہتا ہے، پتھر اٹھا کر مار دیتا ہے۔

ایک دن روزانہ آنے والا ایک گاہک جو چائے پینے کے ساتھ ساتھ صبح کا اخبار بھی پڑھتا تھا اور وہ ان دونوں سے مانوس بھی تھا۔ اخبار پڑھتے پڑھتے اچانک وہ ان دونوں سے مخاطب ہوا....

''ارے مدن اور راجو سن تمرے لاکھوس کھبری ہے، اب تو لوگن کو کام کرے پر پابندی لگ گیا ہے، چھوٹا لڑکن لوگ ہوٹل کارکھانہ گیراج میں کام نہ کرے گا اور سب لڑکن لوگ اسکول جائیگا.....''

اخبار کی یہ بات اس گاہک کی زبانی سنکر انہیں بڑا اچھا لگا۔

''تو کا ہم ہو اب اسکول جائب؟'' راجو نے اس گاہک سے سوال کیا راجو کے ساتھ ساتھ مدن بھی تجسس بھری نگاہوں سے گاہک کو دیکھنے لگا۔

''ہاں رے اب تو ای کانون بن گیا ہے''

گاہک نے بڑے اطمینان سے اسے جواب دیا

......اور اس جواب نے مدن اور راجو کو ایک بار پھر خوابوں کی وادیوں میں پہنچا دیا۔ پڑھائی...... پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنے گا.......اس کا بھی ایک پریوار ہوگا...اچھے کپڑے..... اچھی زندگی......

اچانک ایک بھدی سی گالی نے انہیں چونکا دیا۔

''ارے سالا جا کر کوئلہ توڑ کر لا اور چولہا میں ڈال، دیکھ آگ دھیما ہو رہا ہے......''

اور راجو دوڑتا ہوا گیا اور کوئلہ توڑنے لگا اور مدن ٹوٹے ہوئے کوئلوں کو چولہا میں ڈالنے

لگا۔

دونوں خاموشی سے کام میں منہمک تھے، لیکن ان کے دل و دماغ میں گاہک کی بات بازگشت کر رہی تھی...."اب چھوٹا لڑکن لوگ کو کام کرنے پر پابندی لگ گیا ہے......انہیں پڑھائی لکھائی میں لگایا جائیگا.....اور.....اور.........."

دونوں کو گاہک کی بات بڑی اچھی لگی تھی۔

اچانک ان کے خیالات' حقیقت کے چٹان سے ٹکرا کر چور چور ہو گئے۔

لیکن ہم رہینگے کہاں؟ اور کھائنگے کیا۔ کون ہمیں اپنے پاس رکھ کر کھلائیگا اور اسکول بھیجے گا—اور ایک بار پھر انہیں وہ وقت یاد آیا جب وہ بھوک سے تڑپتے تھے اور کوئی انہیں سہارا دینے کو تیار نہیں تھا۔

چھوڑ یار' یہی جندگی اچھی ہے، دن بھر کام کے بعد پیٹ بھر کھانا تو ملتا ہے۔

اور......پھر دونوں سر جھٹک کر ٹیبل صاف کرنے اور جوٹھے برتن اُٹھانے میں مشغول ہو گئے۔

کوئی صدا نہیں

پورے گاؤں پر بھیانک طوفان کے بعد کی خاموشی سی چھائی تھی۔بس کبھی کبھی کہیں سے کسی کتے کی رونے کی آواز یا پھر ایک سمت سے دوسری سمت گذرنے والے گدھوں اور چیلوں کی پھڑ پھڑاہٹ ابھرتی اور پھر وہی خاموشی اور گہرے سکوت کا عالم ،زخموں سے چور، لہولہان جسم ،نڈھال بوڑھا ہوش میں آنے لگا۔اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے کی کوشش کی اور دل دوز چیخ کے ساتھ ایک بار پھر بے ہوش ہو گیا۔تھوڑی دیر بعد پھر اسے ہوش آیا اور اس نے اپنے اندر کی ساری قوتوں کو جمع کر ایک دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہونے کی کوشش کی ،جسم سے کافی خون نکل چکا تھا۔درد کی شدت سے وہ کراہ رہا تھا۔لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری اس کے قدم آہستہ آہستہ بڑھنے لگے۔دھیرے دھیرے اسے رات کا بھیانک حادثہ یاد آنے لگا۔

بند مکان کے اندر کے لوگوں کو باہر نکالنے کے لئے ایک کمزور دیوار میں شگاف ڈال کر آگ کا ایک گولا اندر پھینکا گیا تھا اور مکان کے اندر جب ہر طرف آگ بھڑک اٹھی تو مکیں آگ سے بچنے کے لئے دوسری آگ میں کود پڑے۔دروازہ جیسے ہی کھولا گیا بلوائی ایک ساتھ ان پر ٹوٹ پڑے اور پھر بھیانک دل دہلانے والا منظر تھا۔سب سے پہلے اس کے بڑے بیٹے پر گولی چلی اور وہ چیخ کر ایک جانب لڑھک گیا۔اسے گرتے دیکھ کر اس کی بیوی گود میں آٹھ ماہ کا بچہ لئے ہوئے اس کی جانب دوڑی اور ایک ہی وار میں ماں اور بچہ

دونوں چھٹپٹاتے نظر آئے تب وہ دوڑتا ہوا بچہ کے قریب پہنچا تھا اور لاٹھی کی ایک زوردار ضرب اس پر پڑی اور وہ کراہتے ہوئے وہیں ڈھیر ہو گیا۔ایک نے اس پر بندوق تانی تو دوسرے نے کہا کیوں گولی برباد کرتا ہے۔یہ بڈھا سالہ ایسے ہی مر جائے گا۔اس کے کانوں میں یہ آخری آواز گئی اور پھر وہ اندھیرے میں ڈوبتا چلا گیا۔ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا۔!

اچانک وہ کسی چیز سے ٹکرایا اور گر پڑا،ٹکرانے والی چیز پر نظر پڑی تو وہ چونک پڑا۔
''ارے یہ تو میرا سریش ہے۔بیٹا سریش،اٹھ بیٹا،دیکھ یہ تیرا باپ سہارا ڈھونڈھ رہا ہے۔کوئی سہارا نہیں دیتا،تیری آنکھیں کھلی ہیں،تو اپنے باپ کو دیکھ رہا ہے،پھر بھی تو......خاموش ہے۔بیٹا تو تو بڑا انجینئر تھا۔تو نے کتنے بڑے بڑے پل بنائے۔ہمیشہ تو نے ترقی اور خوشحالی کے بارے میں سوچا،لیکن ترقی کی یہ کون سی منزل ہے بیٹا؟ تو مجھ سے بحث کرتا تھا' آج جواب کیوں نہیں دیتا؟ لیکن سریش جواب کیسے دیتا وہ تو بلوائیوں کے ہاتھوں ڈیم اور پل بنانے کے لئے ترقی پا چکا تھا اس کی آنکھیں شاید اسی لئے پھٹی پھٹی رہ گئی تھیں کہ اس کارنامے کا یہ انعام ملا ہے بوڑھا اس کے اور قریب گیا اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور اس کی کھولی آنکھوں کو بند کر دیا اور پھر وہ سسک پڑا۔تھوڑی دیر بعد اس کی نظر دور پڑے آٹھ ماہ کے پوتے پر پڑی۔

''بیٹا تیرا کیا قصور تھا۔تو تو امانت تھا ہمارے لئے،سب کے لئے،ابھی پوری طرح دنیا بھی نہیں دیکھی تھی،تجھ سے کسے دشمنی ہوگی کہ تو آج پالنے کے بجائے اس طرح خون میں لت پت گلی میں پڑا ہے۔''بوڑھا اس بچے کے گالوں کو چومتا ہوا آگے بڑھا۔شاید کوئی آنسو پوچھنے والا مل جائے،غم بانٹنے والا،لیکن یہاں تو ہر طرف سناٹے کی حکمرانی تھی۔مکانوں سے اب بھی دھواں آٹھ رہا تھا اور فضا میں انسانی جسم کے جلنے کی بو پھیلی ہوئی تھی۔بوڑھا ابھی دو چار ہی قدم آگے بڑھا تھا کہ اس کی نظروں کے سامنے اس کا پڑوسی جمال کئی حصوں میں بکھرا پڑا تھا۔ارے بیٹا جمال یہ ترے ہاتھ کیوں جسم سے الگ ہیں تیرے ان ہی

ہاتھوں نے تو اس گاؤں میں انقلاب لایا تھا۔ یہاں کے کھیت کھلیانوں کو تو نے ماں کا درجہ دیا۔ بڑا ناز تھا تجھے ان ہاتھوں پر اور ہمیشہ تو ہری کرانتی لانے کی باتیں کرتا تھا۔ یہ تو ہی تو تھا جس کی وجہ کر گاؤں اتنا خوشحال تھا۔ اتنا اناج اتنا غلہ پیدا ہوتا تھا کہ دوسرے گاؤں والے رشک کرتے تھے۔ ہمارا یہ گاؤں تو ہمیشہ مثال کے طور پر پیش کیا جاتا تھا، یہاں کبھی کوئی جھگڑا نہیں کوئی مت بھید نہیں، ہر کوئی ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں کام آتا تھا۔ پھر یہ سب کیوں ہوا، کیسے ہوا...... کئی لاشوں کے درمیان اسے ماسٹر صاحب کی لاش نظر آئی' بوڑھا قریب پہنچا ...... ماسٹر صاحب، درندوں نے آپ کو بھی نہیں چھوڑا، آپ نے تو ہمیشہ میل محبت، پیار، بھائی چارگی، اخوت، یکجہتی کا درس دیا۔ گاؤں کا ایک ایک بچہ آپ کی عزت کرتا تھا۔ ان کے والدین آپ کی پوجا کرتے تھے۔ اس گاؤں میں تعلیم پھیلانے کے لئے آپ نے اپنی زندگی وقف کردی، پھر یہ کس جرم کی سزا آپ کو ملی......

بوڑھا لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھ رہا تھا، اس کے جسم سے خون رس رہا تھا۔ وہ نڈھال ہو رہا تھا اور ویسے بھی گاؤں کا دلدوز اور خوفناک منظر دیکھنے کے بعد اسے جینے کی تمنا کہاں تھی۔ وہ اس لمحے کو کوس رہا تھا، جب ایک نے اس پر بندوق تانی تھی اور دوسرے نے ایک گولی بچانے کے لئے اسے گھٹ گھٹ کر مرنے کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ شاید یہ میرے کسی جنم کے پاپ کی سزا ہے۔ جس گاؤں کو اس نے اپنے خون پسینہ سے سینچا تھا، محنت اور لگن سے پروان چڑھایا تھا، آج اس کی نظروں کے سامنے کھنڈر بنا ہوا تھا، پورا گاؤں جیسے شمشان میں بدل چکا تھا۔ بلوائیوں نے گاؤں کے کسی مکان کو نہیں چھوڑا تھا۔ بوڑھے کو یاد آیا، برسوں قبل زلزلہ کا وہ منظر صرف بیس منٹ کا وہ زلزلہ، قیامت بن کر ٹوٹا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا گاؤں کھنڈر بن گیا تھا۔ لیکن وہ تو قدرت کا جاہ وجلال تھا۔ اور یہاں............ یہاں تو انسانی ہاتھوں نے ایک رات صرف ایک رات میں قدرت کو بھی شرم سار کر دیا تھا۔ ہر بھرا یہ گاؤں ہنستے مسکراتے لوگ لہلہاے کھیت کھلیان، سب کے سب خاک وخون میں ڈوب گئے۔ جس کنویں اور ندی کے میٹھے اور شیتل جل سے لوگ اپنی اور اپنے کھیتوں کی

پیاس بجھاتے تھے، وہ کنویں انسانی لاشوں سے بھر گئے تھے۔ندی کا پانی سرخ ہورہا تھا۔نہ جانے اس نے کتنی لاشوں کو اپنی آغوش میں لے کر وحشی درندوں اور قاتلوں شرم ساری سے بچالیا ہے۔

بوڑھا آگے بڑھتا ہے، برگد کے پیڑ کے قریب خاک وخون میں ڈوبا سر جیت اپنی نیند سو رہا ہے' بوڑھا چونک پڑا۔ارے درندوں نے تجھے بھی نہیں چھوڑا۔بوڑھے کو یاد آیا' سر جیت کل ہی تو لمبی چھٹی پر گاؤں آیا تھا۔فوجیوں کو یوں بھی کم ہی چھٹی ملتی ہے! سر جیت دو سال پر یہاں آیا تھا کتنے فخر سے اپنی بہادری کی کہانی سناتا تھا، کس طرح اس ملک کے دشمنوں کے خلاف مورچہ لیا تھا اور اپنی جواں مردی سے دشمنوں کے دانت کھٹے کر دئے تھے۔جس کے لئے اسے تمغہ بھی ملا تھا۔اور اس تمغے کی لاج بھی غنڈوں نے نہیں رکھی۔ملک کے دشمنوں کو سبق سکھانے والے اس جیالے کو اپنے ہی ملک کے لوگوں کے ہاتھوں ویر گتی پراپت ہوئی۔ سر جیت کے جسم کے زخم گواہی دے رہے تھے کہ اس نے بلوائیوں سے مقابلہ کیا ہے۔لیکن ایک نہتے فوجی کی سینکڑوں درندوں کے سامنے حیثیت ہی کیا رہی ہوگی......

چند ہی قدم کے فاصلے پر ندی کنارے بوڑھے کو امینہ کی لاش نظر آئی، اس کی لاش بتا رہی تھی کہ بلوائیوں نے اس کی حرمت کو بھی پامال کیا ہے۔بہت ممکن ہے سر جیت اسی امینہ کی عزت، عصمت اور جان کی حفاظت کے لئے گاؤں میں گھس آئے غنڈوں سے مقابلہ کیا ہو اور لڑتے لڑتے اپنی جان دے دی ہو۔تو اس کا مطلب ہے سر جیت نے یہاں بھی مورچہ نہیں چھوڑا۔بوڑھے کی زبان سے بے اختیار نکلا۔تو قابل فخر ہے سر جیت۔میں تجھے سلام کرتا ہوں......

بوڑھا اب بالکل نڈھال ہو چکا تھا۔اس کے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔وحشی درندوں نے گاؤں کو بالکل برباد کر دیا تھا۔مکانوں کیساتھ ساتھ آس پاس کے چھوٹے چھوٹے کل، کارخانے، اسکول، لائبریری، اسپتال سب کے سب دھواں اگل رہے تھے۔ دھواں، لاش، انسانی جسم کے جلنے کی بو، کتوں کی بھونک، چیلوں اور گدھوں کی پھڑپھڑاہٹ،

عجیب خوفناک منظر تھا...... بوڑھے کا سر چکرانے لگا۔ وہ ندی کنارے ایک پیڑ کا سہارا لے کر بیٹھ گیا۔ اسے یاد آیا، اس گاؤں میں تو ہر ذات اور ہر مذہب کے لوگ برسہابرس سے رہتے آئے، یہاں کا ہر تہوار چاہے عید ہو، دسہرہ، ہولی ہو، شب برات ہو پورے گاؤں کے لوگ ایک ساتھ مناتے ۔لیکن اچانک یہ سب کیسے ہوگیا؟ سوچتے سوچتے اس کا ذہن ڈوبنے لگا اور وہ ایک پیڑ کے سہارے لیٹ گیا۔ اس کا دل و دماغ مفلوج ہوتا جارہا تھا اور اسے لگ رہا تھا جیسے وہ کسی کنویں میں سماتا جارہا ہے۔ معاً اسے خیال آیا، صبح ہوئے اتنی دیر ہوگئی سورج نکل آیا لیکن ابھی تک مندر سے گھنٹے کی آواز اور نہ مسجد سے اذان کی صدا۔

ایسا پہلے تو کبھی ہوا نہیں، اچانک اس کے ڈوبتے ذہن کے پردے پر گاؤں میں ہر طرف پھیلی آگ، خون، لاش، سرخ ندی اور لاشوں سے بھرا کنواں ابھرا اور اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ کیوں آج مندر اور مسجد کے مینارے خاموش ہیں۔ دھیرے دھیرے اس کا ذہن تاریکیوں ڈوبتا چلا گیا اور چند ساعتوں بعد اس نے آخری ہچکی لی اور اوپر پیڑ پر بیٹھے پرندے پھڑپھڑا کر اڑ گئے۔

آنگن کی بات

آج جب میں ان کی عیادت کو گیا اور انہیں موت کی دعائیں مانگتے سنا تو مجھے ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی حالانکہ یہ وہی وقار احمد تھے جو اپنے تمام ملنے والوں کو زندگی، زندہ دلی کا نام ہے کی تلقین کیا کرتے تھے، یہ وہی وقار احمد تھے جن کے رعب کا یہ عالم تھا کہ...... میری نظروں کے سامنے وقار احمد جنگل کی تاریکیوں میں کسی فقیر کے چراغ کی طرح جھلملانے لگے۔

وقار احمد......ایک باوقار اور بارعب شخصیت جن کے جاگتے ہی صدائیں سو جائیں واکنگ اسٹک لے کر وہ صبح میں سیر کو نکلے تو راستے میں اکثر قمر وارثی اور سیشن جج شوک انصاری سے ملاقات ہو جاتی اور یہ تینوں بغیر موضوع کی تخصیص کے گفتگو کرتے ہوئے دور تک نکل جاتے اور پھر وقار احمد جب گھر پہنچتے تو ناشتے کی میز پر اپنے دونوں بیٹوں امتیاز احمد اور ایاز احمد کو اپنا انتظار کرتے ہوئے پاتے۔ بیگم بھی سہمی سہمی سی منتظر ہوتیں۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھتے ہوئے اپنی مخصوص کرسی کے قریب پہنچتے تو احتراماً امتیاز احمد اور ایاز احمد کھڑے ہو جاتے۔ ناشتہ کے دوران وقار احمد اپنے بیٹوں سے ان کی پڑھائی لکھائی کے متعلق پوچھتے اور ساتھ ہی بیگم صاحبہ کو مختلف قسم کی ہدایتیں بھی دیتے جاتے اور پھر اس کے بعد وہ کورٹ جانے کی تیاری کرنے لگتے۔ اس دوران بیگم صاحبہ خود ہی ان کی ضروری فائلیں درست کرتیں۔ ان کے سوٹ جوتے اور موزے کا جائزہ لیتیں پان بٹہ میں پان رکھتیں......اور اس وقت تک بیگم صاحبہ بے حد مصروف نظر آتیں، جب تک وقار احمد کورٹ روانہ نہ ہو جاتے۔ ان کے روانہ ہوتے ہی کوٹھی میں زندگی کی لہر دوڑنے لگتی......اور پھر......پھر تو ریڈیو گرام بھی بجنے لگتا بیگم صاحبہ کی زبان بھی قینچی کی طرح نوکروں اور دائیوں پر چلنے لگتی......اور اس طرح یہ سلسلہ وقار احمد کی واپسی تک جاری رہتا۔

وقار احمد کی جس جگہ سرکاری کوٹھی تھی اس کے اطراف کے لوگ بھی ان کے رعب اور دبدبہ سے مرعوب تھے لیکن اس کے باوجود آس پاس کے لوگ باگ ان سے ملنے اور صلاح و مشورہ کرنے ضرور آتے۔ بلکہ شام کے وقت ان کا ڈرائنگ روم ان کے دوست واحباب کے ساتھ ساتھ ایسے ہی لوگوں بھرا نظر آتا اور اس طرح وقار احمد کی زندگی سکھ چین اور آرام وسکون کی ٹھنڈی چھاؤں میں گذر رہی تھی۔

وقت دبے پاؤں بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا' یہاں تک کہ وقار احمد کے بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی اور بیگم صاحبہ کی عمر میں بھی کئی برسوں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ اس عرصے میں امتیاز احمد اور ایاز احمد اچھی تعلیم حاصل کر کے ڈاکٹر اور انجینئر بن چکے تھے۔

دونوں بھائی ہر ماہ دو ماہ پر اپنے والد سے ملنے دور شہر سے ضرور آتے لیکن شادی کے بعد آہستہ آہستہ ان دونوں کا آنا کم ہونے لگا بس کبھی کبھی چھٹی میں چلے آتے یا پھر عید میں ......اور بعد وہ بھی بند......بعض اوقات وقار احمد کو اس بات کا صدمہ ضرور ہوتا کہ اس وقت امتیاز احمد اور آیاز احمد میرا سایہ بنے رہے جب میرے بازو مضبوط تھے میں انہیں ہر طرح کا آرام پہنچاتا تھا' لیکن اب جب کہ مجھے ان دونوں کے سہارے کی ضرورت ہے تو یہ دونوں مجھ سے دور ہوتے جارہے ہیں اور یہ احساس انہیں اس دن شدت سے ہوا' جس دن وہ سرکاری نوکری سے ریٹائر ہو گئے اور چند دنوں کے اندر جب ان کے سرکاری فون کی لائن کاٹ دی گئی سرکاری ملازم ہٹا دیئے گئے اور کوٹھی خالی کر دینے کی نوٹس جاری کر دی گئی۔

اس دن وقار احمد کو ہر سمت تاریکی ہی تاریکی نظر آئی، کچھ بھی نہیں کیا اپنے بڑھاپے کے بوجھ کو ڈھونے کے لئے' بینک بیلنس ہے اور نہ مکان ہے۔ ہاں ایک اچھا کام ضرور کیا ہے دونوں بیٹوں کو اعلیٰ تعلیم دلائی ہے انہیں اس قابل بنایا ہے کہ آج وہ......اور یہی خیال ان کی پریشانیوں کے تلاطم میں ٹھہراؤ بن کر ابھرا انہیں اس بات کا یقین تھا کہ ریٹائرمنٹ کی اطلاع پاتے ہی ان کے دونوں بیٹے دہلی اور ناگپور سے آئیں گے اور ہم دونوں کو اپنے اپنے یہاں لے جانے کی ضد کریں گے۔ آخر تو میری اولاد ہیں، لیکن......اس وقت ان کی ساری آس

اور امیدوں کو حقیقت کے ناگ نے ڈس لیا...... جب کئی ماہ گذر جانے کے بعد بھی ان دونوں نے ان دو بوڑھے ماں باپ کی کوئی خبر نہ لی۔ اس لمحہ وقار احمد کو شدت سے اپنا اور اپنی بیگم کا بوڑھا جسم بوجھ محسوس ہوا۔ وقار احمد ہر جانب سے نراش ہو کر اپنی آنکھوں میں لرزتے آنسوؤں کے ساتھ سرکار کی آخری نوٹس کے جواب میں کوٹھی خالی کر کے ایک چھوٹے سے مکان میں منتقل ہو گئے۔

ادھر بیگم صاحبہ کو بھی خاموشی کی بیماری لگ گئی تھی یا پھر وہ اپنی دونوں اولاد اور اپنے گذرے ہوئے وقت اور آج کے وقت کے محاسبہ میں لگی ہوئی تھیں۔ کبھی کبھی ٹھنڈی سانس بھر کر ایک مبہم سا جملہ ادا کر دتیں۔ ''بس قسمت کی بات ہے۔''

بیگم صاحبہ کے اس جملے کو سن کر وقار احمد ان کی جانب غور سے دیکھتے اور ان کے اس جملے کے مفہوم کو سمجھ کر خاموشی سے خلاء میں گھورنے لگتے۔ نہ جانے کیا؟ شاید ماضی اور مستقبل کی ڈوبتی ابھرتی تصویریں انہیں خلاء میں نظر آتی تھیں۔

سال دو سال پر امتیاز احمد اور ایاز احمد کے بچے کسی لمبی چھٹی میں چلے آتے تو وقار احمد اور ان کی بیگم کی باچھیں کھل جاتیں۔ چلو کوئی تو آیا، تنہائی کے اندھیرے کو کم کرنے کے لئے انہیں دیکھ کر وقار احمد بے اختیار پوچھ بیٹھتے۔ امتیاز نہیں آئے......ایاز بھی نہیں آئے......؟

ان کے اس سوال پر بچے کہتے۔ پاپا ان دنوں بہت بزی ہیں اور وقار احمد اس جواب کو سن کر ایک لمبی ''ہوں'' کہہ کر خاموش ہو جاتے۔

امتیاز احمد اور ایاز احمد کو اپنے والدین کا خیال عید کے موقع پر ضرور آتا اور یہ دونوں کسی نہ کسی طرح اپنے ماں باپ کے لئے اس موقع پر کپڑے اور روپے ضرور بھیجواتے، جنہیں دیکھ کر وقار احمد نے ایک بار اپنی بیگم سے کہا تھا۔ ''لو بیگم'' بیٹوں کے یہاں سے نکلا ہوا فطرہ آگیا۔'' اور یہ سن کر بیگم کی آنکھ میں بے اختیار آنسو چھلک پڑے تھے، لیکن عید کے دن یہ دونوں بیٹوں کے یہاں سے آئے ہوئے کپڑے ضرور پہنتے نہ جانے کس خیال کے تحت۔

وقت کے انجان سائے پھیلتے رہے، وقار احمد اور ان کی بیگم کے بالوں کی سفیدی اور کمر کا

خم بڑھتا گیا پنشن کے روپے بس اتنے ملتے کہ چھوٹے سے مکان کا کرایہ اور مہینہ بھر کی بس دو روٹیوں کا انتظام کسی نہ کسی طرح ہو جاتا ہے یوں بھی ریٹائرمنٹ کے بعد سے ان دونوں نے اپنی بہت ساری خواہشوں اور چاہتوں کا گلا گھونٹ دیا تھا لیکن عمر کے اضافہ کے ساتھ ساتھ وقار احمد کی بیماریوں میں بھی اضافہ ہور ہو تھا۔ اس لئے پنشن کا بڑا حصہ ڈاکٹر کی فیس اور دواؤں کے بل پر خرچ ہونے لگا لیکن ان تمام دواؤں کے باوجود وقار احمد کی بیماری کم ہونے بجائے بڑھتی ہی رہی۔ شاید دوائیں بھی اپنا اثر اسی وقت دکھاتی ہیں جب مریض خود اچھا ہونا چاہتا ہے اور وقار احمد کی حالت یہ تھی کہ انہیں زندگی بوجھ معلوم ہو رہی تھی، خودکشی حرام ہے ورنہ......اب تو کمرے کے درودیوار بھی انہیں کھانے کو دوڑتے، شاید اسی لئے وہ کمرے سے نکل کر شکستہ برآمدے کی ایک چارپائی پر ملک الموت کا انتظار کر رہے تھے۔ کبھی کبھی ان کی بند آنکھیں امتیاز احمد اور ایاز احمد کی متلاشی ہوتیں۔ لیکن ان کی تلاش ہر بار ناکام ہو کر ان کے اندر سما جاتی ہے اور پھر وہ آنکھیں بند کر کے زبان کا سہارا لیتے ہیں......کیا وہ دونوں میری قبر پر مٹی دینے بھی نہیں آئیں گے......کیا......؟ بیگم آگے بڑھ کر انہیں خاموش کرنے لگتیں انہیں سمجھاتیں، جھوٹی تسلیاں دیتیں تب کہیں جا کر وہ خاموش ہوتے۔

اس لئے آج جب میں نے انہیں موت کی دعائیں مانگتے سنا تو مجھے کوئی حیرت نہ ہوئی اور میں نے محسوس کیا کہ واقعی وقار احمد کو اب موت کی اندھیری گھپا میں سما جانا چاہئے۔ اس لئے کہ ان کی آنکھوں میں انتظار کی جوت اب بجھنے والی ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ جب انتظار کے چراغ بجھنے لگیں تو پھر زندگی اور موت بے معنی ہو جاتی ہیں اور ابھی جب میں وقار احمد کے قریب سے اٹھنے لگا تو اچانک چپکے سے ایک سوال نے سر ابھارا......''تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔''

لیکن اِسے سمجھتا کون ہے؟ دنیاوی چکاچوندھ میں امتیاز احمد اور ایاز احمد جیسے لوگ اس قدر ڈوب جاتے ہیں کہ اپنی شاندار روایات، تہذیب اور اقدار کو بھی فراموش کر دیتے ہیں۔

سرخ جوڑے

وہ بڑی بے چینی سے جنازے کا انتظار کرتا رہتا۔ کافی تگ و دو کے بعد اس کی لڑکی ثریا کی شادی دو ہزار روپے میں طئے ہوگئی تھی۔ بات تو پانچ ہزار سے شروع ہوئی تھی لیکن دو ہزار تک آتے آتے اسے دو سال لگ گئے اور اس دو سال میں ثریا کی جوانی ڈوبتی ہوئی گلابی شام کی طرح نظر آنے لگی تھی۔ باپ کی پریشانی دیکھ دیکھ کر ثریا کو اپنی جوانی پر بڑا غصہ آتا لیکن وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ اُمڈتی ہوئی گھٹاؤں پر کب کسی کا قابو ہوا ہے۔

دو ہزار روپے کی فراہمی اور وہ بھی صرف چھ ماہ کے اندر۔ دو ہزار کی رقم فراہم نہیں کر لیتا ہے تو اپنے لڑکے کی شادی کسی دوسری جگہ طئے کر دینگے۔ یہ دھمکی بھی رہ رہ کر یاد آتی اور اس خیال سے اس کا دل دھڑکتا رہتا۔ اگر ایسا ہوگیا تو میری ثریا کنواری رہ جائے گی۔

بیٹی کی جوانی بھی والدین کے لئے کتنی اذیت ناک ہوتی ہے۔ جو باپ آرام سے دن بھر میں ایک دو مردوں کو منوں مٹی کے نیچے دبا کر کھاٹ پر پڑا چلم پیتا رہتا۔ اسے اب ہر پل اپنی بیٹی کی خاطر مُردوں کی فکر ستائے رہتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اب اپنا زیادہ تر وقت قبرستان میں ہی گزارتا' تاکہ پیسے کی فراہمی میں غفلت نہ ہو اور جلد از جلد اپنی ثریا کے ہاتھ پیلے کر کے سرخ جوڑے میں ڈولی پر سوار کر دے۔

''سرخ جوڑے میں بیٹی کی رخصتی'' یہ تصور اس بوڑھے شخص کے لئے اتنا پرکیف ہوتا کہ اس کے ہاتھ کا کدال بڑی تیز رفتاری سے مٹی پر چلنے لگتا اور پل بھر میں قبر تیار ہو جاتی۔ مردہ کو وہ منوں مٹی کے نیچے دباتا اور سو روپے لے کر اتنا خوش نظر آتا کہ لگتا جیسے اس کی مٹھی میں کوئی سونے کی چڑیا آ گئی ہو۔

اس کی دعائیں قبول ہوتی رہیں اور مُردوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ ساتھ ہی اس کا

بٹوہ بھی وزنی ہوتا چلا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک ہزار کی رقم اس کے بٹوے میں لال اور ہرے نوٹوں کی شکل میں نظر آنے لگے۔ اسے اب یقین ہوتا جارہا تھا کہ ثریا کے ہاتھ پیلے ہونے میں دیر نہیں ہوگی۔

ادھر ثریا اپنے باپ کی خستہ حالت دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتی رہتی۔ باپ کا سکھ چین، آرام سب ختم ہو چکا تھا۔ دن رات کی فکر سے اس کی آنکھیں اندر دھنسی جارہی تھیں اور چہرے پر جھریوں کا جال سا پھیل گیا تھا۔

ثریا کی فکر مند آنکھیں کہتیں......یا خدا! یہ کیا ہوگیا ہے میرے بابا کو؟ یہ ساری پریشانی صرف میری وجہ سے ہے اور اس کی ذمّہ دار میں ہوں۔ کیا واقعی آج کا بھاگتا پھلانگتا سماج بھی اس دور میں داخل ہونے والا ہے جب لڑکیوں کی پیدائش مصیبت اور پریشانی کا سبب ہوتی تھی۔ کاش! میں سماج کے ان ٹھیکہ داروں سے پوچھ سکتی کہ اپنی تجوریوں کو بھرنے کی خاطر آج سارے معاشرے کو اپنی گندی ذہنیت کے سبب پراگندہ کیوں کررہے ہو اور معمولی سا معمولی لڑکا بھی صرف اپنی شادی کے سلسلے میں اپنی اہمیت کیوں سمجھنے لگا ہے اور ہزار دس ہزار تک اپنی قیمت کیوں لگاتا ہے۔ بغیر سوچے سمجھے کہ ایک دن وہ بھی کسی لڑکی کا باپ بنے گا اور اسے بھی ایک دن ایسے وقت سے گزرنا ہے......کاش......کاش......

یہ ساری باتیں ثریا کے ذہن پر ہتھوڑے کی طرح برستی رہتیں۔ باپ کا لاغر جسم اور فکر مند آنکھیں دیکھ دیکھ کر وہ غم میں گھلتی رہتی۔ اس کے چہرے کی رونق پھیکی پڑتی جارہی تھی۔ شادی کی خبر سن کر بھی اس کے چہرے پر شادابی اور سرخی کا پرتو نہیں جھلکتا۔

ادھر کئی دنوں سے وہ خود بھی بخار اور کھانسی میں مبتلا تھی اور خود کو اندر سے ٹوٹی ہوئی محسوس کرنے لگی تھی اسے لگ رہا تھا شاید وہ کسی مہلک مرض کی شکار ہو کر......لیکن مزید پریشانی نہ بڑھانے کے خیال سے اس نے اپنے باپ سے اس کا ذکر نہیں کیا' بلکہ صرف اپنے باپ کی زندگی اور صحت کے لئے دعائیں کرتی رہی۔

لیکن ثریا کا باپ اپنی صحت اور بیمار بیٹی کی فکر مند آنکھوں سے بے نیاز صرف جنازے

کے انتظار میں قبرستان کے چکر لگاتا رہتا...... "یا خدا! جلدی جلدی بھیج مُردے کو تا کہ میری آمدنی میں اضافہ ہو اور پھر میری بیٹی سہاگن بنے، سرخ جوڑے میں اسے رخصت کروں کہ اس کے خواب سچ ہوں۔ اس کے جذبات حقیقت کا روپ دھار سکیں، بس یہی میری آخری تمنا ہے میرے معبود، میری اس خواہش اس آرزو کو تو پورا کر دے...... پھر تو میری کوئی تمنا نہیں ہوگی۔ ایک بوڑھے کی آرزو ہو بھی کیا سکتی ہے؟"

روپے کی فراہمی میں وہ اس حد تک لگ گیا تھا کہ اسے گھر کی بھی فکر نہیں رہی تھی۔ قبرستان کو ہی اپنی بیٹی کی منزل مان کر لو لگائے ہوئے تھا۔ ایک شب اسے خیال آیا کہ وہ دو ہزار کی رقم جمع کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی وہ اپنی میلی اور بوسیدہ سی لنگی سے ایک بٹوہ نکال کر روپے گننے لگا، جیسے جیسے وہ روپے گنتا جاتا اس کی آنکھوں کی چمک میں اضافہ ہوتا جاتا اور چہرے کا پیلا پن سرخی میں تبدیل ہوتا رہا...... ایک ہزار چار سو...... ساڑھے چار سو...... چالیس...... اور...... پھر دفعتاً وہ اچھل پڑا پانچ سو روپے یہ تو میں آج ہی پورے کرلوں گا...... اور...... اور پھر...... سرخ جوڑے میں رخصت ہوگی میری ثریا۔ اس کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔

اسے یقین تھا کہ آج وہ سویرے ہی پانچ سو روپے سے زیادہ کمائے گا اور اس طرح اس کے پاس دو ہزار کی رقم پوری ہو جائے گی اور پھر وہ دوڑتا ہوا اپنے سمدھیانے جائے گا اور دو ہزار دے کر شادی کی تاریخ پکی کر آئے گا۔ یہ سوچ کر وہ سویرا ہونے سے قبل ہی قبرستان کے مین گیٹ پر بیٹھ گیا اور انتظار کرنے لگا کہ جیسے ہی کوئی جنازہ آئے وہ جلد سے جلد نپٹا کر سمدھیانے چلا جائے...... اور...... اور...... وقت گزرتا رہا۔ سورج اوپر اٹھنے لگا لیکن اب تک کوئی نہیں آیا تھا وہ سوچنے لگا اتنی بھی جلدی کیا ہے، آج کل شہر کے لوگ مُردے کو قبرستان تک پہنچانے کے لئے بھی صبح سویرے نہیں جاگتے۔ اس لئے انتظار کرنا ہوگا۔ جنازہ تو آئے گا ہی۔ ایسا کبھی ہوا نہیں کہ کسی دن کوئی مرا نہ ہو...... لیکن دیر کیوں ہو رہی ہے...... یا خدا آج کیا بات ہے اتنی دیر ہو گئی اب تک کوئی مردہ نہیں آیا...... صرف ایک مردہ...... صرف ایک......"

جس تیزی سے وہ دعائیں کر رہا تھا اسی تیزی سے وقت بھاگتا رہا۔ صبح سے دوپہر ہوگئی اور دوپہر سے شام...... بوڑھے کی امید پر اوس پڑنے لگی۔ اب آہستہ آہستہ وہ مایوس ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن آشاؤں کے دیپ نے اب تک دم نہیں توڑا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ قبرستان میں بھوکا پیاسا صرف ایک مردے کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔

ابھی وہ امید اور نا امیدی کے لمحات سے گزر رہا تھا کہ اسے آتے ہوئے کچھ لوگوں کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ نظریں اٹھا کر باہر کی جانب دیکھا اور دیکھ کر بے اختیار ''خدایا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے'' کی صدا لگاتا ہوا کھڑا ہوگیا۔

شام کے اجالے نے دم توڑ دیا تھا اور رات کی سیاہ چڑیل اپنا منحوس چہرہ لئے پورے قبرستان پر مسلط تھی۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں اس نے ایک شخص کو پہچانا جو اس کا پڑوسی تھا۔ وہ حیرت میں پڑ گیا۔ اپنے ہی محلے میں موت ہوگئی اور اسے خبر تک نہ ہوئی، لیکن خبر ہوتی بھی کیسے...... اوہ میں سب کیوں سوچ رہا ہوں۔ مجھے کیا، مجھے تو ایک جنازہ سے مطلب ہے ،اب وہ آگیا ہے۔ اب میری مراد پوری ہو جائے گی، اب ضرور میری ثریا سرخ جوڑے میں رخصت ہوگی، لیکن یہ محلے کا کون شخص ہے...... اونہہ مجھے کسی کے مرنے جینے سے کوئی مطلب نہیں...... لیکن اسکا دل نہیں مانا اور وہ بے اختیار اپنے ایک پڑوسی کا ہاتھ پکڑ کر پوچھ بیٹھا....

''ارے شمو!! یہ آج محلّے میں کون مر گیا ہے؟''

جواب میں شمو نے جو بات بتائی اُسے سن کر بوڑھے نے ''نہیں'' کہہ کر ایک دلدوز چیخ ماری۔ اس کی چیخ اتنی دلخراش اور دل دوز تھی کہ وہاں پر موجود لوگ کانپ اٹھے۔

......اور دوسرے دن، بوڑھا اپنی بیٹی ثریا کے لئے قبر کھود رہا تھا۔

اپنی عدالت

گرمی قہر ڈھا رہی تھی۔ صبح کے نو بجتے ہی ہر طرف گرم ہوا کے تیز جھکڑ چلنے لگتے اور دوپہر ہوتے ہوتے لگتا جیسے سورج بس سوا نیزے پر آ گیا ہے۔

لیکن شہر سے صرف پچیس کیلومیٹر دور چٹیل میدان سے تھوڑا ہٹ کر تیس چالیس جھونپڑیوں کے گاؤں رام نگر کے لوگوں کو دیکھ کر ایسا لگتا، جیسے ان پر گرمی اور لُو کا کوئی اثر نہیں۔ صبح سے شام تک وہ لوگ بالکل عام دنوں کی طرح اپنے کام میں مشغول رہتے۔ دراصل غربت اور مفلسی نے ان کے جسم کی چمڑی کو اتنی موٹی بنا دیا تھا کہ ان پر گرم سرد کا احساس ہی جاتا رہا، احساس رہتا تو صرف پیٹ کا وہ کیسے بھرے۔

اس گاؤں کی عورتیں اور مرد صبح ہوتے ہی اپنے اپنے کام پر نکل جاتے۔ ان کے اپنے گاؤں میں کام کے مواقع کم تھے لیکن اس گاؤں سے دوکوس دوری پر ایک بڑا گاؤں ... نگر تھا جہاں بسے بڑے لوگوں کی وجہ کر انہیں کام کی کمی نہیں ہوتی۔ ان لوگوں کی روزی روٹی کا مرکز یہی گاؤں تھا۔ صبح ہوتے ہی رام نگر کے علاوہ آس پاس کے کئی گاؤں کی غربت زدہ عورتیں اور مرد یہاں پہنچ جاتے اور ٹھاکر نریش سنگھ اور دوسرے کئی بڑے کسانوں کے کھیتوں کھلیانوں اور گھروں کے کام پر جٹ جاتے، جنہیں ٹھاکر کے یہاں کام نہ ملتا، وہ کسی گھر کا چھپر چھاتے، جوتے چپل مرمت کرتے، گائے بھینس چراتے اور ان کے بچے ننگ دھڑنگ گاؤں کے ارد گرد لکڑیاں چننے، سور چرانے اور کھیل کود میں مشغول رہتے۔ یہی ان کی دنیا تھی۔ سورج کی تپش سے ان کے چہرے کالے اور سیاہ ہو چکے تھے، گاؤں میں اسی طرح گھومتے، کھیلتے کودتے یہ بچے بڑے ہوتے اور پھر اپنے باپ دادا کے قدموں کے نشان پر چلنے لگتے۔

ان ہی لوگوں میں ایک راگھو رام تھا۔ اس کی عمر زیادہ سے زیادہ چالیس کی ہوگی۔ لیکن

مفلسی اور غربت نے اس کے چہرے اور جسم پر اس طرح سایہ ڈال رکھا تھا کہ وہ پچپن ساٹھ کا بوڑھا نظر آنے لگا۔ چھوٹی عمر کی شادی کے رواج نے اسے جلد ہی ایک بیٹی کا باپ بنا دیا جو گاؤں کے دوسرے بچوں، بچیوں کے ساتھ گاؤں کے اندر کھیلتی کودتی جوان ہوگئی...... کہا جاتا ہے کہ جوانی میں کتیا بھی اچھی لگتی ہے اور وہ تو ایک نوخیز دوشیزہ تھی، اس نے عمر کے چودھویں زینے پر قدم ہی رکھا تھا کہ اس کے انگ انگ سے حسن وشباب پھوٹنے لگا۔ راگھو کی جورو تیا کی طرح اس کے چہرے کے بھی نقوش بڑے تیکھے تھے۔ سانولے سلونے چہرے پر جوانی اور کھلتے شباب نے اسے اس گاؤں کی حسینہ بنا دیا تھا، اس کا صاف رنگ تو دھیرے دھیرے تیز دھوپ اور گاؤں کی گرد وغبار میں جل گیا لیکن چہرے کی خوبصورت بناوٹ اور اس پر قیامت کی جوانی...... پورے گاؤں کے نوجوانوں کی وہ مرکز بن گئی تھی۔

سندری ایک طرف جہاں پورے گاؤں کے نوجوانوں کے دلوں کی دھڑکن بنی ہوئی تھی دوسری طرف اپنی مائی اور باپو کیلئے مصیبت اور پریشانی کی باعث تھی۔ ان دونوں کو...... ہر لمحہ، ہر پل یہی فکر ستائے رہتی کہ کیسے جلد سے جلد سندری کے ہاتھ پیلے کردئے جائیں۔

راگھو کی نگاہ میں اسی گاؤں کے سادھو رام کا بیٹا ٹھک تھا جو اس کی بیٹی کے لئے اچھا جوڑا ثابت ہوتا، ٹھک ایک تیز طرار نوجوان تھا، راگھو نے اکثر ناتھ نگر کے ٹھاکر صاحب کے یہاں اسے تیز آواز میں بولتے سنا تھا، اور اس کی اسی ادا سے وہ بے حد متاثر تھا۔ ٹھاکر صاحب کے سامنے تیز آواز میں بولنا بڑی ہمت اور جرأت کا کام تھا۔ اس لئے راگھو کو یقین تھا کہ وہ اس کی بیٹی کو اچھی طرح اپنی جورو بنا کر رکھ سکتا ہے۔

راگھو نے ایک دن سادھو رام سے شادی کی بات چلائی، تو اسے ایسا لگا جیسے وہ لوگ پہلے ہی سے تیار بیٹھے تھے، جہیز کے نام پر ایک کھٹیا اور پانچ سو روپئے طے ہوگئے۔ شادی کی تاریخ اگلے لگن میں ٹھاکر صاحب کی فصل کٹنے اور پیسے واناج ملنے کے بعد رکھی جائے گی۔

سندری کی شادی کی بات جس دن طے کر کے راگھو اپنی جھونپڑی میں آیا، اس دن اسے بڑا اطمینان سا لگا ایسا لگا، جیسے سینے پر سے ایک بڑا بوجھ ہٹ گیا ہو۔ سندری کی مائی کو اس نے

جب شادی طئے ہو جانے کی بات بتائی تو وہ بھی خوشی سے کھل اٹھی۔ بہت دنوں بعد اس کی ویران آنکھوں میں چمک اور سوکھے ہونٹوں پر مسکراہٹ تیر رہی تھی، وہ اسی دن سے سندری کے بیاہ کی تیاری میں لگ گئی۔

سندری کو بیاہنے کے لئے راگھو کو پانچ سو روپے بھی جمع کرنے تھے، اس لئے وہ ٹھاکر صاحب کے کھیت میں زیادہ دیر تک کام کرنے لگا، تاکہ پیسے زیادہ ملیں، لیکن کمزور جسم زیادہ بوجھ برداشت نہ کرسکا اور ایک دن وہ کام کر کے لوٹا، تو اس کا بدن جل رہا تھا، اس کی بیوی نے اس کا اداس اور بجھا چہرہ دیکھا تو پوچھ بیٹھی۔

''کا بات ہے آج تو بڑا است ہا۔''

''ناکچھو نا، تنی ماتھا میں درد ہے۔'' راگھو نے نقاہت بھرے لہجہ میں جواب دیا، اور جھونپڑی کے اندر، زمین پر پڑے ایک کھیندڑا (دری) پر لیٹ گیا۔ تمیا نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو چونک پڑی، اسے تیز بخار تھا۔

''ارے تو را تو تیج جُور (بخار) ہے۔ تمیا گھبرا کر بولی اور جلدی سے وہ راگھو کے چہرہ اور سر کو پانی سے دھونے لگی اور سندری کو بغل کے جھونپڑے سے بکری کا دودھ لانے کو بھیجا، سندری بھاگتی ہوئی دودھ لے آئی اور راگھو کے ماتھے اور تلوے پر دیر تک دودھ ملتی رہی۔ راگھو کو آرام ملا تو وہ سو گیا۔

دوسری صبح راگھو سوکر اٹھا تو خود کو بہتر محسوس کیا، لیکن کمزوری بہت تھی، اس لئے کام پر جانا مناسب نہیں سمجھا۔ اس کی بیوی اور بیٹی نے بھی اسے آرام کا مشورہ دیا۔

راگھو نے ناشتہ میں روٹی اور پیاز کھا کر اپنی چلم سلگائی اور پہلا ہی کش لیا تھا کہ جھونپڑی کے باہر سے کئی لوگوں کے بولنے کی آواز آئی، کوئی اسے پکار رہا تھا، نقاہت کی وجہ کر وہ اُٹھ نہ سکا اور اس نے سندری کو باہر دیکھنے کو کہا۔

سندری باہر گئی تو دیکھا ٹھاکر نریش سنگھ کے بیٹا رمیش سنگھ کے ساتھ کئی لوگ کھڑے ہیں۔ چونکہ اکثر وہ بچپن میں اپنے باپو کے ساتھ اس کے یہاں جاتی تھی اس لئے ٹھاکر رمیش

کو پہچانتے ہی اس نے بڑی ملائمیت سے پوچھا۔

''کا بات ہے؟''

نریش نے غور سے سندری کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا، اس نے اپنے بائیں بازو میں کھڑے اپنے آدمی کو آنکھ ماری اور بولا۔

''کہاں ہے راگھو، بابو جی اسے بلائے ہیں۔''

''باپو کے کل سے جور (بخار) ہے، اور آج کام پر نہ جائب۔'' سندری نے بڑے نرم لہجہ میں جواب دیا۔

''اچھا ٹھیک ہو جائے تو بھیج دیہا۔'' نریش یہ کہتا ہوا واپسی کے لئے مڑا اور اپنے لوگوں کے ساتھ چل دیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک اور ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

اس کے آنے کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ بچپن میں اس نے سندری کو کئی بار دیکھا تھا لیکن جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے کے بعد اس کا ناتھ نگر آنا بند ہو گیا تھا۔ وہ واقعی آج اسے قیامت لگی۔ اس کی جوانی اور حسن کا چرچا ہی اسے آج یہاں تک لے آیا تھا، ورنہ کسی غریب کی جھونپڑی کے قریب ایسے مالکوں کا جانا بھی کسر شان تھی۔

سندری نے جھونپڑی کے اندر جا کر اپنے باپو کو بتایا کہ مالک کے لڑکے اپنے آدمیوں کے ساتھ اسے بلانے آئے تھے، کہہ دیا کہ تمہیں تیز جور ہے اور تم آج کام پر نہیں جاؤ گے۔ ٹھاکر مہیش کے آنے پر اسے پل بھر کو حیرت ہوئی لیکن اس نے اپنے ذہن کو جھٹک کر اپنا چلم پھر اٹھالیا۔ وہ کش پر کش لگانے لگا۔ چلم کی چنگاری تیز ہوئی اور پھر صرف راکھ رہ گئی۔

اس دن اس نے بڑے آرام سے گھر میں وقت گذارا۔ بہت دنوں بعد اسے آج گھر میں رہنے کا موقع ملا تھا، جو اسے بڑا اچھا لگا...... تیا دوسرے گاؤں سے کسی کی مری ہوئی مرغی لے آئی تھی، جسے اس نے بڑے اہتمام سے پکایا اور پھر تینوں نے ایک ساتھ سیر ہو کر مرغی کا گوشت اور روٹی کھائی اور معمول کے مطابق چلم پیتے اور گپ شپ کرتے ہوئے تینوں

سو گئے۔

رات کا ابھی پہلا پہر بیتا ہو گا کہ اچانک کسی آواز سے راگھو کی نیند ٹوٹ گئی، ٹمٹماتی ڈھبری کی روشنی میں اس نے اپنا سر گھما کر دیکھا تو حیرت زدہ رہ گیا۔

''ای کا۔؟ اس کی زبان سے بے اختیار نکلا اور اس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔

اس کی جھونپڑی کی ٹٹی (دروازہ) ہٹا کر چار آدمی اس کی جھونپڑی کے اندر کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں تیز چمکتے ہوئے ہتھیار تھے۔ ان میں سے تین آدمیوں نے ان دونوں میاں بیوی کو جکڑ لیا۔ ان کی چیخ سن کر پاس ہی سوئی سندری بھی گھبرا کر اُٹھ بیٹھی اور اس نے بھی جو منظر دیکھا۔ اسے دیکھ کر پہلے تو وہ بہت گھبرائی۔ لیکن جلد ہی اس کے ہوش و حواس قابو میں آ گئے، اور وہ چیختی ہوئی گالیاں بکتی ہوئی ان تینوں پر ٹوٹ پڑنے کے لئے بڑھی کہ اچانک ایک چوتھے آدمی نے بڑی تیزی سے اسے دبوچ لیا اور بولا۔

''ادھر کہاں جا رہی ہے میری جان، ادھر آ جا۔''

آواز سن کر سندری کے ساتھ ساتھ اس کی مائی اور باپو چونک اُٹھے اور خوف و دہشت سے کانپ گئے۔

''ارے مالک یہ تو ہا۔'' بے اختیار تینوں کی زبان سے نکلا، تینوں حیرت میں پڑ گئے کہ مالک ٹھاکر نریش سنگھ کا لڑکا رمیش سنگھ ایسی حرکت کیوں کر رہا ہے۔ لیکن تینوں کو زیادہ سوچنے کا موقع نہیں ملا اور تینوں کے منہ پر پوری طاقت سے کپڑے باندھ دئے گئے۔ تینوں کی آواز اندر ہی اندر گھٹ کر رہ گئی۔ راگھو کو دو آدمیوں نے رسیوں سے جکڑ دیا اور تیسرے نے منیا کو قابو میں کر لیا اور پھر رمیش نے بڑے اطمینان سے سندری کو اپنی بانہوں میں اُٹھا لیا۔

سندری نے اس درندہ سے خود کو چھڑانے کے لئے اپنی پوری طاقت لگا دی، بڑی مزاحمت کی لیکن اسے کامیابی نہیں ملی اور وہ کسی باز کے چنگل میں جکڑے پرندے کی مانند پھڑ پھڑاتی رہ گئی۔ اس نے چلانے کی بھی کوشش کی لیکن اس کے منہ پر کپڑا بندھا تھا۔ سندری کے ساتھ

ساتھ راگھو اور تمیا کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ چاروں کس مقصد سے یہاں آئے ہیں۔ ان کی نظروں کے سامنے سے رمیش، سندری کو اپنی بانہوں میں بھرے اٹھائے لئے جا رہا تھا اور اسکے ماں باپ کی چیخیں اندر ہی اندر دم توڑتی رہیں۔ رمیش سندری کو اٹھائے جھونپڑی کے دوسرے حصہ میں لے گیا اور وہاں سے دیر تک اُٹھا پٹک، کراہ، سسکی، مزاحمت کی آوازیں اُبھرتی رہیں اور کچھ ہی دیر بعد سندری کی چیخ سن کر تمیا اور راگھو تڑپ اُٹھے۔ ان دونوں نے بے قابو ہو کر اٹھنا چاہا، لیکن ان دونوں پر تین آدمیوں کی گرفت بڑی مضبوط تھی۔

تھوڑی دیر بعد رمیش جھونپڑی کی دوسری جانب سے نمودار ہوا اور اس نے اپنے تینوں آدمیوں کو چلنے کا اشارہ کیا اور اشارہ پاتے ہی وہ تینوں ان دونوں کو اسی حالت میں چھوڑ کر رمیش کے پیچھے پیچھے جھونپڑی سے باہر نکل گئے۔ جاتے جاتے رمیش نے راگھو سے دھمکی بھرے انداز میں کہا۔

”سن لے راگھو، ای بات، بگر وسے (کسی سے) جکر (ذکر) کرے تو 'تو سمجھ لیبے۔"
رمیش کی دھمکی کا جواب راگھو دیتا بھی تو کیسے، وہ تو ہر طرف سے جکڑا ہوا تھا۔ راگھو نے رمیش کے ساتھ آئے ان تین آدمیوں کو بھی ڈھبری کی روشنی میں اچھی طرح پہچان لیا تھا۔ دھیرو، جے سنگھ اور گووندا کو وہ اکثر مالک گھر پر دیکھتا تھا۔

ان چاروں کے جاتے ہی تمیا نے رسیوں سے جکڑے راگھو کے ہاتھ پاؤں کھولے۔ اپنے اور اس کے منہ پر سے کپڑے نوچے اور دونوں بھاگتے ہوئے سندری کے قریب پہنچے اور یہ دیکھ کر ان کا دل دھک سے کر گیا کہ ان کی بیٹی اپنی عزت اور عصمت گنوا کر بے ہوش پڑی تھی۔ دونوں نے پانی کا چھینٹا مار کر سندری کو ہوش میں لایا اور وہ ہوش میں آتے ہی اپنے باپو اور اپنی مائی سے لپٹ گئی اور سسک سسک کر رو پڑی۔ راگھو اور تمیا بھی اپنی بے بسی پر اس کے ساتھ مل کر آنسو بہانے لگے۔

کئی دنوں تک تینوں کے آنسو بہتے رہے اور بے عزتی کا درد اندر ہی اندر جھیلتے رہے اور تینوں ایک دوسرے سے آنکھیں چراتے رہے۔

راگھو کے سارے ارمان، ساری خوشی ریت کے گھروندے کی مانند ٹوٹتے نظر آئے۔ اس نے اس حادثے کا ذکر اپنے گاؤں والوں سے اسی دن کرنا چاہا تھا، لیکن بیوی نے اسے عقل دی کہ اگر گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی تو سندری کی شادی میں دقت ہوگی اور پھر رمیش کی دھمکی بھرے الفاظ...... وقتی طور پر راگھو کی سمجھ میں یہ بات آ گئی، لیکن ذلت اور رسوائیوں کا وہ لمحہ، اپنی بیٹی کا اداس، بجھا بجھا اور غمگین چہرہ۔ اس کی آنکھیں' کچھ نہ کہہ کر بھی بہت کچھ کہہ رہی تھیں...... یہ سب راگھو کے گلے کا پھانس بن گیا تھا اور ایک دن اس نے اپنے ایک بہت قریبی دوست بھگت رام سے سارا واقعہ رو رو کر سنا دیا...... بھگت رام پورا قصہ سن کر آگ بگولہ ہو گیا، اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں، آنکھوں میں انگارے دہکنے لگے اور بول اٹھا......

''ہم گریب لوگ کے عجت نہ ہے کا، کچھ نہ کچھ کرے کے چاہی......''

یہ کہہ کر اس نے سرگوشیوں میں پولیس کو اطلاع دینے کا مشورہ دیا اور وہ دونوں اسی وقت گاؤں سے ایک کوس پچھم کی جانب واقع تھانہ کی جانب چل پڑے۔

گھنٹہ بھر پیدل چلنے کے بعد دونوں تھک کر چور تھانہ پہنچے اور راگھو نے تھانیدار سے رو رو کر اپنی بیٹی کی عصمت دری کی داستان سنائی اور راگھو نے جب ناتھ نگر کے ٹھاکر نریش سنگھ کے بیٹے رمیش سنگھ کا نام لیا تو تھانیدار چونک پڑا اور جلدی سے راگھو کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ اچھا اچھا ٹھیک ہے، تو جا کر اپنی بیٹی کو لے آ، اس کا بھی بیان ضروری ہے۔''

''تھانیدار کی بات سن کر راگھو اور بھگت نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا، دونوں کو بات ٹھیک ہی لگی دراصل ظلم اور بے عزتی کی شکار تو سندری ہی ہوئی ہے، اس لئے اس کے بیان کی اہمیت ہوگی۔ اور وہ دونوں بھاگتے ہوئے اپنے گاؤں پہنچے اور سندری اور اس کی ماں کو بہت سمجھا بجھا کر تھانہ چلنے پر رضامند کیا اور وہ چاروں جب تھکے ہارے پسینے سے شرابور تھانہ پہنچے تو قہر ڈھاتا سورج تھک کر چھپنے لگا تھا۔

تھانیدار نے چاروں کو بہت غور سے دیکھا اور اس کی نظر سندری پر جم گئی۔ بوسیدہ اور گندے شلوار، جمپر کے اندر سے اس کا شباب جھانک رہا تھا۔ غموں سے نڈھال اور دھوپ

کی تمازت نے سندری کے چہرہ کو پژمردہ کر دیا تھا، لیکن اس کے انگ انگ سے جھانکتی جوانی تھانیدار کے سامنے قیامت ڈھا رہی تھی۔

کئی منٹ تک وہ اسے غور سے دیکھتا رہا اور پھر بولا......

''تو، تورا ساتھ جیادتی ہوا ہے، کیسے کیسے ہوا، بتاؤ۔''

تھانیدار کی بات سن کر سندری ڈبڈبائی آنکھوں اور رندھے گلے سے، اپنے اوپر ہونے والے ظلم و زیادتی اور آبروریزی کی داستان تفصیل سے سُنانے لگی۔

پوری تفصیل سننے کے بعد تھانیدار نے اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔

''دیکھو، ای سب تو ہر جمانہ میں ہوا ہے، تم لوگوں کو ٹھاکر صاحب کے کھلاپھ شکایت لکھا کر کوئی پھائدہ نہیں ہوگا۔ اب تو عجت واپس ملے گی نہیں، اس لئے اچھا ہوگا اگر تم لوگ کچھ روپیہ پیسہ لے دے کر معاملہ رپھع دپھع کر دو۔ ویسے بھی تم لوگ ٹھاکر صاحب کے رعب اور پیسہ کے سامنے ٹکو گے نہیں۔''

تھانیدار کی پوری بات سُن کر ان چاروں کے گھبرائے اور پریشان حال چہرے زرد پڑ گئے۔ وہ لوگ تو انصاف مانگنے اور ظالموں کو سزا دلوانے آئے تھے لیکن تھانیدار تو دوسری ہی بات کر رہا ہے۔

چاروں نے ایک دوسرے کو آنکھوں میں دیکھا اور تھانیدار کی نیت کو سمجھتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور واپسی کے لئے دروازے کی جانب بڑھنے لگے۔

تھانیدار نے انہیں واپس جاتے ہوئے دیکھا تو پوچھا۔

''تو تم لوگوں کا کا پھیصلہ ہے۔؟''

''ہم گھر جا کر سوچب (سوچیں گے)''

یہ کہتا ہوا راگھو دروازے کی جانب مڑ گیا۔ اس کے پیچھے تیا، سندری اور بھگت بھی تھے جاتے جاتے تھانیدار کی آواز گونجی۔

''ارے سنو تو ۔شام ہوگئی ہے تم سب لوگوں کا گاؤں پہنچتے پہنچتے رات ہو جائے گی ۔ جمانہ ٹھیک نہیں ہے۔اس لئے تم لوگ رات میں یہیں رُک جاؤ۔''

راگھو نے مڑ کر تھانیدار کو دیکھا۔اس کی نگاہیں سندری کے جسم کو ٹٹول رہی تھیں ۔اس ہمدردی کے پیچھے چھپے مطلب کو سمجھتے ہوئے راگھو نے جواب دیا۔

''نہ ہم نی رات ہووے سے پہلے ہی گاؤں پہنچ جاب۔''

تھانیدار راگھو کا جواب سن کر خاموش ہوگیا اور ان کو اداس نظروں سے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔پاس کھڑے کئی سپاہی تھانیدار کو دیکھ کر مسکرا اٹھے۔

وہ چاروں تیز قدموں سے گاؤں کی طرف بڑھنے لگے۔لیکن ان چاروں کے دل ودماغ میں طرح طرح کے خیالات ڈوب ابھر رہے تھے۔

وہ سب ایک میل کا فاصلہ طئے کر کے جیسے ہی ایک پگڈنڈی پر مڑے،دوسری پگڈنڈی پر دوسرے گاؤں سے آتے ہوئے ان کی جان پہچان والے ڈومر پاسبان سے ملاقات ہوگئی۔ اس نے ان چاروں کے اداس اور بے جان چہرے کو حیرت سے دیکھا۔

کا بات ہے،راگھو بھیا،کونو پریسانی کے بات ہے کا،کہاں سے تو سب آوتا۔''

راگھو نے چند لمحے سوچا کہ اسے ساری بات بتائی جائے یا نہیں ۔وہ ڈومر کو اچھی طرح جانتا تھا،وہ لوگوں کے دکھ سکھ میں برابر کام آتا اور وہ کردار کا بھی اچھا آدمی تھا-یہ سوچ کر اس نے اپنے سینے کے بوجھ کو مزید کم کرنے کے لئے اسے اپنی پوری کہانی سنائی اور آخر میں اس نے یہ بھی بتادیا کہ تھانیدار سے کسی انصاف کی اسے امید نہیں ہے۔

ڈومر کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر بڑے گمبھیر انداز میں بولا۔

''اگر ہمرا پر (ہمارے پر) وسواس کرا،تو کل صبح ہمرے گھر آ جیہا۔ای سب کے لے کے تورا'ہم ایک جگہ لے جائب۔کل رویوار ہے،او جگہ کچہری لگی۔''

''کچہری؟''

راگھو اور بھگت نے تعجب سے پوچھا۔

''ہاں، بھیا، تو سب جانانہ ہا کا، او جگہ انصا پھ جرور ملی اولوگن ہم گریب لوگن پر ہووے والے اتیاچار کے کھلا پھ لڑت ہیں، اولوگ جو پھیصلہ کرہی ہیں، اوا یکدم ہوجائی ۔ رام کھلاون سنگھ کے چھا نچ چھوٹا او بے لوگ نہ کرلئی، تو سب ڈرامت ۔ کونو گھبرائے کے بات نہ ہے، تو سب کل صبح ہمرے پاس جرور آجیہا۔''

یہ کہتا ہوا، وہ اٹھ کھڑا ہوا اور ان سب کو پرنام کہتا ہوا اپنے گاؤں کی جانب چل دیا۔

وہ چاروں بھی اپنے گاؤں کی جانب جانے والی پگڈنڈی پر تیز قدموں سے چلنے لگے۔ گھر پہنچ کر ان چاروں نے کافی سوچ وچار کیا اور فیصلہ کیا کہ اگر انہیں ظلم، زیادتی اور بے عزتی کا بدلہ لینا ہے تو کچہری جانا ہوگا۔

یہ فیصلہ کر کے بھگت اپنی جھونپڑی میں چلا گیا اور راگھو، تنیا اور سندری کھانا کھا کر سو گئے۔ راگھو کو نیند کی دیوی نے اپنی آغوش میں لے لیا، تو وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی خواب میں ڈوب گیا۔ خواب ہی ان غریبوں کے جینے کا سہارا ہوتے ہیں۔ آج بھی خواب میں اسے اپنی بیٹی کی بے بس چیخ وپکار سنائی دینے لگی، لیکن پھر جلدی ہی اس کے خواب کا منظر بدلا اور اس نے دیکھا کہ رمیش سنگھ کے ساتھ ساتھ اس کے تینوں ظالم ساتھی بھی پھانسی کے پھندے میں جھول رہے ہیں اور رو رو کر گڑ گڑا کر اس سے رحم کی بھیک مانگ رہے ہیں اور اس سے جیون دان کی التجا کر رہے ہیں اور وہ ان پر بھرپور قہقہہ لگا رہا ہے اور......اور......

اس کی نیند سویرے ہی ٹوٹ گئی۔ اس نے تنیا اور سندری کو آواز دی اور پھر تینوں تیار ہو کر بھگت رام کو لے کر ڈومر کے گاؤں کی جانب چل دیئے۔

ڈومر ان کا انتظار کر رہا تھا، وہ بھی ان کے ساتھ ہولیا اور تقریباً ڈھائی کوس پیدل چلنے کے بعد بالکل ویرانے میں ایک باغ نظر آیا جس کے چاروں طرف دھوتی کرتا پہنے، سر پر مُچھا باندھے، ہاتھوں میں بندوقیں اور تیز ہتھیار لئے لوگ کھڑے پہرہ داری کر رہے تھے ان پانچوں افراد کو دیکھ کر ایک بندوق بردار نے انہیں دور ہی سے رُکنے کا اشارہ کیا، وہ لوگ رک

گئے اور صرف ڈومرآگے بڑھا اور اس نے رکنے والے بندوق بردار کے قریب پہنچ کر بات چیت کی جس کے بعد انہیں روکنے والے نے ایک دوسرے بندوق بردار کو اپنے پاس بلایا اور اسے ان لوگوں کے پاس کھڑے رہنے کا اشارہ کیا اور خود بندوق اٹھائے باغ کے اندر چلا گیا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ باغ کے اندر سے واپس نمودار ہوا اور ان پانچوں کو اندر چلنے کا اشارہ کیا، ان کے پیچھے پیچھے وہ بندوق بردار بھی چوکنا ہو کر چل رہا تھا۔ کئی مراحل گزرنے کے بعد وہ لوگ باغ کے بیچ و بیچ پہنچے اور ٹھٹھک پڑے۔ وہاں پر بالکل عدالت کا منظر تھا۔

ایک بڑے تناور نیم کے پیڑ کے نیچے ایک بڑا سا ٹیبل اور اس کے پیچھے تین کرسیوں پر دھوتی کرتا میں ملبوس، بڑی بڑی مونچھوں والے بارعب لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ٹیبل کے دونوں کناروں پر دو اسٹول پڑے تھے جن پر منشی نما شخص براجمان تھے۔ ٹیبل کے دائیں جانب فریادی فریاد کر رہے تھے اور بائیں طرف بندوق برداروں کے گھیرے میں سر جھکائے خوف سے زرد والے چہرے مجرم کھڑے تھے اور ٹیبل کے سامنے دور تک زمین پر پچیس تیس لوگ بیٹھے اپنی فریاد سنانے کی باری کا انتظار کر رہے تھے۔

یہ پانچوں افراد حیرت سے سارا منظر دیکھ رہے تھے اچانک ایک بندوق بردار نے تقریباً ڈانٹتے ہوئے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا اور وہ جلدی سے مشینی انداز میں ان لوگوں کے درمیان بیٹھ گئے اور پھر اطمینان سے عدالت کی ساری کاروائی دیکھنے لگے۔

دائیں جانب اسٹول پر بیٹھا منشی فریادی کا نام پکارتا، فریادی بیچ میں بیٹھی بھیڑ سے اٹھتا اور ٹیبل کے ٹھیک دائیں جانب کھڑا ہو کر اپنی فریاد سنانے لگتا۔ کرسیوں پر بیٹھے لوگ غور سے فریادی کی بات سنتے، بیچ بیچ میں سامنے رکھے کاغذ پر کچھ لکھتے جاتے اور پھر فریادی کی بات ختم ہوتے ہی تینوں ایک دوسرے سے مشورہ کرتے اور آخر میں بیچ والی کرسی پر بیٹھا بارعب شخص تیز آواز میں فیصلہ سناتا۔ اس فیصلہ کو بائیں طرف کے اسٹول پر بیٹھا منشی لکھتا جاتا اور پھر وہ مجرموں کی سزا کا پروانہ کاٹ کر پاس کھڑے بندوق برداروں میں سے ایک کے حوالے کر دیتا، مجرم حاضر ہوتا تو اسے مجرموں کی بھیڑ سے باہر نکالا جاتا اور رسیوں سے جکڑ کر

بندوق کے سائے میں چار بندوق بردار اُسے لے کر آگے بڑھ جاتے اور کچھ ہی دیر بعد اس جانب سے بڑی دلدوز چیخ ابھرتی۔ ایسی چیخوں پر کوئی چونکتا نہیں، پلٹ کر دیکھتا نہیں، ایسا لگتا جیسے یہ چیخیں بھی معمول کے مطابق ہی ہیں۔ ہاں مجرم موجود نہیں رہتے، انہیں راتوں رات اغوا کرنے اور انہیں سنائی گئی سزا دینے کا بھی پروانہ جاری ہو جاتا۔

اس بیچ ایک بندوق بردار راگھو کے قریب آیا اور اسے اٹھنے کا اشارہ کیا اور جب راگھو حیران و پریشان اٹھ کھڑا ہوا تو بندوق بردار نے اسے فریادیوں کا نام پکارنے والے منشی کے پاس لے گیا۔ منشی نے راگھو کو اوپر سے نیچے تک بڑے غور سے دیکھا اور اس کا نام اور حادثہ کی مختصر رپورٹ پوچھ کر لکھنے لگا۔ اس کے بعد منشی نے اسے واپس اپنی جگہ بیٹھنے کو کہا اور راگھو واپس اپنی جگہ بیٹھ گیا اور اپنی باری کا انتظار کرنے لگا۔

چند گھنٹوں کے بعد راگھو اور سندری کا نام پکارا گیا۔ راگھو اپنا نام سنتے ہی کھڑا ہو گیا اس کے ساتھ ہی ساتھ سندری اور متیا بھی اُٹھ کھڑی ہوئی اور وہ تینوں تیز قدموں سے چلتے ہوئے فریادیوں والی جگہ پر کھڑے ہو گئے۔

''ہاں راگھو سناؤ تمہاری کیا فریاد ہے؟'' دائیں جانب والی کرسی پر بیٹھا بارعب شخص راگھو سے مخاطب ہوا۔ اور راگھو یہ آواز سنتے ہی ایک بار پھر اپنی درد و غم میں ڈوبی بربادیوں کی داستان سنانے لگا۔

راگھو کے بعد سندری اور متیا کا بھی بیان ہوا۔ سندری نے اپنی بے عزتی اور عصمت دری کی المناک کہانی جس انداز سے سنائی اسے سن کر وہاں پر موجود تمام لوگوں کے چہرے غصہ اور نفرت سے تمتما گئے۔

پوری تفصیل سننے کے بعد کرسیوں پر بیٹھے تینوں افراد نے سرگوشیوں میں کچھ مشورہ کیا اور پھر درمیان کی کرسی والا شخص اپنی کرخت آواز میں فیصلہ سنانے لگا۔

''راگھو اور اس کی جورو کو اپنے باہوبل سے جکڑ کر ان کی بیٹی سندری کے ساتھ تا تھ نگر کے ٹھاکر نریش سنگھ کا لڑکا رمیش سنگھ نے اپنے تین ساتھیوں دھیرو، جے سنگھ اور گووندا کے ساتھ مل

کر جو کچھ کیا، وہ بہت گمبھیر اور اپمان جنک ہے۔ اس جاتی کے غریب لوگوں کی بھی اپنی عزت ہے، اپنا سوابھیمان ہے۔ اس لئے ہم پھیصلہ کرتے ہیں کہ آج ہی ان چاروں اپرادھیوں کا اپہرن (اغوا) کرکے ان میں سے رمیش سنگھ کا گپتا نگ (اعضائے تناسل) اور ناک کاٹ دیا جائے، ساتھ ہی ساتھ بقیہ تین لوگوں کے ناک کان اور داہنے ہاتھ کی ایک ایک انگلی کاٹ دی جائے۔''

فیصلہ سن کر راگھو، تمیا اور سندری دنگ رہ گئے، انہیں ایسے زبردست فیصلے کی امید نہیں تھی، ان تینوں کے سوکھے غمزدہ اور پژمردہ چہرے کھل اُٹھے۔

تھوڑی دیر بعد انہیں اطمینان سے بغیر خوف ودہشت کے اپنے گاؤں واپس جانے کے لئے کہا گیا اور وہ تینوں ڈومرا اور بھگت کے ساتھ ساتھ خوشی خوشی واپس چل دئے۔

☆

رات آئی، لیکن راگھو تمیا کی آنکھوں سے نیند غائب تھی۔ آج کی رات انہیں بڑی لمبی لگ رہی تھی بڑی مشکل سے صبح ہوئی اور راگھو بے قراری کے عالم میں اپنی جھونپڑی سے باہر نکلا تو اس نے محسوس کیا کہ پورے گاؤں میں سراسیمگی پھیلی ہوئی ہے اور ہر کی زبان پر ایک ہی بات تھی۔ ٹھاکر صاحب کے لیئکا (لڑکا) رمیش مالک کے ام۔سی۔پی والن (والوں) نے گپتا نگ (اعضائے تناسل) کاٹ دیلن (دیا) اور ان کر (کے) تین آدمی دھیرو، جے سنگھ اور گووندا کے ناک، کان اور ایک ایک انگلی صاپھ (صاف) کر دیلن (کردیا)، او چاروں کے سام کھنی ہے (شام کے وقت ہی) اپہرن (اغوا) ہو گیلے بلئی اور بھورے (صبح) کھنی گاؤں کے کنارے ندیا کے پاس او سب ای حالت میں بے ہوس مل لن (ملے) اور......'' راگھو نے اتنا سن کر اطمینان کی سانس لی۔ اسے اس خبر سے روحانی خوشی محسوس ہو رہی تھی، وہ بھاگتا ہوا اپنی جھونپڑی کے پاس گیا۔ تمیا اور سندری اپنی جھونپڑی کے باہر ہی تھیں۔ اس نے ان دونوں کو سرگوشیوں میں ساری بات بتائی اور یہ سن کر ان دونوں کے اداس چہرے بھی کھل اُٹھے۔

سارادن اسی واقعہ کا پورا گاؤں میں چرچا ہوتا رہا، خبر یہ بھی پھیلی کہ ٹھاکر صاحب بڑے غصہ میں ہیں۔ ان چاروں کو شہر کے اسپتال میں داخل کرادیا گیا ہے، جہاں ٹھاکر رمیش کی حالت بڑی نازک بنی ہوئی ہے۔

خبریں پر لگا کر اڑتی رہیں۔ اور آخر ایک دن ٹھاکر نریش سنگھ اس حادثہ کی تہہ تک پہنچ ہی گئے اور انہیں یہ تفصیل معلوم ہوگئی کہ ان کے بیٹے اور اس کے تین ساتھیوں کے ساتھ ایسا وحشیانہ اور بہیمانہ سلوک کس کی وجہ کر ہوا ہے۔ جس وقت ٹھاکر صاحب کو اس واقعہ کی تفصیل معلوم ہوئی غصے سے ان کی مٹھیاں بھنچ گئیں اور ان کی آنکھوں سے شعلے برسنے لگے۔ غصہ میں ان کے منہ سے صرف اتنا نکلا۔

''اس سالے کی یہ مجال، وہ اپنی اوقات بھول گیا، دیکھوں گا اس حرامزادے کو کہ اسے کتنی عزت پیاری ہے''

☆

اور ایک رات — جب رام نگر کے غریب اور مزدور لوگ، دن بھر کی محنت اور مزدوری کرنے کے بعد اپنی اپنی جھونپڑیوں میں تھکے ہارے سو رہے تھے کہ اچانک گولیوں کی ٹھائیں ٹھائیں سے ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ لوگ پوری بات سمجھ نہیں پائے تھے کہ ان کی جھونپڑیاں دھڑا دھڑ جلنے لگیں اور اس آگ کی روشنی دور دور تک پھیلنے لگی۔ ہر طرف آگ، چیخ و پکار، شور، ہنگامے۔ کچھ لوگوں نے اپنی جان بچا کر بھاگنے کی کوشش کی تو انہیں بندوق سے نکلی گولیوں نے بھون ڈالا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا گاؤں شمشان میں تبدیل ہوگیا۔

صبح ہوئی، دوسرے گاؤں کے مندر کے گھنٹے بجے، مسجدوں سے اذان کی صدا ابھری، لیکن رام نگر میں صبح کا اجالا نہیں پھیلا۔ ہر سمت جھونپڑیوں سے اٹھتے ہوئے کالے دھوئیں، انسانی لاشوں کے جلنے کی بو اور زخموں سے چور، چند لوگوں کی کراہ — ایک عجیب وحشت ناک اور المناک منظر تھا۔

صبح کے نو بجتے بجتے شہر سے اعلیٰ حکام اور پولیس کے دستے گاؤں کو چاروں طرف سے

گھیر چکے تھے۔ دوسرے گاؤں سے آنے والے گاؤں کی یہ حالت دیکھ کر مشتعل ہو رہے تھے اور طرح طرح کے نعرے لگانے شروع کر دئے، اس لئے ان لوگوں کو گاؤں کے باہر ہی روک دیا گیا۔ لاشیں ہٹائی جانے لگیں۔ ایک جھونپڑی سے راگھو، متیا اور سندری کی بھی اکڑی اور جلی لاشیں ملیں۔ جھونپڑی میں سلگتی آگ کو بجھانے کی ممکن کوشش کی جا رہی تھی، لیکن یہ آگ نہ جانے کیسی تھی کہ جیسے جیسے بجھانے کی کوشش کی جاتی وہ مزید بھڑ کنے لگتی۔ فائر بریگیڈ والے بھی پہنچ گئے اور کئی گھنٹے کی کوششوں کے بعد آگ لپٹوں پر قابو پایا۔ لیکن اتنی ساری کوششوں اور محنت کے باوجود جگہ جگہ چنگاریاں سلگ رہی تھیں۔

اس حادثہ سے آس پاس کے گاؤں میں سراسیمگی پھیل گئی۔ کئی گاؤں اور شہروں میں سر جوڑ کر میٹنگیں ہونے لگیں۔ سرکاری طور پر گاؤں کو نئے سرے سے بسانے سے اور مارے گئے لوگوں کے رشتہ داروں کو معاوضہ دینے کا بھی اعلان ہوا۔ صوبہ کے کئی وزیر بھی آئے اور گاؤں میں گھوم گھوم کر زندہ بچ رہے لوگوں کی ڈھارس بندھائی۔ اب کچھ نہیں ہوگا، تم لوگ اطمینان سے رہو، پولیس تمہاری حفاظت کرے گی، تم پر اب کوئی ظلم و تشدد نہیں ہونے دیا جائے گا۔

اس گاؤں کے لوگوں کے ساتھ آس پاس کے گاؤں سے آئے لوگوں نے بھی وزیروں اور افسروں کی باتیں سننے کو تو سن لی لیکن ان کے دلوں میں چنگاریاں دہک رہی تھیں اور ایک دن......

وہ دن بھی آیا، جب ناتھ نگر پر انسانی قہر ٹوٹ پڑا اور پھر وہی منظر رام نگر کا، ناتھ نگر میں دیکھنے کو ملا۔ ہر طرف آگ، خون، چیخ پکار، خوف، دہشت، بھاگ دوڑ......

دوسری صبح ٹھاکر نریش کے پورے خاندان کے ۱۳ افراد کے سر دھڑ سے جدا ہو کر گاؤں کے قریب بہتی اگری ندی میں ڈوب ابھر رہے تھے اور ندی کا پانی انسانی لہو سے سرخ ہو رہا تھا............ اور ادھر اس گاؤں سے چند کوس کے فاصلے پر باغ کے اندر عدالت کے فیصلے کی کامیابی پر جشن منایا جا رہا تھا۔

سوا بھیمان

ایک وقت تھا جب ٹھاکر نریش سنگھ کا شمار نہ صرف خوشد ہرہ گاؤں میں، بلکہ پورے قرب وجوار میں بڑے زمینداروں میں ہوتا تھا۔ سینکڑوں بیگہ زمین کے مالک، کھیت کھلیان اور باغات سونا اگل رہے تھے۔ ان کی بڑی سی حویلی، جس کا نام شانتی کنج تھا، اس شانتی کنج میں دوردراز سے پریشان حال لوگ آتے اور ٹھاکر صاحب کی دریادلی سے فیضیاب ہوتے۔ ان کے رعب اور دبدبہ کا یہ عالم تھا کہ گاؤں کا کوئی بھی کام ان کے حکم اور اجازت کے بغیر نہیں ہوتا۔ ان کی شان وشوکت، رعب اور محبت نے ان کی شخصیت کو پورے علاقہ میں ہردلعزیز بنادیا تھا۔ گاؤں کے ہر طبقہ کے لوگ امیر، غریب، مزدور، کسان سب کے سب ان کے گرویدہ تھے۔ سبھوں کو انھوں نے اپنے رعب اور محبت سے باندھ رکھا تھا۔

لیکن آزادی ملنے کے کچھ ہی عرصہ بعد شہر کے ساتھ ساتھ گاؤں میں بھی تبدیلیاں سامنے آنے لگیں اور ایسا لگا کہ آزادی نے سبھوں کو آزاد کردیا۔ دھیرے دھیرے ان کا وہ رعب اور دبدبہ ختم ہوتا چلا گیا۔ شانتی کنج میں بھی ویرانی چھانے لگی اور اس شاندار عمارت کا رنگ و روغن بھی ماند پڑنے لگا۔ ان کے تینوں بیٹوں نے اپنے باپ کی اتنی بڑی زمینداری کو ہی سب کچھ تصور کرتے ہوئے اس میں ایسا مصروف رہے کہ باہر کی دنیا میں چلنے والی بدلتی ہوا کا انھیں احساس ہی نہیں ہوا۔ عیش و آرام اور شانتی کنج کی شانتی نے انھیں اس قدر سکون و اطمینان کا احساس کرایا کہ ان تینوں نے اپنی تعلیم کو بھی محدود ہی رکھا، بس حساب کتاب اور خط وکتابت سے آگے کی پڑھائی کو ان لوگوں نے ضروری نہیں سمجھا۔

لیکن جیسے جیسے ٹھاکر نریش سنگھ کا طلسم ٹوٹنے لگا، ضرورتوں نے ان کے کھیت، زمین اور

دیگر جائداد کو نگلنا شروع کر دیا، پھر وہ وقت بھی آیا جب گھر کے حالات بد سے بدتر ہونے لگے، تو ان کے وسیع و عریض حویلی کو بھی کئی ٹکڑوں میں بانٹ دیا گیا، کچھ حصہ فروخت ہو گیا، کچھ کو کرایہ پر لگانا پڑا۔

ان نامساعد حالات نے ٹھاکر صاحب کو اندر ہی اندر توڑ دیا۔ جوانی نے بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ دیا تھا۔ دھیرے دھیرے ان کے پورے وجود کو مختلف طرح کی بیماریوں نے جکڑ لیا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دواؤں نے بھی اپنی تاثیر کھودی۔ بیماریوں کے بڑھتے حملوں اور دواؤں کی کھوتی تاثیر نے ٹھاکر صاحب کو بھی یہ احساس کرا دیا کہ وہ اب زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہیں گے۔ ایسے میں انھیں اپنے کئے کرم بھی ستانے لگے تو انھیں شیو پران میں لکھی یہ بات یاد آئی کہ کاشی میں کسی کی مرتیو (موت) ہوتی ہے تو وہ سیدھا بیکنٹھ (سُورگ) میں جاتا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی انھوں نے اپنے تینوں بیٹوں کو بلایا اور ان سے اپنی انتم اچھا (آخری خواہش) بتائی، باپ کی انتم اچھا سن کر تینوں بیٹوں نے ایک دوسرے کا منھ دیکھا اور ایک دوسرے کمرے میں آ کر سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگے۔

''کا کہتے ہو، بھیا''؟

چھوٹے بھائی نے بڑے بھائی سے پوچھا، منجھلا بھائی بھی چھوٹے بھائی کے اس سوال میں شامل تھا۔

بڑا بھائی کچھ دیر سوچتا رہا، پھر بولا۔

''بابو جی ٹھیکے کہتے ہیں، ہم سب کے جو شان و شوکت تھا، بابو جی کا جو رتبہ تھا اور پھر گاؤں کے سامنے بھی تو سوابھیمان (وقار) کا سوال ہے۔ اس لئے کچھ بھی ہو، جیسے بھی ہو، بابو جی کی انتم اِچھا پوری کرنے کے لئے ہم انھیں کاشی ضرور لے جائینگے۔''

بڑے بھائی نے جو فیصلہ سنایا، اس فیصلہ پر دونوں بھائیوں نے بھی حامی بھری اور دوسرے ہی دن سے کاشی جانے کی تیاری شروع ہو گئی۔ گاؤں والوں کو بتا دیا گیا کہ ٹھاکر

صاحب کا انتم سمئے آگیا ہے اس لئے ہم لوگ ان کی انتم اچھا کی پُرتی کے لئے انھیں کاشی لئے جارہے ہیں تا کہ وہ سیدھے سوَرگ واسی بنیں۔

کاشی کے سفر اور دیگر اخراجات کے لئے شانتی کنج کے مزید ایک حصہ کو فروخت کرنے کے لئے گاؤں کے مکھیا سے بات کی گئی ۔مکھیا فوراً تیار ہوگیا اور آدھی رقم ٹھاکر صاحب کے بڑے بیٹا کے حوالے کرتے ہوئے کہا.......

'' تو لوگ جلدی کاشی جا، واپسی پر مکان کی رجسٹری ہوگی ''۔

کاشی جانے کے لئے تینوں بیٹوں کے ساتھ ساتھ ٹھاکر صاحب کے کئی قریبی رشتہ دار بھی جانے کے لئے بضد ہو گئے ۔نتیجہ میں ٹھاکر صاحب کے ساتھ کاشی جانے والوں کی تعداد دس ہوگئی۔ ایمبولینس اور ایک بڑی کار کرایہ پر لی گئی اور جب وہ کاشی کے لئے روانہ ہونے لگے، تب پورے گاؤں والوں نے پرنم آنکھوں سے ٹھاکر صاحب کو وداع کیا۔

تقریباً دو سو کیلو میٹر کا فاصلہ طئے کر کے یہ تمام لوگ کاشی پہنچے اور وہاں کے دھرم شالہ میں ٹھہرنے کے لئے قدم رکھا، تو معلوم ہوا کہ یہاں فی الحال کوئی کمرہ خالی نہیں ہے۔ مجبوراً انھیں ایک ہوٹل کا دو کمرہ کرایہ پر لینا پڑا اور رات کا بھوجن کھا کر سو گئے۔

صبح سویرے ہی کاشی کے ایک مندر سے ایک پنڈت جی کو ٹھاکر صاحب کے پاس لایا گیا اور پنڈت جی نے ساری سمسیاؤں کے سادھان کے لئے خاصی بڑی رقم کا مطالبہ کر دیا، جس سے انکار کرنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ پنڈت جی نے پوری رقم مل جانے کے بعد، پوجا پاٹھ کے لئے مطلوبہ سامان منگائے اور پھر پوجا اور پاٹھ کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

پوجا پاٹھ سے ٹھاکر صاحب کو بڑی آتم شانتی ملنے لگی اور وہ پرسکون ہو کر نیند کی وادیوں میں کھو جاتے۔

.... یہ سلسلہ صبح سے رات گئے تک جاری رہتا ، اس درمیان ٹھاکر صاحب کے ساتھ آئے ہوئے لوگ بیچ بیچ میں اُٹھ کر باہر جاتے اور چائے ، ناشتہ ،کھانا کھا کر آتے جاتے ۔پنڈت جی بھی گھنٹہ بھر کے لئے اپنی ضروریات اور بھوجن وغیرہ کے لئے جاتے

تو اپنے ایک شیشیہ (شاگرد) کو بٹھا جاتے اور وہ اسی طرح پوجا اور پاٹھ میں لین (محو) ہو جاتا۔

وقت گزرتا گیا، ایک سے دو دن، دو سے چار دن اور پھر پورے بارہ دن ہو گئے لیکن یم دوت کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔

ٹھاکر صاحب کے بیٹوں کا بٹوہ خالی ہوتا جا رہا تھا، انھیں تشویش ہونے لگی کہ اس اجنبی شہر میں وہ کس کے سامنے ہاتھ پھیلائینگے۔

پنڈت جی بھی وقت کو طول ہوتے دیکھ کرا کتانے لگے تھے۔ اور وہ کئی کئی گھنٹہ غائب رہنے لگے۔ ساتھ میں آئے لوگوں کا کھانا پینا بھی مختصر کرنا پڑا۔ چند دنوں بعد ساتھ آئے لوگوں کو سمجھا بجھا کر گاؤں واپس کر دیا کہ، کب تک یہاں پڑے رہو گے، بابو جی کا ابھی کوئی ٹھیک نہیں، کب کا ہوئی، تو سب کے کاموں حرج ہو رہا ہے اور رو جانہ کا کھرچا الگ۔۔۔۔" لوگوں کو بھی یہ بات جچی، اور وہ لوگ واپس ہو گئے۔

وقت......گزرتا رہا، یم دوت کا دور دور تک پتہ نہیں تھا، مہینہ گزر گیا۔ اب بٹوہ پوری طرح جواب دینے والا تھا۔ ایسے حالات میں کیا کیا جائے، تینوں بیٹوں کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ پریشان ہو کر ان تینوں نے ایک جگہ بیٹھ کر کافی دیر تک سرگوشیوں میں گفتگو کی اور آخر کار اپنے جذبات کو قابو میں رکھتے ہوئے، دل پر بھاری پتھر رکھ کر ایک اہم فیصلہ کر لیا......

ابھی صبح ہونے میں دیر تھی، رات کے اندھیرے کی چاروں طرف حکمرانی تھی، تینوں بیٹوں نے بڑی شدّت کے ساتھ بابو جی کے پیر چھوئے، ان سے ہاتھ جوڑ کر آشیرواد لیا اور پھر انھیں گود میں اٹھا کر ٹیمپو میں سوار ہو گئے۔ بابو جی کی اچانک نیند ٹوٹی، تو انھوں نے سوال کیا

"کہاں لے جا رہے ہو؟"

جواب میں، تینوں بیٹوں نے بیک زبان کہا۔

"گنگا گھاٹ گھمانے بابو جی...." یہ سن کر بابو جی خاموش ہو گئے۔

گنگا گھاٹ میں جب یہ لوگ پہنچے تو صبح کا پو پھوٹ رہا تھا، سورج کی سنہری کرنیں گنگا ندی کے پانی میں پیوست ہوکر ایک عجیب سی دلکشی پیدا کر رہی تھیں، چاروں طرف مندروں کی گھنٹیوں کی مدھر اور مترنم آواز کی گونج تھی۔ یہ سب مل کر پورے گھاٹ کے ماحول کو بڑا ہی سحر انگیز بنا دیا تھا۔

گنگا گھاٹ کے قریب پہنچ کر، آٹو سے بابو جی کو اتارنے سے پہلے بڑے بیٹا نے ایک ناؤ والے سے بات کی، اور اس کی یہ باتیں سن کر ناؤ والے نے ایک نظر اسے حیرت سے دیکھا اور بیچ و بیچ گنگا میں لے جانے کا کئی گنا زیادہ کرایہ مانگا۔ مول تول کے بعد رقم لے کر ناؤ والا تیار ہو گیا۔

تینوں بیٹوں نے مل کر بابو جی کو گود میں لے کر آٹو سے اُتارا اور گود میں ہی لے کر ناؤ میں سوار ہو گئے۔ ناؤ دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگی۔ جیسے جیسے ناؤ آگے بڑھ رہی تھی، ویسے ویسے تینوں بیٹوں کے ہاتھ کی حرکت میں تیزی آ رہی تھی۔ ناؤ میں پڑی موٹی رسی کو ایک پتھر سے باندھ دیا گیا اور رسی کے دوسرے سرا سے بابو جی کی کمر کو باندھا گیا اور ناؤ جیسے ہی گنگا ندی کے بیچ و بیچ پہنچی، تینوں بیٹوں نے بابو جی کو اٹھایا اور بڑی تیزی سے پتھر سمیت گنگا کے سپرد کر دیا، زوردار چھپاک، چھپاک کی آواز گونجی اور بھاری پتھر بابو جی کو ساتھ لئے ہوئے گہرے پانی ڈوبتا چلا گیا۔

ڈوبتے لمحوں میں بابو جی کی آنکھیں اپنے تینوں بیٹوں کو حیرت و استعجاب سے تک رہی تھیں۔ بابو جی کے جل سمادھی پراپت ہوتے ہی تینوں بیٹے ایک دوسرے سے لپٹ کر رونے لگے اور ناؤ کا مانجھی انھیں عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا.....................

پت جھڑ

معظم جاہ اقدار احمد، اپنے علاقے کے بڑے زمینداروں میں شمار کئے جاتے تھے۔ ان کی حویلی، بڑی حویلی کے نام سے دور دور تک مشہور تھی۔ یہاں کی رعنائیوں اور شادمانیوں کا ذکر ہر کی زبان پر رہتا۔ یہ حویلی ایک پر فضا مقام پر ایستادہ تھی۔ حویلی کے اندر سے پھوٹنے والی روشنی سے آس پاس کے علاقے بھی منور رہتے۔ یہاں کے باغات کے چمپا، چمیلی، جوہی، بیلا اور رات کی رانی کی خوشبو بادِ نسیم اور بادِ صبا کی طرح پورے قرب و جوار کو اس طرح معطر رکھتیں کہ آس پاس سے گزرنے والا ہر حساس شخص اپنے آپ کو تر و تازہ محسوس کرتا، یہاں تک کہ نیلی اور بھوری آنکھوں والے بھی اس حویلی کے قریب سے گزرتے تو وہ بھی تھوڑی دیر کے لئے وہاں پر رکنے پر مجبور ہو جاتے۔

اس حویلی کے اندرون خانہ اور بیرون خانہ (کچہری) میں ہمہ وقت چہل پہل اور رونق ہی رونق تھیں۔ معظم جاہ اقدار احمد کے سات بیٹے اور تین بیٹیوں میں، تینوں بیٹیوں کی شادی ہو چکی تھی اور یہ سب دوسرے شہر میں اپنا گھر بسا چکی تھیں۔ اپنے بڑے بیٹے اخلاق احمد کی شادی کیلئے اقدار احمد فکر مند تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ بہو ایسی آئے جو اس حویلی کی شاندار روایات کو نہ صرف برقرار رکھے بلکہ اس میں اضافہ کرے۔ اس کے لیے اقدار احمد نے اپنی ایک دور کی رشتہ دار کی ایک بیٹی زینت النساء کے حسن و جمال اور ان کی شیریں زبانی کے چرچے، سن رکھا تھا' اس لئے انھوں نے اپنے بڑے لڑکے کے لئے اسے اپنانے کا فیصلہ کر لیا اور ایک دن زینت النساء اخلاق احمد کی دلہن بن کر اس بڑی حویلی میں ڈولی سے اتریں تو ایسا محسوس ہوا کہ ان کے حسن و جمال سے مسکراتا چہرہ اور اپنائیت وانسیت سے حویلی کا ہر فرد متاثر ہوا۔ زینت النساء نہ صرف اچھے اخلاق و ایثار کی نمونہ تھی بلکہ ان کے چہرے کی شگفتگی، شادابی اور تازگی اس بات کی غماز تھی کہ ان کا بچپن بھی پھولوں کے جھرمٹ میں گزرا ہے

اور انھوں نے ہر پھول کی کشش اور خوشبو کو اپنے جسم و جان میں ضم کرلیا ہے۔

زینت النساء کے حویلی میں داخل ہوتے ہی حویلی کی رونق مزید بڑھ گئی ۔حویلی میں رہنے والے تمام لوگوں کو انھوں نے بہت جلد اپنے حسن و اخلاق سے گرویدہ بنالیا۔اقدار احمد بھی خوش بہت تھے۔

بڑی حویلی کے اندرون خانہ اور باہری بیٹھک میں صبح سے شام تک لوگوں کے آنے جانے کا سلسلہ رہتا اور زینت النساء ہر آنے جانے والوں کا خاص خیال رکھتیں،اندرون خانہ آنے والی عورتوں سے وہ خوب گھل مل کر باتیں کرتیں'ان کی اور ان کے اہل خانہ کی خیریت دریافت کرتیں، پھر دستر خوان بچھتا ناشتہ کھانا سے ان کی تواضع ہوتی ۔ضرورت مندوں کو بڑی خاموشی سے ان کی ضرورت کے مطابق مدد کی جاتی۔اسی طرح وہ بیرون خانہ میں آنے والوں کا بھی نوکروں کے ذریعہ ضیافت کراتیں،اور محتاجوں کی مدد کرتیں ۔یہ سب دیکھ کر انکے سسر اقدار احمد اور ان کی بیگم عظیم النساء کو بڑا سکون ملتا۔ان کے شوہر اخلاق احمد بھی ہر طرح سے مطمئن تھے،کہ ان کے تمام بھائیوں کے ساتھ ساتھ خالہ،خالو، پھوپھا، پھوپھی، چچا، چچی اور ان کے تمام بچوں کے دلوں میں زینت النساء نے اپنی خاص جگہ بنالی ہے۔

وقت دبے پاؤں گزرتا رہا،زینت النساء دیکھتے دیکھتے تین بیٹوں کی ماں بن گئیں اور اس دوران معظم جاہ اقدار احمد اور ان کی بیگم عظیم النساء اپنی تمام ترو راثت کو چھوڑ کر سفر آخرت پر روانہ ہوگئیں۔دھیرے دھیرے وقت اور حالات بدلے تو حویلی کے اندر اور باہر کی فضا بھی بدلنے لگی۔حویلی کے آس پاس پھیلے پھل اور سایہ دار آم،امرود،شریفہ، جامن،گل مہر، برگد اور پیپل کے درختوں کو کاٹ دیا گیا، بلکہ بعض درختوں کو جڑوں سے ہی اکھاڑ دیا گیا اور ان کی جگہ طرح طرح کے کل کارخانے ،دفاتر،مکانات ایستادہ ہو گئے اور پھر یوں ہوا کہ بادمخالف سے حویلی کے اندر کے چمپا، چمبیلی ، جوہی، بیلا اور رات کی رانی کے ہرے بھرے پودے اور پھول بھی مرجھانے لگے ،حویلی سے معطر کرنے والی بادنسیم اور بادصبا دھیرے دھیرے معدوم ہونے لگیں،کل کارخانے ،دفاتر اور مکانات سے نکلنے والا کثافت بھرا دھواں

پوری حویلی کو آلودہ کرنے لگا۔طرح طرح کی گاڑیوں اور موٹروں کا شور الگ حویلی کے پر سکون ماحول کو متاثر کر رہا تھا۔

زینت النساء نے ہر ممکن کوشش کی کہ باہر سے آنے والی مسموم فضا اور فضائی آلودگیوں سے حویلی کو بچا کر رکھا جائے،لیکن ایسا ہوتا نظر نہیں آیا۔ان کے شوہر اخلاق احمد کی تمام تر کوششوں کے باوجود ان کے بھائیوں اور دیگر رشتہ داروں کے درمیان اقدار احمد کے گزرتے ہی نا چاقی بڑھتی گئی۔ پھر آپسی بٹوارہ کی آوازیں اٹھنے لگیں اور آخر کار ایک دن دلوں کے ساتھ ساتھ حویلی کا بھی بٹوارہ ہو گیا۔جس دن بٹوارہ ہوا،اس دن ایک طرف جہاں بٹوارہ کے خواہش مندوں کے درمیان آزاد فضا میں سانس لینے کی خوشیاں تھیں وہیں دوسری طرف زینت النساء اس بٹوارے پر بہت روئیں لیکن حالات ایسے تھے کہ انھیں بھی بے رحم حالات کے آگے سپر ڈالنا پڑی۔

تقسیم کے بعد وقت اور حالات بہت تیزی سے بدلنے لگے،زینت النساء اور اخلاق احمد کی تمام تر کوششوں کے باوجود بدلتے وقت اور حالات کی مسموم فضاؤں نے ان کے تینوں بیٹوں کو بھی اپنی گرفت میں لے لیا،گرچہ تینوں بیٹوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہو گئے،لیکن حویلی چونکہ کئی ٹکڑوں میں بٹ چکی تھی اس لئے ان کے بیٹوں اور بہوؤں کا یہاں دم گھٹنے لگا،اس لئے ان تینوں نے بھی حویلی سے دور جا کر اپنے لئے الگ آشیانہ بنا لئے۔زینت النساء اور اخلاق احمد بڑی حویلی کے بہت چھوٹے سے حصہ میں سمٹ گئے تھے،پھر بھی انھیں اپنی اس پرانی حویلی کے چند بوسیدہ کمروں اور آنگن میں اب بھی بڑا سکون تھا۔

کچھ عرصہ تک تو بیٹوں کا زینت النساء اور اخلاق احمد سے ملنے کے لئے کے آنے جانے کا سلسلہ رہا،پھر دھیرے دھیرے کم ہوتا گیا،خوشیاں رخصت ہونے لگیں ، اداسیاں اور محرومی کا احساس بڑھنے لگا،بیماریوں نے بھی اپنے پر پوری طرح پھیلا دئے تھے،اپنے بیٹوں پر اپنی جان نچھاور کرنے والے اور ہر پل ہر لمحہ اپنے بیٹوں کی خوشیوں کے لئے

دعائیں کرنے والے باپ کو بیماری کی حالت میں انھیں دیکھنے کوئی بیٹا آجاتا تو نہ جانے انھیں کہاں سے اتنی قوت مل جاتی کہ وہ اٹھ کر بیٹھ جاتے، اوران کی آنکھیں بیٹا پر ٹک جاتیں اوران کا دل چاہتا کہ بیٹاان کے قریب اور بہت قریب آئے ان سے باتیں کرے، لیکن بیٹا کو ہمیشہ واپسی کی جلدی رہتی۔ بس چند رسمی جملے ادا کرتے اور واپسی کے لئے مڑ جاتے۔

ایسے بے مروّت لمحوں میں اخلاق احمد کا دل اندر ہی اندر ٹوٹتا ہوا محسوس ہوتا لیکن وہ اس کا اظہار نہیں کرتے کہ ان کی بیگم کو اس سے زیادہ صدمہ ہوگا لیکن دھیرے دھیرے وہ ٹوٹتے چلے گئے اور ایک دن وہ بھی چل بسے۔

اخلاق احمد کے گزر جانے اور بیٹوں کی بے اعتنائی نے زینت النساء کو تنہائی کے بھنور نے قید کرلیا تھا۔ وہ اکثر پرانی یادوں میں کھوئی رہتیں، انھیں یاد آتا کہ ایک وقت تھا جب ان کی زینت کو ہر شخص اپنانے میں فخر محسوس کرتا لیکن آج حالات کی ستم ظریفی نے انھیں اس طرح بے وقعت بنادیا ہے کہ کوئی انھیں اپنانے کے لئے تیار نہیں ہے۔

بڑے بیٹا مشتاق بھی کبھی کبھار ہی آتے اور ماں کی خدمت میں لگی کنیزن بوا کو چند ہدایتیں دیتے، اماں کا خیال رکھنا بوا، انھیں کسی طرح کی تکلیف نہ ہو۔ کنیزن بوا خاموشی سے ان کی باتیں سنتیں اور زیرلب بڑبڑاتیں، ان کی ساری تکلیف تو تم لوگ ہو جب چاہو ان کی تکلیف دور کرسکتے ہو بس انھیں اپنالو۔ لیکن انھیں اپنانے کے لئے کوئی آمادہ نہیں تھا۔ وہ اپنے پوتے، پوتیوں کے بارے میں پوچھتیں کیسے ہیں یہ لوگ؟ مجھے یاد کرتے ہیں۔

منجھلے بیٹا کو بھی ماں سے ملنے اور انھیں دیکھنے کی فرصت بہت کم ملتی کہ وہ بہت ہی عدیم الفرصت تھے اور پھر ان کی لمبی اور چمچماتی کار کو اس پرانے علاقے میں آنے پر اسکریچ لگ جانے کا خدشہ رہتا اور چھوٹا بیٹا جو لندن میں ایک بڑی فرم میں ملازم تھا وہ دو چار سال پر آتا تو اپنے فلیٹ میں ٹھہرتا۔ اس لئے کہ ماں جہاں رہتی ہے وہ ایک بہت پرانی جگہ ہے اور وہاں بوسیدگی اور تعفن بہت ہے۔ اس بیٹے کے آنے کی اطلاع ماں کو ملتی تو ان کی باچھیں کھل جاتیں ان کی آنکھیں دروازے پر ٹکٹکی لگائے رہتیں اور وہ ہر تھوڑی دیر بعد کنیزن بوا کو دروازہ

کھول کر باہر دیکھنے کو کہتیں کہ دیکھو باہر میرا چھوٹا بابو آ گیا ہوگا اور چھوٹا بابو اپنی ماڈرن بیوی کے ساتھ گھر میں داخل ہوتے اور ماں کے قریب پہنچ کر جلدی سے ناک پر سینٹ سے معطر رومال رکھ لیتے کہ انہیں کہیں بوسیدہ کمرے میں بیمار پڑی ماں کی کھانسی اور منھ سے نکلنے والے بلغم سے انفکشن نہ ہو جائے۔ ماں کی دلی خواہش ہوتی کہ بیٹا قریب آئے اور اسے اپنے سینہ سے لگا لے، لیکن ان کی یہ خواہش ان کے دل میں ہی رہ جاتی۔

چھوٹا بیٹا اور ان کی بیگم بھی تھوڑی دیر بعد، پھر آؤنگا، کہہ کر باہر نکل جاتے، تو زینت النساء انہیں بڑی بے چارگی سے باہر جاتے ہوئے دیکھتی رہتیں اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتیں۔ ایسے میں کنیزن بوا، ان کے قریب آتیں اور انہیں چپ کرانے کی ہر ممکن کوشش کرتی، لیکن ان کی سسکیاں کم نہیں ہوتیں اور چند گھنٹوں بعد وہ نڈھال ہو کر بھوکی ہی سو جاتیں۔ زینت النساء کی بڑھتی عمر اور اپنوں کی لاتعلقی نے ان کے جسم و جان کو نیم مردہ کر دیا تھا اور ان کے چہرے کی تمام تر شادابی، شگفتگی، تازگی، کو معدوم کر دیا ہے اور محبت، پیار، ایثار کی مجسم دیوی، ایک بے رونق اور بے جان سی شئے بن کر گھر کی چہار دیواری میں سمٹ کر رہ گئی ہیں۔ انکی آنکھیں چاروں طرف خلاء میں گھومتی ہوئی............نہ جانے کیا ڈھونڈھتی رہتی ہیں۔

- ریزہ ریزہ خواب
- دھوپ کی چادر
- پانی پر نشان

بازگشت

ریزہ ریزہ خواب

- غیاث احمد گدی
- رام لعل
- کلام حیدری
- جوگندر پال
- احمد یوسف
- معین شاہد
- بدر اورنگ آبادی
- محمود ایوبی
- م۔ق۔خاں
- شفق
- شوکت حیات
- حسین الحق
- رضوان احمد
- حمید سہروردی
- مشتاق احمد نوری
- نورالحسنین
- اختر واصف
- تسکین زیدی
- خورشید حیات
- اصغر علی انجینیر
- عبدالمغنی
- تاراچرن رستوگی
- وہاب اشرفی
- وارث علوی
- علیم اللہ حالی
- عنوان چشتی
- قمر اعظم ہاشمی
- سرسوتی سرن کیف
- مناظر عاشق ہرگانوی
- تاج انور
- عثمان عارف
- شہنشاہ مرزا
- احمد حسین شمس
- انجم آراء انجم
- جاوید حیات
- طارق فاطمی
- قیصر جمال

غیاث احمد گدی (جھریا دھنباد)

جدید تر اُردو فکشن کی دنیا میں سیّد احمد قادری کی آمد علامتی اور تجریدی نظام اظہار کے نام پر ژولیدہ بیان اور فنکارانہ خامکاری کی بوجھل فضا میں ہوا کے خوشگوار جھونکے سے کم نہیں۔ اظہار بیان کی صفائی، ماجرا سازی اور کردار نگاری کا دروبست، تہہ در تہہ زندگی کا عرفان اور اس سے گہری وابستگی سیّد احمد قادری کی تخلیقی جہت کی نمایاں پہچان ہے۔

("ریزہ ریزہ خواب" کے فلیپ سے)

رام لعل (لکھنو)

نئے لکھنے والوں میں ایک نام سید احمد قادری کا بھی ہے جو افسانہ اور تنقید پر خاصی قدرت رکھتا ہے جن کے افکار سے نہ صرف افسانے کی روایت قائم رہتی ہے بلکہ ان میں عصری تقاضوں کا اہتمام بھی ہے۔ ("ریزہ ریزہ خواب" کے فلیپ سے)

کلام حیدری (گیا)

قادری کے تقریباً سبھی افسانوں میں ایک قدر مشترک یہ ہے کہ وہ مسئلوں کو افسانے نہیں بناتے، ان کے افسانوں سے مسئلوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔ وہ حل کے چکر میں بھی نہیں پڑتے، کیونکہ سیوا ان کا Object ہو سکتا ہے Target نہیں ہے۔

("ریزہ ریزہ خواب" کے فلیپ سے)

جوگندر پال (نئی دہلی)

"ریزہ ریزہ خواب" کی کہانیاں میں نے بڑی دلچسپی اور انہماک سے پڑھی ہیں۔ کسی بھی فنکار کے یہاں اس کے امکانات کی دھوپ چھاؤں میں دراصل اس کی سچائیوں کی صلاحیت کا ہاتھ رہتا ہے۔

☆احمد یوسف (پٹنہ)

سیّد احمد قادری کا تعلق افسانہ نگاروں کے اس قافلے سے ہے جو افسانے میں کہانی کے عنصر کو بے حد اہم قرار دیتا ہے کہ افسانے نے اسی زمین سے جنم لیا ہے۔

● معین شاہد (گیا)

سیّد احمد قادری کو اپنی باتوں کو کہنے کا سلیقہ آتا ہے۔ وہ اپنے احساسات اور جذبات کو افسانوں میں اس طرح فنی طور پر پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے والا اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔　　(آفتاب عالم، لکھنؤ ۲۰ر فروری ۱۹۸۷ء)

● بدر اورنگ آبادی (گیا)

جہیز کی لعنت کی بدولت لڑکیوں کی شادی میں دشواریوں کی کئی مثالیں قادری کے علم میں تھیں۔ اس کا حساس دل تڑپ اُٹھتا تھا اور اس کی یہ تڑپ اور چبھن ''سرخ جوڑے'' کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ اگر یہ کہانی قادری کے بجائے کوئی دوسرا افسانہ نگار بھی لکھتا تو میں یہی کہتا کہ یہ اُردو فِکشن میں کئی جہت سے ممتاز حیثیت رکھتی ہے اور اس کہانی کی اہمیت کا کھُلا ثبوت یہ ہے کہ اس کا ترجمہ انگریزی کے مؤقر روزنامہ ''Patriot'' میں چھپا۔ 'اُداسیاں' کے پنشن یافتہ بوڑھے انکل کی آنکھوں میں تنہائی کے باعث جب آنسو تیرنے لگے تو بچوں کو بڑی حیرت ہوئی اور وہ پوچھتے ہیں...... ''انکل، تم کیوں رو رہے ہو؟'' اور جواب؟ ''تم ان آنسوؤں کو نہیں سمجھو گے میرے بچو'' اس وقت تک جب تک کہ یہ آنسو تمہاری آنکھوں سے گریں''۔ کون سا دل ہے جو اس سیدھے سادے جملے سے تڑپ نہ اُٹھے۔ یہ معمولی سا جملہ ہر دل میں چبھن پیدا کر دینے پر قادر ہے۔

یہ ہے قادری کے فن کا کمال اور اس کی شناخت۔ ''آنگن کی بات'' بہ قول ڈاکٹر حسین الحق ''سید احمد قادری کی بتدریج ارتقائی روئیے کا ثبوت ہے۔ یہ کہانی دراصل عہد حاضر کے اس اجتماعی روئیے کی نشاندہی کرتا ہے جو بزرگوں اور ماضی سے اجتماعی بے نیازی اور لاپرواہی کا اشاریہ ہے''　　(سہ ماہی ''ترسیل'' جنوری ۱۹۸۹ء)

☆محمود ایوبی (ممبئی)

"کنارہ دور" شاید جنتا حکومت کے کھیون ہارون کا ماجرا ہے؟ یہ علامتی اور اشاراتی چیزیں اپنے پلّے کم ہی پڑتی ہیں۔ اس لئے لکھ رہا ہوں۔ اس کے دعویداروں کی تعداد کم نہیں، مگر یہ اقرار کی جرائت نہیں رکھتے، بلکہ الٹی سیدھی تاویلیں پیش کر کے ڈھٹائی دیکھاتے ہیں۔

(اردو، بلٹز، بمبئی)

م.ق.خاں (گیا)

Quadri's pen has all along been fighting a crusade against social injustice, exploitation of

the weaker classes of the society. Weather it may be labour or a women. He picks up his own sarrounding. He never lets his fancy room at

large in the world of dream or abstract or airy.

(Indian Nation)

شفق (سہرام)

سیّد احمد قادری بیانیہ کے اس پُل صراط سے کامیابی سے گذر جاتے ہیں جس پر اکثر جدید افسانہ نگار قدم رکھتے ہوئے ڈرتے ہیں اور رکھنے کی کوشش انہیں دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتی ہے۔ عہد حاضر کے اُلجھے ہوئے سلگتے مسائل اور بیانیہ اسلوب کی وجہ سے قاری پوری توجہ سے ان کی باتیں سنتا ہے۔ چاہے وہ آنگن کی بات ہو یا "سسکتے لمحوں" کا کرب، "لمحوں کا درد" ہو یا "قیدی" "بند آنکھوں کا سپنا"، فاصلہ قریب کا ہو یا کنارہ دور کا،

یہ باتیں جو جگ بیتی ہیں آپ بیتی معلوم ہوتی ہیں۔

(ریزہ ریزہ خواب کے فلیپ پر)

شوکت حیات (پٹنہ)

نئی نسل کے افسانہ نگاروں میں سیّد احمد قادری نمایاں نظر آتے ہیں ان کے یہاں سماجی اور سیاسی شعور کو افسانوی قالب میں ڈھالنے کی ہنرمندی، انہیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز کرتی ہے۔ کہانیوں میں واقعات کو پوری تہہ داری کے ساتھ پیش کرنے کا سلیقہ ان کی کہانیوں کی معنویت میں اضافہ کرتا ہے۔

(''ریزہ ریزہ خواب'' کے فلیپ سے)

حسین الحق (گیا)

............موضوعات کے لحاظ سے بھی سید احمد قادری شعوری طور پر سماج کے اہم مسائل کی جانب متوجہ ہوتے ہیں اور اس سلسلے میں سب سے زیادہ وہ ہندوستانی معاشرے میں عورت کی بے بسی کو اپنا موضوع بناتے ہیں، جن کی مثالیں ضرب احساس، بوجھ، کالا گلاب اور سرخ جوڑے وغیرہ افسانوں میں ملتی ہیں..................!

افسانہ ''فاصلہ قریب کا'' جسے سیّد احمد قادری نے ۴۷ء اور ۷۱ء کے نام معنون کیا ہے۔ اس میں Partition کا درد وکرب پوری طرح ابھر کر سامنے آیا ہے جو بے حد متاثر کرتا ہے۔ ان افسانوں کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ سید احمد قادری تیسری آواز کی نمائندگی بڑی کامیابی سے کر رہے ہیں۔

(''ترسیل''، جنوری/۱۹۸۹ء)

رضوان احمد (پٹنہ)

سیّد احمد قادری کے افسانے تکنیک، بیان، فکر اور اسلوب کا منفرد منظر نامہ پیش کرتے ہیں ان کے افسانے ایک جانب جہاں عرفانِ ذات کا وسیلہ بنتے ہیں، وہیں کائنات کی وسعتوں میں پھیلتے چلے جاتے ہیں۔

(''ریزہ ریزہ خواب'' کے فلیپ سے)

حمید سہروردی (گلبرگہ، کرناٹک)

''ریزہ ریزہ خواب'' میں شامل افسانوں میں مسائل فکر انگیز ہونے کے بجائے فکر مندی کے ساتھ تجربات اور محسوسات کو شدت سے ظاہر کرتے ہیں۔ ان کا افسانہ ایک مرکز پر آکر رُکتا ہے اور افسانہ نگار کے چونکانے کا عمل تیز ہے۔

سید احمد قادری معاشرتی و معاشی مسائل سے باخبر ہیں اور ان مسائل میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کا افسانہ اپنے پیش رو افسانہ نگاروں کی طرح المیہ اور نشاطیہ نہیں ہوتا۔ انہوں نے فرد کی بے بسی اور مجبوری کو فطری انداز میں درج کر دی ہے۔ ان کے افسانے زندگی سے باتیں کرتے ہیں، خواب کی نہیں۔

(گلبن، احمد آباد، جنوری ۱۹۸۷ء)

مشتاق احمد نوری (پٹنہ)

سید احمد قادری صرف بیرونی مناظر نہیں پیش کرتے بلکہ محسوسات کے نہاں خانوں، کشمکش، پیچیدگی اور درد و کرب کی لہروں کو بھی سمیٹ کر اپنی انتہائی مشاقی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

(ماہنامہ ''ترسیل'' جنوری ۱۹۸۶ء)

نورالحسنین (اورنگ آباد، مہاراشٹر)

سید احمد قادری کی بہترین کہانیوں میں شہر خموشاں، منظر یوں تھا، قیدی، یادوں کا المیہ، اجنبی راہیں، خواب، کنارہ دور اور گمشدہ اجالے موضوع اور تکنیک کے اعتبار سے بہت اہم ہیں۔

اکثر مقامات پر ان کا قلم کسی ماہر فوٹو گرافر کی طرح ایک ایک منظر کو فریم کر دیتا ہے۔ سید احمد قادری اپنے فن پر کڑی نظریں رکھتے ہیں۔

(''ترسیل'' جنوری ۱۹۸۹ء)

اختر واصف (پٹنہ)

سید احمد قادری کے اندر کہانی بننے، پھیلانے اور پھر اسے Close کرنے کی صلاحیت

بدرجہ اتم موجود ہے۔ان کے یہاں تخلیقی اُپج کی بھی کمی نہیں۔کہانی کے ذریعہ قاری کو اپنے گرفت میں لینے اور اپنی بات صحیح طریقے سے Convay کرنے کے گر سے بھی وہ بخوبی واقف ہیں............!

اس مجموعے میں کئی کہانیاں ایسی ہیں، جن پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔مثال کے طور پر افسانہ''فاصلہ قریب کا'' میرے خیال سے اس مجموعے کی بہترین کہانی ہے............ دوسری اچھی کہانیوں میں ''کنارہ دور''،''آنگن کی بات'' اور ''یادوں کا المیہ'' وغیرہ کو شمار کیا جا سکتا ہے۔

(''نقاد'' ۳۰ر دسمبر ۱۹۸۷ء)

☚ تسکین زیدی (کانپور)

سیّد احمد قادری نئی نسل کے ان کہانی کاروں میں ہیں جنہوں نے پریم چند کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ان کے یہاں عصری مسائل کا پورا احساس ملتا ہے۔

☚ خورشید حیات (بلاس پور)

سیّد احمد قادری کی کہانی جو سیدھے سادے انداز میں مدھم سُروں سے شروع ہوتی ہے۔ وہ ارتقا کی منزل تک پہنچتے پہنچتے ایک ایسی صورت اختیار کر لیتی ہے کہ ایک ایک لفظ قارئین کے لئے جہان معنی پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔

(ہماری زبان، نئی دہلی ۱۵ر جون ۸۶ء)

☆ اصغر علی انجینئر (ممبئی)

سیّد احمد قادری زندگی کی حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں اور زندگی اور اس کے پیچیدہ تقاضوں سے اپنی کہانیوں میں بخوبی عہدہ برآ ہوئے ہیں۔کہانی ان کے یہاں کہانی ہی رہتی ہے۔کیونکہ کہانی کہنے کا فن انہیں خوب آتا ہے۔یہ زندگی کو پھلتے پھولتے دیکھنا چاہتے ہیں اور یہی ان کی نظریاتی وابستگی ہے۔سارتر کے مطابق لکھنے کا فعل ہی وابستگی کا اعلان ہے اور قادری کی ہر کہانی یہ اعلان مبہم نہیں بڑے واضح طور پر ڈھیرے نہیں بہانگ دہل کرتی ہے۔

''ریزہ ریزہ خواب'' قادری کی بیس کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ ان میں بعض کہانیاں کمزور ہیں، بعض اچھی اور بعض بہت اچھی بھی۔ مجموعے کا نام بھی احمد قادری کی زندگی کے رویئے کا اعلان کرتا ہے۔ زندگی ایک سُندر سپنا بھی ہے اور انسان کو ریزہ ریزہ کردینے والی حقیقت بھی۔ ایک تخلیقی فنکار سُندر سپنا دیکھ کر ریزہ ریزہ کردینے والی حقیقت کو بھی گوارا بنالیتا ہے۔ اس کی بہترین مثال قادری کی کہانی ''سُرخ جوڑے'' ہے۔ یہ کہانی قادری کی بہترین کہانیوں میں شمار کی جائے گی۔

('بلٹز' ممبئی ۲۲/اگست ۱۹۷۸ء)

ڈاکٹر عبدالمغنی (پٹنہ)

سیّد احمد قادری کے افسانوں کی خوبی یہ ہے کہ ان میں زبردست عصری حسیت اور انسانیت کا ایک شدید احساس ہے۔ چنانچہ فنکار نے اپنے موضوعات کا انتخاب بہت چابک دستی اور حاضر دماغی سے کیا ہے۔ اس نے سماج اور شخصیت کے کانٹے چُن چُن کر ان میں فن کا پھول بنانے کی کوشش کی ہے۔

(مریخ، پٹنہ، مئی/۱۹۸۶ء)

تاراچرن رستوگی (گوہاٹی، آسام)

قادری صاحب کے افسانوں کے خواب ''خواب پریشاں'' نہیں بنتے اور اسی لئے ان کے جمالیاتی ادراک میں غمِ دوراں کی کسک بھی ہے اور اس کسک کا سامنا کرنے کی تاب و توانائی بھی ہے............

قادری افسانہ نگاری کے فن سے کما حقہٗ واقف ہیں۔ عرفان ذات وحیات کے حامل، یہ افسانے منفرد مقام ومرتبہ کے افسانے ہیں۔ ریاست بہار ہمیشہ سے افسانہ نگار پیدا کرتی رہی ہے۔ بہت اپدیش، جاتک کتھائیں قبل مسیح اسی خطہ میں لکھی گئی ہیں۔

سیّد احمد قادری ہر اعتبار سے بہت بڑا افسانہ نگار ہے۔

(ماہنامہ'' انشاء''(کلکتہ) فروری/۱۹۸۸ء)

ڈاکٹر وہاب اشرفی (رانچی)

قادری جو کچھ لکھ رہے ہیں، سوچ سمجھ کر لکھ رہے ہیں۔

("ترسیل" جنوری ۸۹ء)

☆وارث علوی (احمد آباد گجرات)

مجھے ایسا لگتا ہے کہ آپ کو قصہ گوئی کا طور ہاتھ آ گیا ہے اور مجھے خوف ہے کہ یہی چیز آپ کیلئے مُضر ثابت ہوگی۔ یہ باتیں میں نہ لکھتا اگر آپ میں افسانہ نگاری کی صلاحیت نہ پاتا۔

(ماہنامہ "ترسیل" جنوری ۱۹۸۹ء)

ڈاکٹر علیم اللہ حالی (گیا)

سید احمد قادری کا موضوعاتی Range خاصا وسیع و عریض ہے۔ ان کے افسانوں "کنارہ دور" "اجنبی راہیں" "شہر خوشاں" "لمحوں کی بازگشت" "یادوں کا المیہ" "گمشدہ اُجالے" اور "قیدی" وغیرہ کے ذریعہ جہاں موضوعاتی وسعت اور تنوع کا اندازہ ہوتا ہے وہیں ان کا مخصوص اسلوب بھی ظاہر کرتا ہے کہ وہ بیانیہ پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ وہ الفاظ و علائم کی ساحری سے ہمیں لبھانے کی کوشش نہیں کرتے۔ وہ خارجی واقعات وواردات سے اخلاقی نکتے پیدا کر کے اپنی تخلیقات کی معنویت اور افادیت منوا لیتے ہیں۔ معاصر افسانہ نگاروں میں وہ اپنی انسانیت دوستی، اقدار نوازی، غایت سنجیدگی اور متانت کی وجہ سے صاف صاف پہنچانے جاتے ہیں۔ کلام حیدری نے انہیں شہر افسانہ نگاری کا معزز شہری کہا ہے۔ ان کا یہ اعزاز متذکرہ بالا خصوصیات سے قائم ہوتا ہے۔

(۱۹۹۱ء کے اردو افسانے)

ڈاکٹر عنوان چشتی (نئی دہلی)

"ریزہ ریزہ خواب" کو پڑھ کر میں نے سید احمد قادری کے تخلیقی تجربوں میں شرکت کی اور اپنے ذہن وفکر کے نگار خانے میں ایسے مانوس جلوؤں کو رقصاں پایا جو ادبی روایت کی مخصوص

خصوصیت سے ابھرتے ہیں۔

(ترسیل جنوری ۸۹ء)

ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی (مظفر پور، بہار)

"ریزہ ریزہ خواب" کے افسانوں میں ماجرا سازی بھی ہے مختلف انوع کرداروں کی پیکر تراشی میں بھی تا بمقدور احتیاط اور سلیقے سے کام لیا گیا ہے اور ان افسانوں میں عصری اور سماجی زندگی کا شعور بھی موجزن ہے۔ "شہر خموشاں" کی نسرین " آنگن کی بات" کے وقار احمد "سرخ جوڑے" کی ثریا "بند آنکھوں کا سپنا" کے جاوید وغیرہ ایسے کردار ہیں، جن میں کسی طرح کی اجنبیت نہیں ہے۔ یہ سب کے سب ہمارے معاشرے کی سرگرمیوں سے ابھرنے والے کردار ہیں۔

"فاصلہ قریب کا" کی نصرت "سسکتے لمحے" کی شہلا اور "خواب" کے جاوید جیسے کردار اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ سید احمد قادری کی قوت مشاہدہ میں باریکی ہے، وا پہلوؤں کو پیش کرنے کی کاوش کی ہے اور اس کاوش میں انہیں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

(آجکل، جولائی ۱۹۸۶ء)

سرسوتی سرن کیف (بنارس)

Some pecple ha/e branded Quadri as having a progressive orientation. I do not see any such thing in these pieces. Only three stories deal with financial problems, nine stories depict psychology in varied but commonly known situationis sort of monotony of style there is a great variety of situations and problems. It can be said that these stories cover as much of life as is possible in a single book.

(The Pioneer)

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی (بھاگلپور)

سیّد احمد قادری نے تہہ بہ تہہ زندگی کو جس طور دیکھا، محسوس کیا اور بھوگا ہے، اسے بیانیہ طریقے سے افسانے کا روپ دیا ہے، آج کے سماج میں جو جبر ہے، دھوکہ، فریب، استحصال، ظلم، تشدد، انتشار، افراتفری، گھٹن، مایوسی اور مجبوری ہے اسے اپنے افسانوں کی معنویت بخشنے میں پیش کیا ہے۔

''ریزہ ریزہ خواب'' کے افسانوں میں منظم پلاٹ، نمایاں کردار، کہانی کے روپ میں کوئی خاص واقعہ...اور وحدت زماں و مکان کے ساتھ ایک مخصوص تاثر بھی پایا جاتا ہے......!

(توازن، مالیگاؤں)

تاج انور (گیا)

سیّد احمد قادری صرف بیرونی مناظر پیش کرتے بلکہ محسوسات کے نہاں خانوں، کشمکش، پیچیدگی اور درد و کرب کی لہروں کو بھی سمیٹ کر اپنی انتہائی مشاقی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

(ماہنامہ ''ترسیل'' فروری/۱۹۸۶ء)

عثمان عارف (احمد آباد گجرات)

سیّد احمد قادری کے اسلوب کو فیصلہ کن اسلوب یعنی Dicisive Style کے زمرے میں رکھنا پسند کروں گا۔ ان کا اسلوب خیال میں اس طرح داخل نظر آتا ہے۔ گویا پھول میں رنگ اور خوشبو، وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اور اسی لئے کہیں تصنع پیدا نہیں ہوتا۔

سید احمد قادری ایک سادہ، نرم دل، روشن دماغ، حساس طبیعت بیدار ذہن، درد مند فطرت اور صالح نظریات کے حامل ہیں، انہوں نے اپنی ان ہی خوبیوں کو بروے کار لا کر اپنے معیاری افسانوں سے اُردو زبان و ادب کو مالا مال کر دیا ہے۔

شہنشاہ مرزا (لکھنو)

جب سید احمد قادری خالص بیانیہ انداز کے افسانے لے کر سامنے آئے تو تھوڑی تبدیلی کا

احساس ہوا۔

(معلم اُردو' لکھنؤ' اکتوبر ر ۱۹۸۷ء)

احمد حسین شمس (کشن گنج' بہار)

اکتوبر کے شمارہ میں ناگ پھنی کا ایک درخت نظر آیا۔ کیا پتے کی بات ہے کہ ''اس کا بیج اس دن لگایا گیا ہوگا، جس دن ہابیل اور قابیل کے درمیان جنگ ہوئی تھی'' اور اب تو یہ درخت آج کے دور میں بہت لہلہا اٹھا ہے۔ ہر شاخ ناگ کی دو شاخہ زبان۔

میں تذبذب میں ہوں۔ مبارکباد اس درخت کو دوں یا ان لوگوں کو جو اس درخت کی سرپرستی کی رہے ہیں۔

فی الحال میں آپ کے قلم ہی کو مبارکباد کہہ رہا ہوں کہ اس نے اس درخت کی نشان دہی کی ہے۔ سراغ اور دریافت بھی بڑا کام ہے۔ غضب کا افسانہ ہے۔

(آواز، نئی دہلی)

انجم آراء انجم (علی گڑھ)

......بات معیار کی نہیں بلکہ عالمی معیار کی ہے۔ اس کے علاوہ بات یہ بھی ہے کہ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۹۰ء تک کے سارے افسانے میری نظر سے نہیں گزرے۔ اس لئے عین ممکن ہے کہ میری فہرست میں وہ افسانے رہ جائیں جو اعلیٰ معیار پر پورے اترتے ہوں۔ بہر حال یہ چند نام حاضر ہیں۔

ہاؤسنگ سوسائٹی (قرۃ العین حیدر)' آخری آدمی' شہر افسوس' (انتظار حسین) تیسری ہجرت (اعجاز راہی)' دریاؤں کی پیاس' بے محاورہ

(جوگندر پال)' مریم' جس تن لاگے (رتن سنگھ)' رانی' (اقبال متین)' بیساکھی' دو بھیگے ہوئے لوگ (اقبال مجید) لمحوں کی بازگشت (سید احمد قادری)' انجام کار (سلام بن رزاق)' کابلی والا کی واپسی (انور قمر)' گھونسلہ (شوکت حیات)۔

(ماہنامہ ''شاعر'' ہم عصر اردو ادب نمبر......صفہ۔۷۵۹)

⊂ ڈاکٹر جاوید حیات (پٹنہ)

استحصال سید احمد قادری کا پسندیدہ موضوع ہے۔ چنانچہ اس کے مختلف روپ مختلف افسانوں میں دکھائی دیتے ہیں۔

(سید احمد قادری: شخصیت اور فن)

⊂ ڈاکٹر طارق فاطمی (پٹنہ)

سیّد احمد قادری کے افسانوں کا مطالعہ کیجئے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا فن ہمیشہ ارتقاً پزیر رہا ہے اور گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ ان کے مشاہدے میں گہرائی اور باریکی کے ساتھ ترتیب ماجرا اور تعمیر عروج میں نفاست اور لطافت بھی پیدا ہوئی ہے۔

ان کے افسانوں میں غربت و افلاس کی چکی میں پستے ہوئے انسانوں کا کرب نمایاں ہے۔ ''بند آنکھوں کا سپنا''، ''سرخ جوڑے''، ''لمحے درد کے'' ایسے افسانے ہیں، جن میں نفسات کی پراسرار تہیں اور زندگی کی متعدد الجھنیں پوری شدت سے موجود ہیں۔ جن کی وجہ سے ان افسانوں کے مطالعے کے دوران قاری کی دلچسپی شروع سے آخر تک برقرار رہتی ہیں اور اکثر افسانوں کے خاتمے پر پہنچ کر قاری چونک اُٹھتا ہے۔

(قومی آواز (پٹنہ) ۱۳، اپریل ۱۹۸۶ء)

⊂ قیصر جمال (بھاگلپور)

''ریزہ ریزہ خواب'' کے افسانوں کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ اس دور میں بھی قادری نے اپنے افسانوں کا رشتہ کہانی پن سے جوڑے رکھا ہے اور مشاہدہ وفکر کے ذریعہ اپنے بیانیہ افسانوں میں Force پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، جس میں وہ کامیاب بھی ہیں۔ اس مجموعہ کے زیادہ تر افسانے سماجی اور اخلاقی پستی، غربت اور مفلوک الحال انسانوں کی زبوں حالی جنسی استحصال وغیرہ جیسے ترقی پسندانہ مسائل سے جڑے ہوئے ہیں۔ ''بند آنکھوں کا سپنا'' اور ''قیدی'' اقتصادی بدحالی پر کامیاب افسانے ہیں (اندیشہ، بھاگلپور، جنوری ۸۷ء)

بازگشت

دھوپ کی چادر

- شمس الرحمٰن فاروقی
- عبدالمغنی
- محمد مثنیٰ رضوی
- معین شاہد
- علیم اللہ حالی
- مناظر عاشق ہرگانوی
- محمد محفوظ الحسن
- رضوان احمد
- نامی انصاری
- ارتضیٰ کریم
- سید ظفر ہاشمی
- قمر جہاں
- اسلام عشرت
- ممتاز احمد خاں
- نثار احمد صدیقی
- رخسانہ سلطانہ
- شیریں اختر

شمس الرحمٰن فاروقی (الہ آباد)

سیّد احمد قادری کے بارے میں کہا گیا ہے کہ انہوں نے افسانہ میں وقت بے وقت چلنے والی ناخوشگوار ہواؤں سے خود کو محفوظ رکھا۔ پھر یہ بھی کہا گیا ہے کہ قادری کامیاب صحافی ہیں اس لئے ان کے افسانے کبھی کبھی صحافت کے نزدیک ہو جاتے ہیں۔ یہاں پر مجھے یہ شک گزرتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ کہنے والے نے جس چیز کو جہاں افسانہ میں وقت بے وقت چلنے والی ناخوشگورا ہوا سے تعبیر کیا ہے اگر وہ ہوا قادری کے افسانوں میں بہتی رہتی ہے تو ان کے افسانے صحافت سے قریب ہونے بجائے دور رہتے۔

سچی بات یہ ہے کہ قادری کے افسانوں کے بارے میں سرسری رائے ہمیشہ غلط ثابت ہوں گی اور وہ رائیں بھی غلط ثابت ہوں گی جنہیں افسانے کی تنقید کے ایک مخصوص فار مولے کے تحت گڑھا گیا ہوا۔ سیّد احمد قادری زبان کا شعور رکھتے ہیں اور مکالمے کے آہنگ سے آشنا ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں واقعیت اور شعریت کا فوری احساس ہوتا ہے ان افسانوں میں معاصر دینا کا رنگ جگہ جگہ جھلکتا ہے لیکن معاصر دنیا یہاں اجنبی یا زبرد ستی بلائے ہوئے مہمان کی طرح نہیں بلکہ گھر کے معزز فرد کی طرح نظر آتی ہے، ایسا فرد جو اپنے وجود کا احساس دھوم دھڑاکے سے نہیں بلکہ خاموش طنزیہ مسکراہٹ کے ذریعہ لوگوں پر قائم کرتا ہے، افسانہ ''دلدل'' اس کی بہت اچھی مثال ہے۔ شہرت اور دولت کا جال آج ہمارے معاشرے کو جس طرح جکڑے ہوئے ہے وہ بعض افسانوں مثلاً ''مایا جال'' اور ''تشویش'' میں خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔

(اثبات و نفی، کلکتہ)

عبدالمغنی (پٹنہ)

''دھوپ کی چادر'' سید احمد قادری صاحب کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ہے پہلے افسانے میں امیروں کے مظالم کے خلاف غریبوں کی اس دہشت گردی کا قصہ ہے جس کے مظاہر

افسانہ نگار کے اپنے دیار ضلع گیا کے مضافات میں عام ہو رہے ہیں۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح عوام سرکاری عدالت سے مایوس ہو کر دہشت گردوں کی عدالت سے رجوع کر رہے ہیں اور اس کے فیصلے خوں ریز تشدد کا ایک چکر چلا رہے ہیں۔ آخری افسانے میں بھی وقت کی ایسی ہی ایک تلخ سماجی حقیقت کی کہانی ہے جس کا ماجرا یہ ہے کہ پرانی نسل کے لوگ اپنی نئی نسل کی بدسلوکیوں سے مایوس و مجروح ہو کر المناک داستانوں کو جنم دے رہے ہیں۔ یہ دونوں مسائل حاضرہ ہیں اور ان سے افسانہ نگار کی عصری حسیت کا پتہ چلتا ہے۔

سید احمد قادری صاحب کے افسانوں کی خوبی یہ ہے کہ وہ باماجرا افسانے ہیں جن میں قصے کی دلچسپی پائی جاتی ہے اور تجریدی انشا پردازی کی بکواس نہیں ہوتی۔

(مریخ، پٹنہ)

محمد مثنیٰ رضوی

سیّد احمد قادری کی کہانیوں میں موضوعات کا تنوع ہے لیکن اُن کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اپنے موضوعات کو اس انداز میں چھوا اور برتا ہے کہ وہ فنی وحدت کے سانچے میں ڈھل گئے ہیں۔ تاثر کی وحدت اور لفظوں کا محتاط انتخاب ان کے افسانوی تار و پود کو بکھرنے نہیں دیتا۔ اس مجموعے کا پہلا افسانہ ''اپنی عدالت'' آج کی زندگی کی ایک ایسی حقیقت ہے جس نے پورے معاشرے کو لپیٹ رکھا ہے طبقاتی کشمکش کے نتیجے میں کھیلا جانے والا آگ اور خون کا یہ کھیل جو بھیانک روپ اختیار کر چکا ہے، اس کہانی کا موضوع ہے۔ دو تین کہانیاں اس نوع کی اور ہیں لیکن ''اپنی عدالت'' کی بات ہی کچھ اور ہے۔ اُن کی کہانیوں میں مسلمہ سماجی اور تہذیبی اقدار کی شکست و ریخت کا مسلہ بھی مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ ''خلیج'' ''ریت کی دیوار'' اور ''اولڈ پیپلس ہوم'' ایسی ہی کہانیاں ہیں جن میں مادّی خوشحالی کے حصول کی دوڑ میں کھوکھلی اور دکھاوٹی زندگی کے پیچھے بھاگتے ہوئے لوگ بے بسی اور بے چارگی کی صورتِ حال سے دوچار ہیں۔ حیران، پریشان اور سراسیمہ۔ اس ڈگر سے قدرے ہٹی ہوئی کہانی ''خاموش سایہ'' ایک ایسی نفسیاتی الجھن کا مطالعہ ہے جسے ہم حد سے زیادہ

بڑھی ہوئی انا کا نتیجہ مان سکتے ہیں مگر احمد قادری نے اس کہانی میں بھی سماجی حقائق سے اپنا رشتہ استوار رکھا ہے اور اسے معاشرتی پس منظر میں پیش کیا ہے۔

سیّد احمد قادری افسانوی فن کے لوازمات اور تقاضوں سے اچھی طرح باخبر ہیں۔

(ایوان اردو، دہلی)

معین شاہد

سیّد احمد قادری کے دوسرے افسانوی مجموعہ ''دھوپ کی چادر'' کی کہانیوں میں زندگی کی حرارت اور شریانوں سے بہتے ہوئے خون کے جیسی گرمی بھی ہے۔ اور دھوپ کی وہ روشنی بھی' جو اندھیروں کو چیر کر کرۂ ارض پر سایہ فگن ہوتی ہے۔ اور جو مایسیوں، محرومیوں، رنجوریوں میں زندگی کو ایک نئی تازگی اور غیر بخشتی ہے۔ قادری شہر افسانہ نگاری کا صرف معزز شہری ہی نہیں بلکہ وہ دیہاتیوں کی جھونپڑیوں، کھلیانوں اور غریب و مظلوم انسانوں کے جزبات احساسات کا بے باک ترجمان بھی ہیں۔ جو بڑے زمینداروں اور چودھریوں کے استحصال کے شکار رہے ہیں۔ ان کی نگاہ بہت گہری، مشاہدہ بہت تیز اور فکر، بہت بالیدہ ہے۔ وہ معمولی سے معمولی جزئیات کو اپنے فن کی گرفت میں اس طرح لاتے ہیں کہ قاری کے دل میں اترتے چلے جاتے ہیں، وہ موضوع کی داخلیت اور خارجیت سے پوری طرح کما حقہ آشنا ہیں، وہ فن افسانہ نگاری کے رموز و اسرار سے صرف واقف ہی نہیں بلکہ اسے برتنے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ وہ تجریدیت اور نا آشنا علامتوں اور گنجلک تشبیہوں اور استعاروں کے بھول بھلیوں میں اپنے قاری کو نہیں الجھاتے، بلکہ وہ اپنے سیدھے سادے اسلوب بیان اور اپنے مؤثر پیرایہ اظہار کے ذریعہ ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں کہ بات دل میں اتر جاتی ہے۔

(آدرش، گیا)

علیم اللہ حالی

سیّد احمد قادری گزشتہ دس برسوں میں crude Reality کو palatable بنانے کی مہم میں لگے ہوئے ہیں۔ انھیں اس میں بہت حد تک کامیابی بھی ملی ہے۔ اپنے

افسانوں کے تفہیم اور Treatment کے ذریعہ وہ اس کا ثبوت بھی دیتے رہتے ہیں۔

سید احمد قادری ٹھوس وقوعوں سے حسی لہر پیدا کرنا چاہتے ہیں، ان کی تمام کہانیوں میں یہ خوبی موجود ہے۔ ان کی کہانیاں بالعموم ایک اچانک Drop scene پر ختم ہوتی ہیں اور اپنے پیچھے ایک تادیر رہنے والا Pathos چھوڑ جاتی ہیں۔

(سہیل، گیا)

⊂ پروفیسر محمد محفوظ الحسن

''دھوپ کی چادر'' کے بیشتر افسانے مفلسی، استحصال، فرقہ واریت، دہشت گردی (اسباب ونتائج) ظلم وبربریت کی بیباک کہانی سناتے ہیں، دم توڑتی ہوئی خواہشیں، ظلم وجبر کے خواب میں مظلوموں کی یکجا، ہوس زر اور اخلاقی گراوٹ، رشتوں کا بدلاؤ، انسانیت کا نوحہ انکے افسانوں میں بنیادی عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں، کہانی کا تانا بانا بنتے وقت احمد قادری کا دل دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ انہیں کہانی کہنے کا فن اور ماجرا سازی کا گر معلوم ہے۔''

(آجکل، دہلی)

⊂ رضوان احمد (پٹنہ)

میں سید احمد قادری کے افسانے گزشتہ بیس برسوں سے پڑھ رہا ہوں، بلکہ ان کا سب سے پہلا افسانہ میں نے ہی اپنے رسالہ ''زیور'' میں شائع کیا تھا، اس کے بعد سے ان کا ادبی سفر مسلسل جاری ہے۔

''دھوپ کی چادر'' قادری کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے اس سے قبل ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''ریزہ ریزہ خواب'' کے عنوان سے دس سال قبل شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے میں بیس افسانے ہیں ظاہر کہ کسی بھی افسانہ نگار کے تمام افسانے اچھے یا اعلیٰ پائے کے نہیں ہوتے۔ اسی لئے ان بیس کہانیوں میں نصف ایسی ہیں جن کو اچھا یا معیاری کہا جا سکتا ہے اور نصف بھرتی کی ہیں لیکن ایک تخلیق کار اگر اپنی زندگی میں دو چار بھی بڑی کہانیاں لکھ دے تو اس کے لئے وہی بہت اہم ہے قادری کے یہاں کئی اچھی کہانیاں ملتی ہیں۔ اس مجموعے میں بھی ''اپنی

عدالت"، "ریت کی دیوار"، "ہنسانے والے"، "دلدل" اور "زنجیر" جیسی بھرپور اور مکمل اور اعلیٰ پائے کی کہانیاں موجود ہیں جن کو پڑھنے کے بعد قاری کے ذہن پر زبردست تأثر مرتسم ہوتا ہے اور وہ بہت دنوں تک ان کہانیوں کو بھول نہیں پاتا۔

سید احمد قادری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ بہت معمولی موضوعات پر کہانیاں لکھتے ہیں ایسے موضوعات پر لکھتے ہیں جو ہماری آپ کی نظر سے روزانہ گزرتے ہیں اور ان کی کہانی پڑھنے کے بعد ایسا ہوتا ہے کہ جیسے یہ واقعہ دیکھ کر اپنے ذہن میں بھی ایسا ہی ردعمل ہوا تھا اس سنے یا اس واقعے کے مشاہدے کے وقت ہم نے بھی ایسا ہی سوچا تھا۔ وہ بالکل عام واقعات اور چھوٹی باتوں کو اخذ کر کے ان کو اپنے ذہن کی بھٹی میں تپا کر ایک تخلیقی فن پارہ بنا دیتے ہیں۔

ان کے کرداروں کی سچائی ہی ان کے افسانوں کا کھرا پن ہے ان کی صداقت اور ان کے فن پاروں کی چمک ہے جہاں سچائی ہوگی اس کی خوشبو خود بخود آپ تک پہنچ جائے گی یہی سبب ہے کہ سید احمد قادری کے افسانوں کی صداقت کا عنصر ان کے یہاں سب سے زیادہ نمایاں ہے اور یہ ایسا وصف ہے جس سے ان کی کہانی کی شناخت ہوتی ہے۔ ان کی کہانی بھیڑ میں بھی پہچانی جا سکتی ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے کہ انہوں نے دو دہائیوں کے اندر اپنا ایسا اسلوب اور لب ولہجہ بنا لیا ہے جو ان کی آپ شناخت کرواتا ہے۔ ورنہ سچی بات تو یہ ہے کہ برسہا برس تک لوگ انفرادیت کی تلاش میں سر پٹکتے رہتے ہیں مگر اس کا حصول نہیں ہو پاتا ہے افسانے لکھنا اور بات ہے اور علیحدہ شناخت بنانا بالکل الگ بات ہے۔ وصف بڑی ریاضت کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ قادری کے یہاں احساس کی لیک بڑی تیز ہے وہ اپنے احساسات کی ترسیل میں پورے طور پر کامیاب ہیں۔ کیونکہ انہوں نے کہیں بھی علامت یا تجرید کے گورکھ دھندے میں الجھنے کی کوشش کی ہے اور نہ ہی قاری کا الجھانے کی کوشش کی ہے۔

(ماہنامہ "انشاء" کلکتہ اکتوبر ۹۷ء)

نامی انصاری (کانپور)

سیّد احمد قادری کے بیس افسانوں کا مجموعہ دھوپ کی چادر ان کے فکر وفن کی نمائندگی

کرنے کے ساتھ، ساتھ اس خاص علاقے کے احوال و آثار کی بھی نمائندگی کرتا ہے جس سے مصنف کی ذہنی اور جزباتی وابستگی استوار ہے کیوں کہ یہ اس کی جنم بھومی کا علاقہ ہے۔

اس کتاب کا پہلا افسانہ ''اپنی عدالت'' اگر ایک طرف انصاف اور انتقام کی دلدوز کہانی سُناتا ہے تو دوسری طرف ایک ایسی پراسرار طاقت کی نشان دہی بھی کرتا ہے جس نے دبے کچلے لوگوں کو انصاف دلانے کے لئے اپنی ایک متوازی عدالت اور پولس قائم کر رکھی ہے۔ جہاں سے کوئی ظالم بچ کر نہیں نکل سکتا۔ اسی طرح ''ریت کی دیوار'' بھی ایک ایسی سماجی ناانصافی کا منظر نامہ پیش کرتا ہے جہاں محض نوکری حاصل کرنے کے لئے ایک نوجوان اپنے چہیتے بابا کا گلا دبا دیتا ہے۔ اس افسانے میں جو نفسیاتی گرہ ہے، اس کو افسانہ نگار نے بڑی خوبصورتی سے واضح کیا ہے۔

ان افسانوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ سید احمد قادری اپنے گردو پیش کی زندگی کے اتار چڑھاؤ کو بڑی گہری نظر سے دیکھتے ہیں اور سماج میں دور دور تک پھیلی ہوئی بے بسی ، لاچاری اور ناانصافی کے سیاہ نقوش کو بڑی سہولت سے اپنے قاری کے سامنے اُجاگر کر دیتے ہیں۔ ان کے افسانے سیدھے سادے بیانیہ انداز کے ہیں۔ لیکن ان کا اختتامی فقرہ تصورات کو اُبھا کر پورے افسانے کا جواز پیش کر دیتا ہے۔

(نیا دور، لکھنؤ)

ارتضیٰ کریم (نئی دہلی)

سیّد احمد قادری نے ''جہانِ افسانہ'' میں وقت بے وقت چلنے والی ناخوشگوار بے ہنگم اور تیز وتند ہواؤں سے خود کو ہمیشہ محفوظ رکھا اور کہانی کے بعض بنیادی تقاضوں پر بڑی سختی سے قائم رہے۔ چنانچہ اس زمانے میں بھی جب ان کے معاصر افسانہ نگار قبل از وقت شناخت کے چکر میں علامتوں اور تجریدوں کی بیساکھی تلاش کرنے میں ایسے گم ہوئے کہ اپنے ''امکانات'' بھی کھو بیٹھے مگر یہ خشوع خضوع کے ساتھ پریم چند کی مستحکم افسانوی روایت سے جڑے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اُردو افسانوی ادب میں کئی گراں قدر اضافے کرنے میں کامران رہے۔ ان کے افسانوں کی بنیادی شناخت تجربے، مشاہدے، حادثات اور واقعات کو

غیر معمولی سادگی سے بیان کرتا ہے۔ نیز ان کے افسانوں میں ''کہانی پن'' یا ''افسانویت'' کا احساس لگاتار قائم رہتا ہے۔ ''دھوپ کی چادر'' کے کئی افسانے عصرِ حاضر کے نوحے بھی ہیں اور کامیاب فن پاروں کے نمونے بھی۔

سید ظفر ہاشمی (احمد آباد)

سید احمد قادری کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''ریزہ ریزہ خواب'' ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا تھا۔ دوسرا مجموعہ ''دھوپ کی چادر'' دس سال بعد منظر عام پر آیا ہے۔ سید احمد قادری ایک فعال صحافی اور معتبر قلم کار ہیں انہوں نے اردو افسانے کو تجریدیت کے عذاب سے نکالنے میں عصری افسانہ نگاروں کو بھرپور تعاون دیا ہے۔ بیشتر لوگوں کی طرح انہیں بھی اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ پچھلی دہائیوں میں علامتی استعاراتی اور تجریدی اظہار نے اردو افسانوں کو قاری سے بہت دور کر دیا تھا، اس کا احساس اب ان کو بھی ہو گیا ہے جو اس بے راہ روی اور کجروی کے شکار ہوئے تھے، اور ذہنی پروازوں کے زعم میں آ کر یہ سمجھنے لگے تھے کہ وہ بہت بڑا ادب پیدا کر رہے ہیں۔ انہیں جب پتہ چلا کہ ان کے افسانے ان ہی ٹائپ کے پرور ناقد ہی پڑھتے ہیں اور چیونٹی کے بل میں ہاتھی گھسیڑنے اور گدھا نکالتے ہیں تو انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اور وہ حقیقت بیانی اور کہانی پن کی طرف رجوع ہونے لگے۔ سید احمد قادری کبھی بے راہ روی کا شکار نہیں ہوئے انہوں نے اپنے افسانوں میں کہانی سے تعلق بنائے رکھا، یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔

قادری کے افسانوں کے کردار حالات اور واقعات حقیقی لگتے ہیں۔ قادری محیر العقول باتیں نہیں کرتے جو عام آدمی کہنا چاہتا ہے وہی وہ کہتے

ہیں جو عام آدمی دیکھتا محسوس کرتا اور بھوگتا ہے وہی وہ افسانوں میں بیان کرتے ہیں اسلئے انکے افسانے سچے اور کھرے لگتے ہیں وہ سیدھے سادے الفاظ میں کہانی کہتے ہیں نہ الجھاؤ نہ تکرار نہ معمہ نہ گتھی نہ تہہ داری کی پرت پرت اکھاڑنا پڑے اور آخر میں ہاتھ کچھ نہ لگے۔

(گلبن، احمد آباد ستمبر ۹۶ء)

قمر جہاں (بھاگلپور)

سید احمد قادری افسانوی ادب کا ایک مشہور و معروف نام ہے ''دھوپ کی چادر'' ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ''ریزہ ریزہ خواب'' کے افسانے خاصے مشہور ہو چکے ہیں اور ان افسانوں کے حوالے سے کلام حیدری (مرحوم) نے سید احمد قادری کو شہر افسانہ نگاری کا ایک معزز شہری کا اعزاز بخشا ہے۔ شہر افسانہ نگاری کے اس معزز شہری نے ''دھوپ کی چادر'' میں کل ۲۰ / افسانہ پیش کیئے ہیں ''ریزہ ریزہ خواب'' پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر اصغر علی انجینئر کے الفاظ تھے۔

''ان میں بعض کہانیاں کمزور ہیں بعض بہت اچھی بھی ....'''' دھوپ کی چادر'' میں اچھی کہانیوں کا پلہ بھاری ہے ان میں ''ریت کی دیوار'''' اپنی عدالت'' سائے کا تعاقب'' ''اولڈ پیپلس ہوم'''' عزت دار'' ایک سچویشن'' ''مایا جال'' وغیرہ کا شمار یقیناً سید احمد قادری کی اچھی اور کامیاب کہانیوں میں ہوگا۔ انہوں نے اپنے افسانوں کے لئے جو موضوعات منتخب کیے ہیں وہ وہی ہیں جو ہمارے ارد گرد پھیلے ہوئے ہیں سماج کے وہ مسائل بھی ہیں جنہو ں نے انسانی زندگی کو انتہائی قبیح بنا دیا ہے۔ یہ بات تو طے شدہ ہے کہ قادری نے افسانہ کو محض تفریح کا ذریعہ نہیں سمجھا ہے۔ ان کے نزدیک ادب کا ایک واضح مقصد ہے شاید اسی لئے ان کے افسانوں میں مقصدیت کی جھلک بے حد نمایاں ہے۔ بسا اوقات فن کی نزاکت کے لئے یہ چیز گراں بار بھی بنی ہے لیکن عام طور پر فن اور مقصد کی خوشگوار ہم آہنگی ملتی ہے۔ ماجرا نگاری، کردار کی تشکیل اور اظہار و بیان کی صفائی و بے باکی میں سید احمد قادری نئی نسل کے افسانہ نگاروں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

(کتاب نما، دہلی۔ جنوری ۹۷ء)

اسلام عشرت (پٹنہ)

''دھوپ کی چادر'' میں جتنے افسانے شامل ہیں بلا شبہ ان افسانوں کا بہ غور مطالعہ کرنے کے بعد چند در چند جہات ہمارے سامنے آتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ سبھی افسانے مختلف النوع مو

ضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ اس مجموعے کے تمام افسانے مختصر سیدھے سادے، دل چسپ مؤثر، حسین و دل کش، فن کار کے نجی تجربات، محسوسات اور مشاہدات کے آیئنہ دار ہیں اس مجموعے کا کوئی بھی افسانہ علامات یا استعارات یا تجریدیت کے بوجھ تلے دبا ہوا نہیں ہے۔ البتہ ان کے چند افسانوں میں شاید لاشعوری طور پر ان کا صحافتی انداز (سید احمد قادری ایک بے باک دو یانت دار صحافی بھی ہیں) در آیا ہے جو افسانوں کے لئے ناموزوں و نامناسب ہے۔ یقین ہے آیندہ قادری اس امر کو ملحوظ رکھیں گے۔ ہمیں ان سے بے حد توقعات ہیں۔ ان کے اس مجموعے میں بیانیہ اسلوب جو میرے خیال میں انہیں ان کے معاصرین میں ممیز و ممتاز بناتا ہے، وہ شروع سے اخیر تک موجود ہے۔ چنانچہ بہ حیثیت مجموعی میں یہ کہنے میں یقینی حق بہ جانب ہوں کہ زیر تذکرہ مجموعہ مواد و موضوع، فکر و سنجیدگی، وسعت و تنوع، افسانے کی تکنیک و فن، غیر تصنع پسندی، سادگی و پرکاری، فن کارانہ چابکدستی، مخصوص و منفرد اسلوب اور معنی خیزی کے اعتبار سے محض قابل اعتناء ہی نہیں۔ بلکہ قابل قدر و لائق مطالعہ بھی ہے۔

ممتاز احمد خان (مظفر پور، بہار)

سیّد احمد قادری کے افسانے پڑھ کر صاف طور پر یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ انسانوں کے دکھ درد مصائب والائم کو اپنا موضوع بناتے ہیں غریبوں محنت کشوں اور دکھ درد کے مارے ہوئے لوگوں کی زندگی ان کو متاثر کرتی ہے۔ اور ان کے قلم کو حرکت دیتی ہے۔ قادری کے افسانوں کی دوسری نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان میں بھرپور قصہ پن پایا جاتا ہے۔ قادری روز مرہ کے واقعات و سانحات اور گرد و پیش کے احوال و مسائل کو افسانے کے قالب میں ڈھال دینے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کے افسانے علامتوں اور مبہم تجریدیت کا شکار نہیں ہوتے ان کے افسانوں میں سیدھے سادے اور سامنے کے مسائل اور روز مرہ کے تجربات و واقعات بڑی سادگی اور خلوص کیساتھ بیان ہوتے ہیں۔

قادری گرد و پیش کے بدلتے ہوئے حالات پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ ہمارے یہاں سماجی اور سیاسی سطح پر جو تغیرات رونما ہو رہے ہیں۔ وہ ان کا بھی ادراک رکھتے ہیں۔ دبے کچلے

لوگوں کے اندر بیداری کی جولہر اٹھ رہی ہے اس کی بھی عکاسی ان کے بعض افسانوں میں ملتی ہے اس سلسلے میں افسانے ''اپنی عدالت'' اور ''انقلاب'' پیش کئے جا سکتے ہیں۔ بعض افسانوں میں طنز وتنقید کا لہجہ بھر ہوا ہے۔ معاشی نا برابری سماجی نا انصافی اور عوام کے اندر اٹھنے والی بغاوت اور بیداری کی لہر کئی افسانوں کا موضوع بنے ہیں۔ افسانہ ''دوپہر'' اور ''ہنسانے والے'' غربت اور پسماندگی کے مارے انسانوں کے احساسات ومسائل کی نہایت عمدہ ترجمانی ہے۔

سید احمد قادری جھوٹی مذہبیت کو بھی اپنے طنزیہ تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ افسانہ ''تشویش'' کے قاسم بھائی مذہبی بھی بہت ہیں لیکن رشوت لینے میں بھی ماہر ہیں۔ افسانہ ''آگ سے روشنی'' فرقہ وارانہ ذہنیت اور اس کے بھیانک اور عبرت ناک نتائج کی بڑی موثر ترجمانی وعکاسی ہے۔

زیرنظر مجموعہ کے پانچ افسانے تو نا قابل فراموش ہیں انہیں اس مجموعہ کے بہترین افسانوں میں شمار کرنا چاہیے (۱) اپنی عدالت (۲) عزت دار (۳) تشویش (۴) دوپہر (۵) اولڈ ایج ہوم۔ انکے علاوہ 'خلیج'، 'ہنسانے والے' اور 'آگ سے روشنی' بھی کامیاب افسانے ہیں۔

سیّد احمد قادری ایک بے باک ادیب اور صاف گو فنکار ہیں وہ ادب کا کوئی افلاطونی نظریہ نہیں رکھتے بلکہ ادب کو زندگی کا ترجمان سمجھتے ہیں۔ قادری نے جیسا کہ خود اپنے دیباچے میں لکھا ہے کہ انہوں نے اس زمانے میں افسانہ نگاری شروع کی جب اردو افسانے پر علامت اور تجریدیت کا غلبہ تھا چیستانی اور نا قابل فہم افسانے لکھنا فیشن میں داخل تھا۔ قادری نے افسانہ نگاری کے اس مقبول وعروج رجحان سے الگ ہٹ کر پورے اعتماد سے پریم چند کرشن چندر وغیرہ کی مستحکم افسانوی روایت کو آگے بڑھایا۔

قادری کا اسلوب سادہ شگفتہ بے ساختہ اور برجستہ ہے اس میں کہیں تکلف وتصنع کا شائبہ نہیں پایا جاتا۔ وہ فطری انداز میں بے تحاشا اور بے تکان لکھتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی نثر مربوط اور آئینے کی طرح شفاف ہے بے خواہ مخواہ جملے تراشنے اور عبارت کو سجانے کی کوشش کہیں نظر نہیں آتی ہے۔

(جدید اسلوب، سہسرام)

نثار احمد صدیقی (ممبئی)

''دھوپ کی چادر'' میں سبھی افسانوں میں ایک سوال ابھر کر سامنے آتا ہے۔ وہ یہ ہے...... میں کون ہوں؟ نئی روشنی کہاں ہے؟ اور پھر آج کا انسان خود سے بے خبر کیوں ہے؟ افسانہ ''انقلاب'' میں وہ روشنی تلاش کی جا سکتی ہے، جس میں دیہی علاقوں میں آئے انقلابات کی عمدہ تصویر کشی ہے۔ ''ریت کی دیوار'' میں آج کی تلخ سچائی چھپی ہوئی ہے۔

افسانہ ''تشوش'' آج کے افسروں میں رشوت کی بڑھتی ہوئی وبا پر ایک بھرپور طنز ہے۔ ''دلدل'' میں افسانہ کا آخری جملہ چونکا دیتا ہے جو عہد حاضر کے سماج کی کریہہ تصویر کو پیش کرتا ہے...... ''لو ماں، ہم تمہارے لئے گاہک لے آئے'' افسانہ نگار نے بڑی فنکاری سے صرف ایک جملہ میں کہانی کو آفاقیت بخش دی ہے۔ افسانہ کوئی صدا نہیں فساد کے موضوع پر بہترین کہانی ہے جو کامیاب ہے۔ ''خاموش سایہ'' میں ایک اردو افسانہ نگار و صحافی کی انا کی داستان ہے جسے پڑھ کر کلام حیدری کے علاوہ مجاز کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اس کہانی کے اسلوب کا جواب نہیں۔ اس کے علاوہ ''مایا جال'' ''ہم قدم'' سائے کا تعاقب'' ''عزت دار'' ''ہنسانے والے'' اور ''اولڈ پیلیس ہوم'' بھی مختلف موضوعات پر دل چسپ اور معیاری افسانے ہیں۔ جن سے اس مجموعے میں رنگارنگی اور تنوع پیدا ہوا ہے۔

''دھوپ کی چادر'' پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سید احمد قادری کے پاس سماجی شعور فنی وفکری بصیرت اور منفرد اسلوب کے ساتھ ساتھ موضوعات کا تنوع بھی ہے، جو ان کی نمایاں پہچان ہے۔ بہت کم عرصے میں سید احمد قادری، آٹھویں دہائی کے افسانہ نگاروں میں اپنی شناخت بنانے میں کامیاب ہیں۔　　　　(انقلاب، بمبئی)

رخسانه سلطانه (گلبرگه کرناٹك)

سیّد احمد قادری کے افسانوں میں موضوعات کا تنوع ہے اور خوبی یہ ہے کہ انہوں نے ان موضوعات کو جس سلیقے سے برتا ہے وہ فنی وحدت کے سانچے میں ڈھل گئے ہیں۔ اس مجموعہ کا پہلا افسانہ ''اپنی عدالت'' آج کی زندگی کی ایسی حقیقت ہے جو پورے معاشرے پر اثر

انداز ہو رہی ہے طبقاتی کشمکش کے نتیجے میں جو تلخ حقائق ہمارے سامنے آتے ہیں اس کا بھیانک روپ اس کہانی کا موضوع ہے۔ دو تین افسانے اسی نوعیت کے ہیں۔ لیکن ان تمام افسانوں میں ''اپنی عدالت'' اپنی ایک انفرادیت رکھتا ہے۔ سید احمد قادری کے افسانوں میں سماجی تہذیبی اقدار کی شکست و ریخت کا مسئلہ بھی مرکزی

حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ ''خلیج'' ''ریت کی دیوار'' ''عزت دار'' اور ''اولڈ پیپلس ہوم'' ایسی ہی کہانیاں ہیں۔ جس میں مادّی خوشحالی کے حصول کی دوڑ میں کھوکھلی اور بناوٹی زندگی کے پیچھے بھاگتے ہوئے لوگ بے بسی اور بے چارگی کی صورت حال سے دوچار ہیں۔ ان موضوعات سے علیحدہ ایک افسانہ ''خاموش سایہ'' ایک ایسی نفسیاتی الجھن کا اظہار ہے جسے ہم حد سے زیادہ بڑھی ہوئی اَنا کا نتیجہ مان سکتے ہیں۔ سید احمد قادری نے اس افسانہ میں بھی سماجی حقائق سے اپنا رشتہ برقرار رکھا ہے اور اسے معاشرتی پس منظر میں پیش کیا ہے۔

سیّد احمد قادری کے دوسرے افسانے مثلاً تشویش'' ''ریت کی دیوار'' ''عزت دار'' ''خلیج'' مایا جال'' خاموش سایہ'' ''آئینے کی گرد'' ''دلدل'' وغیرہ میں جیتے جاگتے اور ہمارے اردگرد کے کردار ہی نظر آتے ہیں۔ ان کے حرکات و سکنات ان کی زبان اور ان پر گزرے ہوئے ہوئی واردات دکھائی دیتے ہیں۔ یعنی سید احمد قادری کے افسانوں کے مطالعے کے بعد یہ افشاں ہوتا ہے کہ ان کے کردار حقیقی اور سچے ہیں۔

شیریں اختر (کولکتہ)

سیّد احمد قادری نے ''دھوپ کی چادر'' کے متعدد افسانوں میں عصری زندگی کے کسی نہ کسی اہم پہلو اور عوام کے دکھ درد کی حساس اور فنکارانہ تصویر کشی کی ہے۔ مثلاً مجموعہ کا پہلا افسانہ ''اپنی عدالت'' جس میں جاگیردارانہ سماج میں پنپنے والے جرائم کو منظر عام پر لانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے اور سرمایہ دار اور مزدور کے درمیان طبقاتی کشمکش کے ذریعہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ محنت و مشقت کرنے والا پس ماندہ طبقہ بھی اپنی عزت نفس کو پہچان سکے اور استحصال کرنے والے سرمایہ دار بے نقاب ہو کر سامنے آجائیں۔

مجموعہ کا دوسرا افسانہ ''ریت کی دیوار'' ہے اس افسانے میں آلام روزگار اور مسائل سے گھری ہوئی زندگی ہمارے سامنے پوری تلخیوں کے ساتھ بکھری ہوئی نظر آتی ہے موضوع کے اعتبار سے بھی یہ ایک منفرد کہانی ہے جو قاری کے ذہن کو ہر لحہ اپنی گرفت میں لیے ہوئے آگے بڑھتی ہے۔

سید احمد قادری ایک جہاندیدہ فنکار ہیں، وہ نفسیات نگاری سے کام لیتے ہوئے اپنے مشاہدے کی بنیاد پر کرداروں کی تخلیق کرتے ہیں، ان کی تجربہ کار نگاہیں معاشرے کے ہر طبقے، مرد، عورت، بوڑھے، بچے تک پہنچتی ہیں۔

افسانہ ''زنجیر'' عورت کے ان پہلوؤں کے گرد گھومتا ہے، جہاں اس کا وجود آزاد نہیں ہے، اور افسانہ ''دلدل'' ایک طوائف کی زندگی کے المناک تجربوں کی دل شکن داستان ہے۔

''دھوپ کی چادر'' کے افسانوں کو پڑھتے ہوئے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ قادری نے مکالموں کو فطری رنگ میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے دیہاتی، شہری، پڑھے لکھے اور ان پڑھ کے مکالموں میں بھی امتیاز برتا ہے، جس سے پتہ چل جاتا ہے کہ کردار کا تعلق کس طبقے سے ہے۔

بحیثیت مجموعی ''ریزہ ریزہ خواب'' اور ''دھوپ کی چادر'' کے افسانوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ سید احمد قادری اردو افسانہ نگاری میں ممتاز مقام رکھتے ہیں، انہوں نے اپنے افسانوں میں فن افسانہ نگاری کا پوری حد تک لحاظ رکھا ہے۔ ان افسانوں میں انہوں نے جن مسائل کو پیش کیا ہے وہ ہمارے معاشرے کے اہم مسائل ہیں، جنہیں سید احمد قادری نے نفسیاتی نقطہ نظر کی بنیاد پر پیش کرنے کی بے حد کامیاب سعی کی ہے۔

بازگشت

پانی پر نشان

- پروفیسر محمد مثنیٰ رضوی
- پروفیسر علیم اللہ حالی
- پروفیسر عبدالمنان
- پروفیسر محمد محفوظ الحسن
- ایم. صلاح الدین
- نسیم علوی

پروفیسر محمد مثنیٰ رضوی

"پانی پر نشان" اردو کے معروف صحافی اور افسانہ نگار سید احمد قادری کی کہانیوں کا تیسرا مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ کی کہانیاں اپنے تخلیق کار کی الگ شناخت کو واضح طور پر پتہ دیتی ہیں۔ سید احمد قادری کی کہانیاں زمینی حقائق کی تخلیقی تنقید کہی جاسکتی ہیں۔ انھوں نے زمین سے جڑی ہوئی سچائیوں کو بہت قریب سے دیکھا، سمجھا اور پرکھا ہے، اس لئے ان کی کہانیوں میں گہرے سماجی شعور کی جھلک صاف اور شفاف ڈھنگ سے دکھائی دیتی ہے۔ ان کی کئی کہانیوں کا موضوع سماجی استحصال ہے۔ مگر ان کی تخلیقات میں اس کے مختلف روپ نظر آتے ہیں۔

(نیادور، مئی ۲۰۰۸ء)

پروفیسر علیم اللہ حالی

سید احمد قادری نے نہ صرف یہ کہ تخلیقی سطح پر اپنے آپ کو Maintained رکھا ہے، بلکہ ان کا فن یقینی طور پر روبہ ارتقا ہے۔ 'پانی پر نشان' کی بیشتر کہانیاں افسانے کے قارئین کو مطمئن کرتی ہیں۔ انھوں نے مختصر افسانے کی صنفی خصوصیات کا احترام کرتے ہوئے اپنی کہانیوں کو وقوعوں کی سطح پر pin pointed بنایا ہے۔

(انتخاب۔۱۴)

پروفیسر عبدالمنان

سید احمد قادری کے بیشتر افسانوں کو پڑھ جایئے اندازہ ہوگا کہ وہ ان برائیوں کا پردہ فاش کررہے ہیں جو عفریتی طور پر معاشرے میں بکھرے ہوئے ہیں۔ ذہنی طائر کی پروازی کو

کنج عافیت میں مقید نہیں کیا جا سکتا' بلکہ پرنور فضائے بسیط میں غوطہ زن ہونے کا موقع فراہم کیا جا سکتا ہے اور اس فراہم کردہ سمت نے جو جہت دیا ہے وہ افسانہ نگار کی جوہر شناسی اور تواتر کے ساتھ تخلیقی اپج کی دلیل ہے۔ جس طرح زمانہ کی کروٹوں کا کوئی خاتمہ نہیں ہوتا اسی طرح افسانہ نگار کی فکری پرواز مقید نہیں ہوتی 'جس کو "پانی پر نشان" میں دیکھا جا سکتا ہے۔ افسانہ نگار کا فکری دائرہ لہروں کے تابع ہے جو کسی ایک سمت کا محتاج نہیں بلکہ اس کے جلو میں معاشی بحران کی تمام تر سمتیں نظر آتی ہیں۔

(روح ادب)

پروفیسر محمد محفوظ الحسن

'پانی پر نشان' معروف افسانہ نگار سید احمد قادری کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے، جن میں کل ۱۸ افسانے شامل ہیں۔ ان افسانوں کے موضوعات اگر ایک طرف روزمرہ زندگی اور ہمارے اردگرد بکھرے اور پھیلے اور رونما ہونے والے واقعات و حادثات ہیں، تو دوسری جانب یہ ملکی اور بین الاقوامی سیاست اور اس سے پیدا شدہ صورت حال کے تانے بانے سے بنے گئے ہیں۔

(ماہنامہ 'آجکل' جون، ۲۰۰۸ء)

ڈاکٹر ایم صلاح الدین

سید احمد قادری کے افسانوی مجموعہ 'پانی پر نشان' کے افسانے تہہ در تہہ زندگی کے عرفان، محسوسات میں شدت، فکر میں صلابت، زبان پر قدرت، جذبے میں اخلاص اور فنکارانہ درک کا ثمرہ ہے۔ افسانوی مجموعہ 'ریزہ ریزہ خواب' (۱۹۸۵ء) اور 'دھوپ کی چادر' (۱۹۹۵ء) نے انھیں جدید افسانہ نگاروں کی صف اوّل میں لا کھڑا کیا ہے۔ یہ 'پانی پر نشان'

ان کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے اور اس کی اٹھارہ کہانیوں میں بیشتر عمدہ فنکارانہ اظہار کے نمونے ہیں۔

(تمثیل نو (دربھنگہ) اکتوبر ۰۷۔ جون ۲۰۰۸ء)

نسیم علوی

'پانی پر نشان' کے افسانوں میں سید احمد قادری کی فنکاری عروج پر نظر آتی ہے۔ ان افسانوں میں جس طرح سیاسی، سماجی معاشی اور معاشرتی مسائل کو پیش کیا گیا ہے، ان کے مطالعہ سے قادری کا حیات و کائنات کا درد و غم اور جستجو سے گہری وابستگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

(کتاب نما، مئی ۲۰۰۸ء)

❁

سیّد احمد قادری : ایک تعارف

نام	:	سیّد احمد قادری
نام والد	:	بدر اورنگ آبادی
تاریخ و مقام پیدائش	:	11 ستمبر 1954 اورنگ آباد (بہار)
تعلیم	:	ایم. ایس سی. (بوٹنی)، پی. ایچ ڈی.
مشغلہ	:	درس و تدریس اور صحافت

ادبی تصانیف

ریزہ ریزہ خواب	:	(افسانوی مجموعہ)	1985
فن اور فنکار	:	(تنقیدی مضامین)	1986
دھوپ کی چادر	:	(افسانوی مجموعہ)	1995
افکار نو	:	(تنقیدی مضامین)	1996
اردو صحافت بہار میں	:	(تحقیق و تنقید)	2003
پانی پر نشان		(افسانوی مجموعہ)	2006
ملبہ	:	(افسانوی مجموعہ)	2015
شاعر اور شاعری	:	(تنقید)	2007
افسانہ نگار اور افسانے	:	(تنقید)	2008
جائزے	:	(ادبی تبصرے)	2010
مکالمہ	:	(انٹرویوز)	2013
اقدار و امکان	:	(تنقید)	2014
اردو صحافی بہار کے	:	(تحقیق)	2014
سفر امریکہ کا	:	(سفرنامہ)	(زیر طبع)

☆ تالیفات

1	ان سے ملئے	:	مضامین مظفر گیلانی (خاکے)	1988
2	غیاث احمد گدی	:	شخصیت اور فن	1999
3	انجم مانپوری	:	فنکار سے فن تک	2002
4	عبدالمغنی	:	حیات اور خدمات	2005
5	معمار بہار	:	(شخصیات)	2008
6	ہم کلام	:	(خطوط)	2009
7	شین مظفر پوری	:	شخص اور عکس	2010

صحافتی خدمات

(1) مورچہ، آہنگ، سہیل، عظیم آباد کسپریس، بلٹز، جن ستا، دینک جاگرن وغیرہ میں بحیثیت نمائندہ، مدیر معاون وابستہ رہے۔

(2) اگست 1984 سے اردو ہفتہ وار "بودھ دھرتی" کے مدیر

(3) جنوری 1991 سے اردو سہ ماہی "ادبی نقوش" کے مدیر

اعزازات و انعامات

(1) 1992ء میں مرکزی حکومت کے محکمہ تعلیم و ثقافت کی طرف سے فیلوشپ ایوارڈ ملا۔

(2) 1995ء میں کے کے برلا فاؤنڈیشن، نئی دہلی نے فیلوشپ ایوارڈ دیا۔

(3) 1996ء میں انگریزی روزنامہ "ٹائمس آف انڈیا" نے بہاری آف دی ایئر کا اعزاز بخشا۔

(4) 1998ء میں فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنو کے مالی تعاون سے شیریں اختر کی کتاب "سید احمد قادری: شخصیت اور فن" شائع ہوئی۔

(5) بہار، اتر پردیش اور مغربی بنگال اردو اکاڈمی کے علاوہ دیگر کئی اداروں نے مختلف کتابوں پر اوّل انعامات دیئے۔

(6) کئی قومی اور بین الاقوامی سیمناروں میں شریک ہوئے۔

(7) آل انڈیا ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے مختلف چینلوں کے ادبی پروگرام میں شمولیت۔

(8) مگدھ یونیورسٹی کے سینیٹ کے ممبر نامزد ہوئے۔

(9) انجمن ترقی اردو، بہار کے ریاستی سکریٹری کئی سال تک رہے۔ گیا ضلع انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے گیا ضلع شہر اور مضافات میں اردو کی ترویج و اشاعت کے بہت سارے تاریخ ساز کام کئے۔ ریاستی سطح کے کئی اہم سیمینار منعقد کرایا، کئی اہم تجاویز منظور کرائیں اور ایسے بیسیوں لوگوں کو اردو کا ایوارڈ دیا، جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔ ایسے ایوارڈ سے پورے ضلع میں اردو زبان پڑھنے لکھنے کا ایک خاص ماحول بنا۔

(10) بہار کی تقریباً تمام یونیورسیٹیوں کے ام اے (اردو) کے نصاب میں تحقیقی و تنقیدی کتاب "اردو صحافت بہار میں" شامل ہے۔

(11) 29/جون 2014ء کو وائس آف امریکہ، واشنگٹن نے آدھے گھنٹے کا خصوصی انٹرویو "صدا رنگ" کے تحت نشر کیا۔

❁

Scanned by CamScanner